# بلوچستان کی صورتحال
# مسائل کی نوعیت، اسباب اور حل

پروفیسر خورشید احمد

آئی پی ایس پریس، اسلام آباد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز تحقیق کے لیے آزادانہ اظہار خیال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے
ادارہ کی مطبوعات میں پیش کیے گئے تمام خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

© IPS Press 2022

# بلوچستان کی صورتحال: مسائل کی نوعیت، اسباب اور حل

پروفیسر خورشید احمد

انتخاب، ترتیب و تدوین: خالد رحمٰن

معاونت: محمود فاروقی

ISBN: 969-448-820-2

جملہ حقوق محفوظ ہیں: آئی پی ایس پریس، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کے کسی حصے کی نقل یا ترجمہ کی اشاعت، کسی بھی شکل میں اسٹور تیج جہاں سے اسے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہو یا کسی بھی شکل میں ترسیل نہیں کی جاسکتی۔

۹۵۴٫۹۱۵ بلوچستان کی صورتحال: مسائل کی نوعیت، اسباب اور حل
خ ور خورشید احمد، پروفیسر
اسلام آباد: آئی پی ایس پریس، ۲۰۲۲ء
صفحات مع اشاریہ
۱۔ پاکستان-بلوچستان-سیاست و حکومت ۲۔ پاکستان-بلوچستان-بیرونی سازشیں اور دہشت گردی
۳۔ پاکستان-بلوچستان-سماجی و معاشی مسائل

آئی پی ایس پریس

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، نصر چیمبرز، پلاٹ-1، ایم پی سی ایچ ایس، کمرشل سینٹر، E-11/3، اسلام آباد
فون: ۸۴۳۸۳۹۱-۰۵۱ فیکس: ۸۴۳۸۳۹۰-۰۵۱

ای میل: publications@ips.net.pk

ویب سائٹ: www.ipsurdu.com, www.ips.org.pk

فیس بک: www.facebook.com/IPSPressInternational

سرورق: آصف تیموری

الفاظ و صفحہ سازی: محمد عالم

طباعت: اے-ایس پرنٹرز، راولپنڈی

# فہرست


— پیش لفظ ..... V

— تعارف ..... VII


حصہ اول

## بلوچستان کی صورتحال: مسائل کی نوعیت، اسباب اور حل

مضامین اور سینیٹ تقاریر


- سلگتے مسائل اور قیادت کی ذمہ داری ..... ۰۳
- بیرونی عزائم اور مقابلہ کے لیے حکمت عملی ..... ۱۵
- بحران کی نوعیت: اصلاح احوال کیسے ہوگی؟ ..... ۲۹
- واقعات کا تشویشناک تسلسل: حکمت عملی میں بہتری کی ضرورت ..... ۵۷
- بلوچستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل پر پارلیمنٹ کی کمیٹی کی رپورٹ (تلخیص) ۷۵
- دہشت گردی کے مسلسل واقعات: پریشان کن سوالات ..... ۹۵


حصہ دوم

## سیمینار


- بلوچستان: صورت حال اور اقدامات بلوچ قیادت کی نظر میں ..... ۱۰۵
- اشاریہ ..... ۲۰۷

# پیش لفظ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کو بیش بہا انعامات سے نوازا ہے۔ ایک جانب دیگر ہزاروں مخلوقات کی طرح اس کی جسمانی اور طبعی ضروریات کو پورا کرنے کا انتظام فرمایا، تو دوسری جانب اس کا رتبہ ان تمام مخلوقات سے بلند کر کے اس کی اخلاقی، تہذیبی، تمدنی اور روحانی نشوونما کو بھی اپنے ذمہ لے لیا۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے سوا لاکھ کے قریب انبیاء علیہم السلام دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف اوقات میں مبعوث فرمائے، یہ سلسلہ حضرتِ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضرت محمد ﷺ پر تکمیل پذیر ہوا۔ ان انبیاء کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی علمی، اخلاقی اور فلسفیانہ ہدایت کے لیے وحی کا ایک سلسلہ شروع کیا جو قرآنِ کریم پر منتج ہوا۔ آخری پیغمبر ﷺ کی آمد کے ساتھ جہاں کارِ نبوت تکمیل کو پہنچا، وہیں قرآنِ کریم کی تکمیل کے ذریعے الہامی ہدایت کا سلسلہ مکمل ہوا۔ یوں قرآن و سنت کی صورت میں ایک ایسا نقشۂ زندگی انسانیت کو میسر آ گیا جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر دائرے میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔

انسانیت کے ارتقا اور علم و عمل کے نئے ذرائع کی دریافت نے انسان کو کسی حد تک آزادیِ فکر سے نوازا تو وہ اس خام خیالی کا شکار ہو گیا کہ وہ اب الہامی ہدایت سے بے نیاز ہو گیا ہے۔ اس کا نتیجہ ظلم، عدم مساوات اور طاغوتی طاقتوں کے غلبے کی صورت میں نکلا۔ اسی خام خیالی نے دنیا کو اس استعماری نظام کے شکنجے میں لا ڈالا جس کی ہر صورت افراد اور اقوام کے استحصال پر منتج ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے فی زمانہ انسانی زندگی کے تمام دائرے اور تمام شعبے اس سے براہِ راست متاثر ہیں۔ اس پر مستزاد وہ ذہنی پسماندگی اور مغلوبیت کی کیفیت ہے جس کی وجہ سے کسی متبادل کی تلاش میں انسانوں کی اکثریت سرگرداں ہونے کے باوجود محروم ہے۔

میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ تعلیم و تحقیق، تصنیف و تالیف، اور سیاسی تحرّک میں گزارا ہے۔ اس پورے عرصے میں میری کوشش یہی رہی کہ حتمی الہامی ہدایت یعنی قرآن و سنت کی

جامع تعلیمات کی روشنی میں قومی اور بین الاقوامی مسائل کا حل تلاش کیا جائے۔ چنانچہ علمی و عملی جدوجہد کے دوران یہ مقصد میرا مرکزِ نگاہ تھا کہ اپنی صلاحیت اور دائرہ اختیار کے مطابق وطنِ عزیز پاکستان کو بالخصوص اور عالمِ انسانیت کو بالعموم استعماری گرفت سے آزاد کروا کر فلاح و ہدایت کے اس راستے پر گامزن کرنے کی جدوجہد میں اپنا حصہ شامل کیا جا سکے جو الہامی ہدایت کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

اس ضمن میں نظریاتی و عملی پہلوؤں پر میں نے اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق سے سینکڑوں مضامین تحریر کیے ہیں اور بے شمار مواقع پر گفتگو کی صورت میں اپنے خیالات کا ابلاغ کیا ہے۔ اس میں سے بہت کچھ گزشتہ دہائیوں میں مربوط صورت میں شائع بھی ہوا ہے لیکن ایک بہت بڑا لوازمہ ابھی ایسا موجود ہے جسے ترتیب دینے کی ضرورت باقی ہے۔ یہ فرض انجام دینے کی خواہش میں کئی برس سے اپنے اندر پاتا ہوں لیکن صحت کی صورت حال کے باعث یہ ممکن نہ ہو سکا کہ اپنے ماضی کے کام کا جائزہ لے کر اسے اشاعت کے لیے مرتب کر سکتا۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ساتھیوں نے برادرم خالد رحمٰن کی سربراہی میں اس ادھورے کام کی تکمیل کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے۔ پہلے مرحلے میں پاکستان کی نظریاتی اساس، ملک میں آئینی جدوجہد، طرز حکمرانی کے سوال، دہشت گردی کے خلاف جنگ میں پاک امریکہ تعاون، اسلام اور مغرب کے باہمی تعلق اور جاری کشمکش، اور معاشی صورت حال اور امکانات جیسے موضوعات پر سات کتب مرتب ہو چکی ہیں۔ کچھ دنوں میں تین اور کتب بھی مکمل ہونے کو ہیں، ان شاءاللہ۔ ان کتب کا حصہ بننے والے بیشتر مضامین میری سینیٹ کی تقاریر پر مبنی ہیں جبکہ دیگر مضامین مختلف مواقع پر لکھے گئے جن کو اب یکجا کر دیا گیا ہے۔

میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھیوں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے انتہائی محنت، عرق ریزی اور قابلیت کے ساتھ یہ لوازمہ ترتیب دیا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہماری سعی کو قبول فرمائے اور ہماری کاوشوں کو اپنے لیے خالص کر لے۔

پروفیسر خورشید احمد

لیسٹر، برطانیہ

# تعارف

پاکستان کے بارے میں بجاطور پر کہا جاسکتا ہے کہ یہ مواقع کی سرزمین ہے۔ دوسری جانب اتنی ہی بڑی حقیقت یہ ہے کہ ملک میں حکمرانی کے منصب پر فائز طبقات نے ان مواقع کو ضائع کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ مواقع کی موجودگی اور انہیں ضائع کرنے کے حوالہ سے بلوچستان ایک نمایاں کیس کے طور پر سامنے آتا ہے۔ بلوچستان کی بہ رضاورغبت بطور صوبہ پاکستان میں شمولیت کے وقت [۱۹۴۸] سے اب تک یہاں پانچ بار فوجی آپریشنز ہو چکے ہیں۔ یوں کچھ اتار چڑھاؤ سے قطع نظر بلوچستان کی صورت حال قومی اور صوبائی سطح پر گورننس کی خرابیوں کی ایک بڑی علامت بن گئی ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ بلوچستان کے حوالہ سے خرابیوں کو دور کرنے کی کوئی کوششیں نہ ہوئی ہوں۔ مختلف ادوار میں اور مختلف سطحوں پر غور وفکر اور بلوچستان کی سیاسی وسماجی قیادت کے ساتھ رابطوں کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ اس کے نتیجہ میں بہت سی اہم تجاویز بھی سامنے آتی رہی ہیں تاہم ان تجاویز پر یا تو سرے سے عمل ہی نہیں ہوا اور یا عملدرآمد میں اس قدر کمزوریاں رہی ہیں کہ اقدامات نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکے۔ یعنی صورتحال کچھ ایسی ہی ہے کہ: 'مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'

یہ کہنا بھی غلط نہیں ہو گا کہ صورت حال کی خرابی میں مقامی اور قومی سطح سے لے کر بہت سے بین الاقوامی عوامل کارفرما ہیں۔ یوں اصلاح احوال کی کسی بھی طرح کوششیں اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہیں جب حالات کے تجزیہ سے لے کر اقدامات تک فیصلوں میں جامعیت ہو اور مقامی و ملکی سطح پر تمام متعلقہ افراد اور ادارے اس کا حصہ ہوں۔

'ارمغان خورشید' سلسلہ کی زیر نظر کتاب ''بلوچستان کی صورت حال: مسائل کی نوعیت، اسباب اور حل'' پروفیسر خورشید احمد کی بلوچستان کی صورت حال سے متعلق تقاریر

اور تحریروں پر مشتمل ہے۔ پروفیسر صاحب نے واضح کیا ہے کہ بلوچستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل اور ان کے اسباب کیا ہیں، ان مسائل کے حل نہ ہونے میں صوبائی اور وفاقی حکومتوں کا کیا کردار ہے؟ بلوچستان میں مختلف بیرونی طاقتوں کا کیا کردار ہے؟ ان کے کیا منصوبے ہیں؟ اور ان مسائل کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔

اس سیریز کی دیگر کتب کی طرح اس کتاب میں شامل تقاریر بھی سینیٹ میں پروفیسر صاحب کے خطابات کی مدد سے مرتب کی گئی ہیں۔ ان خطابات میں بعض ان کمیٹیوں کا ذکر بھی موجود ہے جن میں انھوں نے بطور رکن شرکت کی اور رپورٹ کی تیاری میں حصہ لیا۔ موضوع کی مناسبت اور اہمیت کے پیش نظر بعض رپورٹوں کی تلخیص اور سفارشات بھی اس جلد کا حصہ ہیں۔

کتاب کا دوسرا حصہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اور بلوچستان بار کونسل کے زیر اہتمام کوئٹہ میں منعقدہ سیمینار کی رپورٹ ہے۔ سیمینار کے شرکاء میں بلوچستان کی سیاسی و سماجی قیادت سے تعلق رکھنے والے راہنماؤں کے علاوہ کئی ماہرین بھی شامل تھے۔ اس متنوع قیادت نے سیمینار کے دوران سادگی سے لیکن بہت کھل کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اسی جذبہ کے ساتھ یہاں پیش کی گئی رپورٹ میں بھی احتیاط کی گئی ہے کہ شرکاء نے جن الفاظ اور لب ولہجہ میں اظہار خیال کیا ہے اسے برقرار رکھا جائے تاکہ یہ صورت حال کو درست طور پر سمجھنے اور کسی لائحہ عمل کی تشکیل کے لیے راہ ہموار کرنے میں معاون ہو۔

کم و بیش دو دہائیوں پر پھیلی تقاریر، مضامین اور رپورٹوں کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ بلوچستان میں موجود بے چینی اور رد عمل کے پس منظر میں موجود مسائل کی نوعیت میں بنیادی طور پر کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اسی اعتبار سے مختلف اوقات میں حل کے لیے دی جانے والی تجاویز کا رخ بھی ایک ہی ہے۔ ایسے میں مباحث میں کہیں کہیں تکرار کا احساس ہو تو یہ غیر فطری نہیں ہے۔ تاہم دوسری جانب اس مطالعہ کی اہمیت اس اعتبار سے بڑھ گئی ہے کہ اس دوران پاکستان اور چین کے اشتراک سے شروع ہونے والے

میگا پراجیکٹ سی پیک (CPEC) نے زیر بحث مسائل کی نزاکت و حساسیت اور ان کے ممکنہ اثرات کے دائرہ کو وسیع تر کر دیا ہے۔

اس مجموعی تناظر میں کتاب میں پیش کیے گئے مباحث مطالعہ پاکستان اور مطالعہ بلوچستان کے طلبہ و اساتذہ اور محققین کے لیے تو مفید ہیں ہی، اس سے کہیں بڑھ کر یہ پالیسی سازوں کے لیے راہنمائی فراہم کرتے ہیں۔ یہ کہ وہ ماضی کی کوششوں اور ان کے اثرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے آج کے تناظر میں بہتر فیصلے کر سکیں۔

خالد رحمٰن

چیئرمین

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

# مضامین اور سینیٹ تقاریر

- سلگتے مسائل اور قیادت کی ذمہ داری
- بیرونی عزائم اور مقابلہ کے لیے حکمت عملی
- بحران کی نوعیت: اصلاح احوال کیسے ہوگی؟
- واقعات کا تشویشناک تسلسل: حکمت عملی میں بہتری کی ضرورت
- بلوچستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل پر پارلیمنٹ کی کمیٹی کی رپورٹ (تلخیص)
- دہشت گردی کے مسلسل واقعات: پریشان کن سوالات

# سلگتے مسائل اور قیادت کی ذمہ داری

تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ تاریخ سے سبق کم ہی لیا جاتا ہے اور ہر دور میں مغرور اور خود سر حکمران وہی غلطیاں دہراتے چلے جاتے ہیں، جن کے سبب ان کے پیش رو عبرت کا نشان بنے تھے۔ یہ مقولہ کہ ''جب روم جل رہا تھا تو نیرو بانسری بجانے میں مشغول تھا'' ضرب المثل بن گیا چنانچہ ہر دور کے نیرو اپنی اپنی دلچسپی کے شغل میں منہمک نظر آتے ہیں اور جلتے در و دیوار انھیں اپنے خوابِ غفلت سے بیدار کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ہماری اپنی خود پسند قیادت کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں۔

مشرقی پاکستان میں جب آئینی اداروں کے کردار کو تسلیم کرنے سے انکار کے نتیجے میں محرومی اور بے چینی کا لاوا پک رہا تھا، تو اس وقت کا فوجی حکمران اسے ''چند شر پسندوں کی بغاوت'' قرار دے کر اعلان کر رہا تھا کہ ''میں ہتھیاروں کی زبان استعمال کر کے سب کو سرنگوں کر لوں گا''۔ جن اہلِ دانش نے اس کو مشورہ دیا کہ ہتھیاروں کی زبان نہیں، دلیل کا ہتھیار استعمال کرو تو اس نے اسے کمزوری اور بزدلی قرار دے کر رد کر دیا اور پھر اسی سال ۱۶ دسمبر کو قائداعظم کے پاکستان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ آج ایک دوسرا فوجی حکمران پھر طاقت کی زبان استعمال کرنے کی باتیں کر رہا ہے اور ''شر پسندوں کو سخت کارروائی کا انتباہ'' دے رہا ہے، اور وہ سیاسی قیادت جو حالات کی نزاکت کو محسوس کرتی ہے اور مسئلے کا سیاسی حل نکالنا چاہتی ہے افسوس ہے کہ وہ کمزوری، غفلت اور وقت گزاری کی مرتکب ہو رہی ہے۔ پارلیمنٹ موجود ہے مگر اسے اس مسئلے پر بحث کرنے اور اس کا حل نکالنے کی اجازت

نہیں۔ ایک پارلیمانی کمیٹی [1] نے تین چار مہینے کی تگ و دو اور تمام متعلقہ عناصر سے کامیاب مذاکرات کے ذریعے مسئلے کے حل کی کچھ واضح راہیں تلاش کیں، مگر اس کا کام بھی معرضِ خطر میں ہے۔ آخر اس دلدل سے نکلنے کی کیا راہ ہے؟ مستقبل پر بات کرنے سے پہلے صحیح صورت حال، اصل مسائل اور ان کے حل کے نقشۂ راہ پر مختصر گفتگو ہو جائے تو پھر شاید سنگ ہائے راہ سے نجات کا راستہ بھی نکالا جا سکے۔

بلوچستان پاکستان کے رقبے کا ۴۵ فی صد اور آبادی کے تقریباً ۶ فی صد پر مشتمل ہے۔ تقریباً ۷۷۰ کلومیٹر کا ساحلی علاقہ اور ایران اور افغانستان سے سینکڑوں کلومیٹر کی مشترک سرحد ہے۔ تیل، گیس، کوئلے اور دوسری قیمتی معدنیات سے مالا مال ہونے کے باوجود اس وقت یہ ملک کا غریب ترین صوبہ ہے۔ بلوچ اور پشتون، آبادی کا تقریباً ۸۸ فی صد ہیں اور آپس میں کم و بیش برابر ہیں، جب کہ باقی ۱۲ فی صد وہ آبادکار (Settlers) ہیں جو آہستہ آہستہ اس سرزمین کا حصہ بن چکے ہیں۔ قبائلی نظام اب بھی مضبوط ہے اور اس کی روایات معاشرے کی شناخت ہیں۔ معاشی ڈھانچا نہ ہونے کے برابر ہے اور آبادی کے دُور دراز علاقوں تک پھیلے ہونے کی وجہ سے مواصلات اور سہولتوں کی فراہمی کا کام مشکل اور نسبتاً مہنگا ہے۔ جو سہولت دوسرے صوبوں میں مثال کے طور پر ایک کروڑ روپے کے خرچ سے میسر آسکتی ہے صوبہ بلوچستان میں تین سے چار گنا زیادہ اخراجات درکار ہیں۔ اس بنیادی حقیقت کو کسی حکومت نے محسوس نہیں کیا۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ وسائل کی فراہمی کا کام کبھی بھی اس صوبے کے لیے انصاف اور ضروریات کی بنیاد پر نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچستان کے، دیہی

---

[1] پاکستان مسلم لیگ (ق) کے سربراہ اور سابق وزیر اعظم چوہدری شجاعت حسین نے اپنی سربراہی میں ۲۹ ستمبر ۲۰۰۴ء کو بلوچستان کی صورتحال کے سلسلے میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے منتخب اراکین پر مشتمل ایک پارلیمانی کمیٹی قائم کی اس کمیٹی کو تین ماہ کے اندر اپنی رپورٹ پیش کرنا تھی۔ کمیٹی نے اپنے کام کو دو حصّوں میں تقسیم کرتے ہوئے سینیٹر مشاہد حسین اور سینیٹر وسیم سجاد کی سربراہی میں دو ذیلی کمیٹیاں قائم کیں۔ ان میں سے ایک ذیلی کمیٹی نے جو سیاسی، سماجی اور اقتصادی مسائل سے متعلق تھی نومبر ۲۰۰۵ء میں اپنی رپورٹ پیش کی جس کی تلخیص اس کتاب میں بھی شامل ہے۔ جبکہ زیر نظر مضمون کے آخر میں بھی اس کے بعض اہم نکات شامل ہیں۔ آئینی امور سے متعلق دوسری کمیٹی اپنا کام مکمل نہ کر سکی۔

علاقے میں غربت پاکستان کی اوسط غربت سے تقریباً دگنی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ وہ گیس جو سوئی سے نکل کر کراچی سے پشاور تک روشنی اور حرارت فراہم کر رہی ہے خود سوئی کی ۹۹ فی صد آبادی اور بلوچستان کی ۹۵ فی صد آبادی اس کی روشنی اور تمازت سے محروم ہے۔

موجودہ حکومت کا دعویٰ ہے کہ اس صوبے کے لیے کئی بڑے منصوبے (Mega projects) اور ڈھائی ہزار کے قریب دوسرے ترقیاتی منصوبے زیر تکمیل ہیں اور چھے سال میں ۱۲۰ ارب روپے اس کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ میرانی ڈیم، گوادر پورٹ اور مکران ہائی وے پر کام اس کا کارنامہ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے باوجود بلوچستان میں نفرت اور بے چینی کی لہریں کیوں اٹھ رہی ہیں؟ عالم یہ ہے کہ ۲۰۰۳ء اور ۲۰۰۴ء کے دو سال میں ۱۵۲۹ راکٹ فائر کیے گئے ہیں، ۱۱۳ بم دھماکے ہوئے ہیں، تین چینی انجینئر ہلاک ہوئے ہیں اور اس کے علاوہ ۱۰۰ سے زیادہ افراد اب تک جاں بحق ہو چکے ہیں اور کئی سو زخمی۔ بگٹی علاقے کا محاصرہ ہے، ڈاکٹر شازیہ کا المناک واقعہ[1] رونما ہوا ہے اور جب سوئی گیس کی رسد متاثر ہوتی ہے، اور یہ بار بار ہوئی ہے تو ملک کو روزانہ ۱۵ سے ۲۰ کروڑ روپے کا نقصان ہوتا ہے۔ انسانی جانوں کا ضیاع سب سے بڑا المیہ ہے جس کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔

یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟ کیا یہ محض چند سرداروں کی سرکشی اور شرارت ہے جو اپنے

---

[1] ۲ جنوری ۲۰۰۵ء کو پاکستان پٹرولیم کی ملازم ڈاکٹر شازیہ خالد کی سوئی ہسپتال کے رہائشی علاقے میں نامعلوم افراد نے عصمت دری کی، تشدد کیا اور باندھ کر چلے گئے۔ سوئی گیس فیلڈ کا علاقہ فوج اور دیگر ایجنسیوں کے پہرے میں ہوتا ہے۔ پہلے تین دن ڈاکٹر شازیہ کو خواب آور دواؤں کے زیر اثر رکھا گیا جس کی ایک وجہ یہ سمجھی جاتی ہے کہ اس طرح وہ کسی کو بیان نہ دے سکے۔ بعد ازاں انھیں کراچی میں اصغر نفسیاتی ہسپتال منتقل کر دیا گیا، دو ماہ تک وہ اپنے گھر میں نظر بند رہیں جہاں انھیں پولیس یا میڈیا سے رابطہ کی اجازت نہ تھی۔

سوئی کا علاقہ ڈیرہ بگٹی میں واقع ہے اس تناظر میں نواب اکبر بگٹی نے اس مسئلے کو اپنی اور اپنے قبائل کی روایات اور عزت پر حملہ تصور کیا اور سیکورٹی اداروں سے ملزمان کے خلاف کارروائی کا مطالبہ کیا اس احتجاج کے دوران بگٹی قبائل اور سیکورٹی ادارے آمنے سامنے آ گئے اور بلوچستان میں پہلے سے موجود بے چینی کی فضا میں ایک نئے تصادم کی بنیاد پڑی۔

ذاتی فائدے کی خاطر صوبے کو یرغمال بنائے ہوئے ہیں؟ کیا اس میں بیرونی ہاتھ ہے کہ بھارت کے اپنے عزائم ہیں اور وہ گوادر بندرگاہ کو اپنے لیے خطرہ سمجھتا ہے۔ امریکہ کی اپنی سوچ ہے اور بلوچستان میں چین کے عمل دخل پر وہ مضطرب ہے۔ گوادر ہو یا سینڈک، ہر جگہ اسے چینیوں کا کردار نظر آتا ہے۔ ایران کے حوالے سے امریکہ کے خفیہ اداروں کا کردار اور بلوچستان کی سرزمین سے 'مجاہدین خلق' کے احیا کے اشارے مل رہے ہیں جن کو قوم پرست کہا جاتا ہے، ان کے اپنے اہداف ہیں اور ہوسکتے ہیں۔ ان سب نظریات اور تصورات میں کچھ نہ کچھ صداقت بھی ہوسکتی ہے لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ مخالف قوتیں حالات کو اسی وقت استعمال کرسکتی ہیں جب ان کے لیے حالات سازگار ہوں اور بگاڑ موجود ہو اور مسائل کو بروقت اور صحیح طریقے پر حل کرنے کی کوشش نہ کی جائے اور یہ سمجھ لیا جائے کہ بس قوت کے ذریعے سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل کو حل کیا جاسکتا ہے۔

مجھے پچھلے سال بلوچستان کے حالات کا زیادہ گہرائی سے مطالعہ کرنے اور صوبے کے چند اہم مقامات کا تفصیلی دورہ کرنے، بچشم سر حالات کا مشاہدہ کرنے اور درجنوں ذمہ دار افراد سے حقائق کو جاننے اور مسائل کو سمجھنے کا موقع ملا۔ جہاں مجھے یقین ہے کہ آج بھی تمام معاملات سیاسی عمل اور افہام و تفہیم کے ذریعے حل ہوسکتے ہیں، وہیں میرا یہ احساس اور بھی قوی ہوگیا ہے کہ کچھ برسرِاقتدار قوتیں مسائل کو حل کرنے میں کوئی دل چسپی نہیں رکھتیں بلکہ انھیں مزید الجھانے اور بگاڑنے کے درپے ہیں۔ اس کی نمایاں ترین مثال وہ پارلیمانی کمیٹی ہے جس کا اعلان چودھری شجاعت حسین نے اپنی وزارتِ عظمٰی کے مختصر دور (۳۰ جون ۲۰۰۴ء تا ۲۶ اگست ۲۰۰۴ء) میں کیا تھا اور جو اس حیثیت سے ایک منفرد کمیٹی تھی کہ اس میں پارلیمنٹ کی تمام سیاسی جماعتیں شریک تھیں بشمول قوم پرست جماعتیں، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس میں برسرِاقتدار جماعتوں کے نمائندوں کی تعداد ۱۶ تھی، جب کہ حزب اختلاف سے متعلق نمائندوں کی تعداد ۲۲ تھی اور کل اراکین کی تعداد ۳۸ تھی۔ یہ کمیٹی ۲۹ ستمبر ۲۰۰۴ء کو قائم ہوئی اور اسے ۹۰ دن میں اپنا کام مکمل کرلینا تھا۔

اِس پارلیمانی کمیٹی نے دو ذیلی کمیٹیاں قائم کیں: ایک سینیٹر وسیم سجاد کی سربراہی میں، جس کا کام دستوری معاملات پر سفارشیں پیش کرنا تھا اور دوسری سینیٹر مشاہد حسین سید کی سربراہی میں، جسے سیاسی اور معاشی معاملات پر سفارشات مرتب کرنا تھا۔ مجھے دوسری کمیٹی میں کام کرنے کا موقع ملا اور مجھے خوشی ہے کہ اس کمیٹی نے کھلے دل سے اور صرف ملک کے مفاد میں اپنی پوری کارروائی کی اور جماعتی وابستگیوں سے بالاتر ہو کر، ملک کے مفاد اور انصاف کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اپنی متفقہ سفارشات مرتب کیں جن کو ۵ جنوری ۲۰۰۵ء کو آخری شکل دے دی گئی لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ سفارشات آج تک پارلیمنٹ کے سامنے باضابطہ طور پر نہیں آسکی ہیں، ان پر عمل درآمد کی بات تو دُور کی چیز ہے۔ اس عرصے میں (مارچ ۲۰۰۵ء) کے سنگین واقعات[1] رونما ہوئے جن کے نتیجے میں حالات مزید بگڑ گئے۔ اس وقت طوفان کچھ تھما ہوا ہے مگر لاوہ پک رہا ہے اور حکمران اپنی ''راج ہٹ'' پر نازاں اور کمیٹی کے ارکان اس تغافل پر نالاں ہیں۔

یہ کہنا محال ہے کہ کمیٹی اپنی رپورٹ کب اور کس طرح پیش کرپاتی ہے لیکن ہماری نگاہ میں وقت آگیا ہے کہ ہم اپنی ذمہ داری پر اس نقطۂ نظر اور ان سفارشات کے جوہر کو بیان کر دیں جو کمیٹی کی اکثریت کی سوچ کی نمائندگی کرتی ہیں اور جس کو ایک متعین شکل دینے میں دوسرے ارکان کے ساتھ راقم نے بھی ایک واضح کردار ادا کیا ہے۔ ہمیں اس بات کو بھی ریکارڈ پر لانے میں کوئی تردد نہیں کہ سینیٹر مشاہد حسین سید اور خود چودھری شجاعت حسین کا رویہ مثبت رہا، البتہ ہمارے بار بار کے اصرار کے باوجود، وہ معاملات کو آگے بڑھانے میں کامیاب نہیں ہو پا رہے ہیں، معلوم نہیں کیوں؟

---

[1] ۱۷ مارچ ۲۰۰۵ کو فوجی طیاروں نے ڈیرہ بگٹی پر بمباری کر کے ۱۷ معصوم ہندو بلوچوں کو قتل کر دیا۔

۲۵ مارچ ۲۰۰۵ کو کراچی میں بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کی انسانی حقوق کے حوالے سے نکالی گئی ریلی کے اختتام پر تنظیم کے متعدد لیڈروں کو سیکورٹی فورسز نے گرفتار کر لیا۔

ہماری نگاہ میں مسئلے کے حل کے لیے سب سے پہلے چند بنیادوں کا تعین اور چند حقائق کا ادراک ضروری ہے اور ہم نے یہی چیز کمیٹی سے تسلیم کروانے کی کوشش کی:

۱۔ مسئلے کا کوئی فوجی حل ممکن نہیں۔ مسئلہ سیاسی ہے اور اس کا حل بھی سیاسی ہی ہو سکتا ہے۔

۲۔ مسئلے کے حل کے لیے تمام متعلقہ عناصر کو افہام و تفہیم کا راستہ اختیار کرنا ہو گا اور کوشش کرنا ہو گی کہ مکمل اتفاق رائے اور بصورت دیگر اکثریت کے مشورے سے معاملات کو طے کیا جائے۔

۳۔ یہ اصول تسلیم کیا جانا چاہیے کہ محض ''مضبوط مرکز'' کا فلسفہ غلط اور انصاف کے اصولوں کے منافی ہے۔ ''مضبوط مرکز'' اسی وقت ممکن ہے جب صوبے مضبوط ہوں اور کامل ہم آہنگی سے ایک دوسرے کے لیے مضبوطی کا ذریعہ اور وسیلہ بنیں۔ اب توجہ کے اصل محور کو مرکز سے صوبوں کی مضبوطی سے اس انداز سے منتقل ہونا چاہیے کہ مضبوط صوبے مضبوط مرکز کی راہ ہموار کریں۔ مرکز اور صوبوں میں (Dichotomy) کی جگہ مفاہمت، ہم آہنگی اور (Mutuality) کا رشتہ ہونا چاہیے۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کا بھی یہی تقاضا تھا جسے پورا نہیں کیا گیا۔

۴۔ چوتھا بنیادی اصول یہ ہے کہ جس طرح زنجیر کی مضبوطی کا انحصار اس کی کمزور ترین کڑی پر ہوتا ہے، اسی طرح ملک کی مضبوطی کے لیے بھی ضروری ہے کہ کمزور اور غریب طبقے کو اتنا مضبوط کیا جائے اور اس سطح پر لایا جائے کہ سب برابر کی مضبوطی اور خوش حالی کے مقام پر آجائیں۔ دوسرے الفاظ میں سب انصاف کے حصول کو مضبوط بنانے کی پالیسی پر عمل آرا ہوں۔ انصاف نام ہی توازن اور برابری کا ہے اور یہی چیز آج تک ہماری معاشی منصوبہ بندی اور سیاسی پالیسی میں مفقود رہی ہے۔

۵۔ اس پورے عمل میں اصل اہمیت افراد، علاقے، صوبے اور پوری قوم کے حقوق کا

تحفظ اور سیاسی اور معاشی عمل میں تمام عاملین کی بھرپور شرکت اور کارفرمائی کو حاصل ہے۔ فردِ واحد کی حکومت یا محض ایک خاص گروہ اور مقتدر گروہ کے ہاتھوں میں قوت اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت کا ارتکاز خرابی کی جڑ ہے۔ مسئلہ معاشی ہے مگر اس سے بھی زیادہ صوبوں کے اپنے وسائل پر اختیار اور سیاسی اور معاشی فیصلوں میں شرکت اور ترجیحات کے تعین کی قدرت کا ہے۔ منہ بند کرنے کے لیے کچھ گرانٹس یا مراعات کے دے دینے سے مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ ملکیت، اختیار اور اقتدار اور فیصلوں میں شرکت کے انتظام کو از سرِ نو مرتب کرنا اصل ضرورت ہے۔

۶۔ اس سلسلے میں فوج کا کردار بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ فوج کے لیے ضروری ہے کہ وہ صرف اور صرف دفاعِ وطن کی ذمہ داری سول حکمرانی کے تحت انجام دے۔ ساری خرابیوں کی جڑ سیاسی اور اجتماعی معاملات میں فوج کی مداخلت اور ایک مقتدر سیاسی قوت بن جانا ہے۔ چھاؤنیوں کی ضرورت اگر ملک کے دفاع اور سلامتی کے لیے ہے تو وہ مسئلہ میرٹ پر طے ہونا چاہیے لیکن اگر لوگوں کو یہ خطرہ ہو کہ یہ چھاؤنیاں سول نظام کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے ہیں تو پھر اس کے نتیجے میں سول عناصر اور فوجی قوت کے درمیان کش مکش ناگزیر ہو جاتی ہے۔ فوج کے سوچنے کا انداز (Mind-set) سول نظام سے بہت مختلف ہے اور دونوں کا اپنے اپنے حدود میں رہ کر تعاون ہی ملک کے نظام کی صحت کی ضمانت ہو سکتا ہے۔ تحکمانہ انداز بگاڑ پیدا کرتا ہے، اس سے خیر رونما نہیں ہو سکتا، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ کمیٹی فوجی چھاؤنیوں کے قیام کے بارے میں احتیاط کا مشورہ دے رہی ہے مگر فوج کے ترجمان کیا زبان استعمال کر رہے ہیں، جب کہ ۲۷ جنوری ۲۰۰۵ء کے ڈان میں فوج کے ایک کرنل مظہر مسعود صاحب کا سوئی میں فوجی چھاؤنی کے بارے میں جس طرح کا اعلان کیا گیا وہ اصلاح احوال کا ذریعہ کیسے بن سکتا ہے؟ ذیل میں دیے گئے اس اعلان کے الفاظ قابل غور ہیں۔

ہم یہاں آئے ہیں اور ہم نے پاکستان آرمی کو الاٹ شدہ ۴۰۰ ایکڑ زمین پر قبضہ

حاصل (We have taken over) کر لیا ہے۔ ہم یہاں جلد ہی ایک چھاؤنی تعمیر کریں گے جو اس علاقے کی ضرورت ہے۔ آج آپ کو یہاں صرف ریت کے ٹیلے نظر آئیں گے لیکن ایک بہت ہی مختصر مدت میں چھاؤنی کی تعمیر کی جائے گی اور ریت کے تودے سرسبز زمین میں تبدیل ہو جائیں گے۔ (بزنس ریکارڈر ۲ جنوری ۲۰۰۵ء)

یہ وہی منطق ہے جس کا اظہار برطانوی سامراج کی افواج اور حکمران کیا کرتے تھے کہ ہم نے مقبوضہ علاقوں کو ترقی سے ہمکنار کر دیا ہے۔ ترقی بلاشبہ مطلوب ہے مگر اس انداز میں کہ رشتہ حاکم اور محکوم کا نہ ہو بلکہ سب کے فیصلے سے اور سب کی شراکت سے معاملات طے ہوں۔ وسائل پر اختیار بھی آزادی کا لازمی حصہ ہے۔ محض سبزہ اُگانا اور روٹی دینا ترقی کا معیار نہیں۔

ان اصولوں کی روشنی میں کمیٹی کے ارکان کی اکثریت نے جو تجاویز دی ہیں، ان میں چند اہم یہ ہیں:

- **اوّل:** حقیقی صوبائی خود مختاری کے تقاضے پورا کرتے ہوئے دستور میں مرقوم مشترک فہرست (Concurrent list) کے ۴۶ موضوعات میں سے ۲۹ کو فی الفور صوبوں کے سپرد کر دیا جائے، باقی ۱۷ اگلے پانچ سال کے اندر اندر منتقل کر دیے جائیں۔ دستور کی مرکزی فہرست کے دوسرے حصے میں جو موضوعات ہیں وہ آئندہ کے لیے مشترک فہرست میں شامل کر دیے جائیں۔ نیز مشترک معاملات کی کونسل (Council of Common Interest) کو ایک مؤثر ادارہ بنایا جائے اور اس کی ششماہی نشستوں کو دستوری طور پر لازم قرار دیا جائے۔ اس کا اپنا سیکرٹریٹ ہو تاکہ یہ دوسروں کی مہربانی پر زندہ نہ رہے۔
- **دوم:** سیاسی فضا کو خوش گوار بنانے کے لیے ہر طرح کے عسکری تشدد کا راستہ بند کیا جائے، مذاکرات سے معاملات طے کیے جائیں، اور جو سیاسی کارکن گرفتار ہیں،

ریاستی اور سیاسی ان کی رہائی کا اہتمام کیا جائے۔

- **سوم:** صوبے کو اپنے وسائل پر اختیار دیا جائے اور مرکز سے جو وسائل منتقل ہوتے ہیں، ان میں انصاف اور ضرورت کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس سلسلے میں گیس اور معدنیات کی رائلٹی کو نئے فارمولے کی روشنی میں انصاف کے مطابق مقرر کیا جائے۔

- **چہارم:** معاشی ترقی کے ثمرات کو علاقے کے عوام تک پہنچانے کا بندوبست ہو۔ اس کے لیے تجویز کیا گیا ہے کہ معدنی وسائل کو دریافت کرنے اور ترقی دینے والی کمپنیوں کے لیے لازم کیا جائے کہ وہ اپنی کل سرمایہ کاری (Investment) کا کم از کم پانچ فی صد علاقے کے لوگوں کی تعلیم، صحت اور دوسری سہولتوں کی فراہمی کے لیے استعمال کریں، نیز معدنیات کی ترقی کے بعد ان کمپنیوں کے قبل از ادائیگی ٹیکس نفع کا پانچ فی صد اس علاقے کی ترقی کے لیے صرف کیا جائے۔

- **پنجم:** صوبے میں تعلیم، صحت، پانی کی فراہمی، بجلی اور گیس کی فراہمی وغیرہ کا خصوصی اہتمام کیا جائے اور ملازمتوں پر مقامی آبادی اور صوبے کے لوگوں کو ترجیح دی جائے، اور یہ سب کام میرٹ کی بنیاد پر انجام دینے کے لیے مقامی آبادی کی تعلیم، پیشہ ورانہ تربیت اور ہنر سکھانے کا انتظام کیا جائے۔

- **ششم:** فرنٹیئر کور اور کوسٹل گارڈز کو صرف ساحلی علاقوں اور سرحدوں کی حفاظت کے لیے مختص کیا جائے اور ان کا سول کردار ختم کیا جائے۔ نیز اسمگلنگ روکنے کے نام پر جو ۵۰۰ سے زیادہ چوکیاں قائم کر دی گئی ہیں، ان کو ختم کیا جائے۔ اسمگلنگ روکنے کا کام فرنٹیئر کانسٹیبلری اور کوسٹل گارڈ سے نہ لیا جائے بلکہ یہ ایکسائز ڈیپارٹمنٹ کی ذمہ داری ہو۔ اسی طرح فوجی چھاؤنیوں کا معاملہ سیاسی بحث و مناقشے کا حصہ نہ ہو اور صرف دفاعی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر میرٹ پر فیصلہ کیا جائے۔ فی الحال ان کے قیام کو ملتوی کر دیا جائے تاکہ بہتر فضا میں صحیح فیصلے ہو سکیں۔

- **ہفتم:** گوادر پورٹ کی اتھارٹی کو فوری طور پر کراچی سے گوادر میں منتقل کیا جائے۔ اس میں صوبے کو مناسب نمائندگی دی جائے، اس کی ترقی کے پورے پروگرام میں صوبے کی ضرورتوں کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ علاقے کے لوگوں کو ان کا حق ملے، زمینوں پر باہر والے قبضہ کر کے علاقے کی شناخت کو تبدیل نہ کر دیں اور جو متاثرین ہیں ان کو قریب ترین علاقے میں آباد کیا جائے۔ نیز اراضی کے بڑے بڑے قطعے جس طرح فوج، نیوی اور دوسرے بااثر افراد اور اداروں نے اپنے لیے مخصوص کر لیے ہیں ان کو سختی سے روکا جائے اور انصاف پر مبنی شفاف انداز میں پورے علاقے کا ماسٹر پلان از سرِ نو تیار کیا جائے۔
- **ہشتم:** بلوچستان میں بلوچوں اور پشتونوں کے درمیان توازن اور ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ صوبے کے تمام علاقوں اور باسیوں کی منصفانہ اور متوازن ترقی کے تقاضے بہر صورت پورے ہونے چاہییں۔ خصوصیت سے خشک سالی کی بنا پر جو علاقے گذشتہ آٹھ برس سے متاثر ہیں ان کی ترقی اور تلافی کا اہتمام کیا جائے۔
- **نہم:** بلوچستان میں نظم و نسق کے روایتی انتظام کو جس میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت مقامی لیوی کو حاصل ہے، برقرار رکھا جائے اور اس کی ترقی کا اہتمام کیا جائے نہ کہ اس کو ختم کر کے پولیس کے نظام کو ان پر مسلط کیا جائے جو اس علاقے میں بھی ناکام ہے جہاں اس وقت اسے قدرت حاصل ہے۔

ہمارا مقصد کمیٹی کی مکمل سوچ کا احاطہ اور اس کی تمام سفارشات کا بیان نہیں۔ ہم سوچ کے اس رخ کو سامنے لانا چاہتے ہیں جو پارلیمنٹ کی اس کمیٹی نے پیش کیا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس سے بلوچستان ہی نہیں، تمام صوبوں اور ملک کے سب علاقوں اور متاثرہ افراد کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ یہ سب صرف اسی وقت ممکن ہے جب اصل فیصلے پارلیمنٹ میں ہوں، عوام کے مشورے سے ہوں۔ مکالمے کے ذریعے سیاسی معاملات کو طے کیا جائے۔ مخصوص مفادات اور فوجی اور سول مقتدرہ (Military-civil establishment) کی

گرفت کو ختم کیا جائے، اور عوام اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے جمہوری اداروں کے ذریعے اپنی قسمت کا فیصلہ خود کریں۔

صوبائی قیادت کی بھی بڑی ذمہ داری ہے۔ بلوچستان کی صوبائی قیادتیں بھی حالات کے بگاڑ کے سلسلے میں ایک حد تک ذمہ دار رہی ہیں لیکن زیادہ ذمہ داری مرکزی قیادت اور خصوصیت سے حکمران طبقے پر عائد ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شاید یہی وہ طبقہ ہے جو پارلیمانی کمیٹی کے کام کے آگے بڑھنے کی راہ میں حائل ہے۔ مسئلے کا حل پارلیمنٹ، سیاسی جماعتوں اور عوام کے اپنے کردار کو موثر بنانے میں ہے، بقول اقبال ؎

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تُو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

(عالمی ترجمان القرآن جولائی ۲۰۰۵ء)

# بیرونی عزائم اور مقابلہ کے لیے حکمت عملی

بڑے دُکھ اور افسوس کے ساتھ ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ گذشتہ کئی سالوں سے بلوچستان بُری طرح جل رہا ہے اور اس زمانے کی دونوں برسرِاقتدار قوتیں، یعنی پرویز مشرف کی فوجی حکمرانی اور اس کے بعد زرداری گیلانی کی نام نہاد جمہوری حکومت جلتی پر تیل ڈالنے کی مرتکب ہوئی ہیں۔ آج نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ امریکی کانگریس کی Surveillance and Oversight Committee نے ۸ فروری ۲۰۱۲ء کو بلوچستان کے مسئلے پر باقاعدہ ایک نشست منعقد کی ہے، اور ۱۷ فروری ۲۰۱۲ء کو اس کمیٹی کے سربراہ ڈینا روہرابیکر (Dana Rohrabacher) نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کانگریس میں باقاعدہ ایک مسودۂ قانون جمع کرادیا ہے۔ اس مسودہ قانون میں بلوچستان کے پاکستان سے الگ ملک بنائے جانے اور بلوچوں کے لیے حق خود ارادیت کے حصول کی جدوجہد کی تائید اور سرپرستی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔[1]

واضح رہے کہ یہ شرانگیز اقدام امریکی سیاسی قوتوں کی طرف سے اس نوعیت کی پہلی کوشش نہیں ہے۔ امریکہ ایک طرف تو کہتا ہے کہ اگرچہ پاکستان نیٹو میں شامل نہیں مگر نیٹو میں شامل دیگر ملکوں کی طرح ہمارا حلیف اور دوست ہے اور ہمارا اسٹرے ٹیجک پارٹنر ہے، اور دوسری طرف پاکستان کی آزادی، حاکمیت، خود مختاری اور عزت پر بے دریغ حملے کرتا ہے۔ اس

---

[1] بل کے ساتھ جو قرارداد پیش کی گئی اس کا متن اس مضمون کے آخر میں دیا گیا ہے جس سے بیرونی عزائم کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ امریکی کانگریس کی ویب سائٹ پر دی گئی تفصیل کے مطابق ۱۷ فروری کو ہی بل ایوان کی فارن ریلیشنز کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا جس نے ۷ مئی ۲۰۱۲ء کو اسے سب کمیٹی برائے ایسٹ اور ساؤتھ ایشیا کو ریفر کر دیا۔ www.congress.gov بل پر بعد ازاں کسی ایکشن کی تفصیل سامنے نہیں آئی۔

کی زمین اور فضائی حدود کو پامال کرتا ہے اور ملک میں تخریب کاری کی نہ صرف سرپرستی کرتا ہے، بلکہ سی آئی اے کے امریکی کارندوں اور پاکستانی بھاڑے کے ٹٹوؤں (mercenaries) کو بے دریغ استعمال کرتا ہے۔ بھارت بہت پہلے سے اس قسم کی مذموم حرکتوں کی پشتی بانی کرتا رہا ہے اور اب امریکی بھارتی اسٹرے ٹیجک پارٹنر شپ کا یہ مشترک ہدف ہے۔

امریکہ اس وقت پاکستان کے خلاف بی۔۳، یعنی Blackmail, Bribe and Bullets (رشوت، بلیک میل اور گولی) کی حکمت عملی پر گامزن ہے۔ اس کا یہ خطرناک اور خونیں کھیل ریمنڈ ڈیوس کے جنوری ۲۰۱۱ء کے واقعے[1] کے بعد اور کانگریس کی حالیہ کارروائیوں کی شکل میں زیادہ ہی گمبھیر ہوتا جارہا ہے۔ افسوس ہے کہ ہماری سیاسی اور فوجی قیادت اب بھی امریکہ کے اصل کھیل کو سمجھنے اور اس کے مقابلے کے لیے جان دار حکمت عملی بنانے سے قاصر ہے، اور اس کے کردار اور عوام کے جذبات و احساسات میں خلیج روز بروز بڑھتی ہی جارہی ہے۔ ان حالات میں قوم کے لیے اس کے سوا عزت اور آزادی کا کوئی اور راستہ باقی نہیں رہا ہے کہ اس قیادت سے جلد از جلد نجات پائے اور ایسی قیادت کو برسرِاقتدار لائے جو پاکستان کی آزادی، حاکمیت، عزت اور مفادات کی بھرپور انداز میں حفاظت کرسکے اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کرے۔

بلوچستان کے مسئلے کے دو اہم پہلو ہیں اور دونوں ہی بے حد اہم اور فوری اقدام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ امریکہ جو کھیل کھیل رہا ہے وہ نیا نہیں۔ اس کا ہدف پاکستان کی آزادی، اس کا نظریاتی تشخص اور اس کی ایٹمی صلاحیت پر ضرب ہے۔ درحقیقت اب ایک عرصے سے اس ہمہ گیر ہدف کے حصول کی حکمت عملی کے ایک پہلو کی حیثیت سے بلوچستان کارڈ استعمال کیا جارہا ہے۔ ہنری کسنجر سے لے کر حالیہ قیادت تک سب کے سامنے ایک مرکزی ہدف

---

[1] ریمنڈ ڈیوس جو امریکہ کی ایک نجی سیکورٹی کمپنی کا ملازم تھا اس نے ۲۷ جنوری ۲۰۱۱ء کو لاہور میں دو نوجوانوں کو گولی مار کر قتل کر دیا تھا۔ اس کی گرفتاری کے بعد حکومت پاکستان نے امریکی دباؤ پر (لیکن بظاہر مقتولین کے ورثاء سے صلح کے نتیجے میں) اسے رہا کر دیا۔

اُمت مسلمہ کی تقسیم در تقسیم اور اس کے وسائل پر بلاواسطہ یا بالواسطہ (مقامی چہروں کے ذریعے) قبضہ ہے۔ اس پالیسی کا پہلا ہدف مقامی قومیتوں کے ہتھیار کے ذریعے دولت عثمانیہ کا شیرازہ منتشر کرنا تھا۔ پھر افریقہ کو چھوٹے چھوٹے ملکوں میں بانٹ کر غیر مؤثر کر دیا گیا۔ بالفور ڈیکلریشن کے سہارے عالمِ عرب کے قلب میں اسرائیل کا خنجر گھونپنا بھی کچھ دوسرے مقاصد کے ساتھ اسی حکمت عملی کا ایک حصہ تھا۔ پاکستان کو ۱۹۷۱ء میں دولخت کرنا، سوڈان اور انڈونیشیا کے اعضاء کو کاٹ کر اپنی باج گزار ریاستیں وجود میں لانا، عراق اور افغانستان میں زبان، نسل اور مسلک کی بنیاد پر ان ممالک کی سرحدوں کو بدلنے کی کوشش، کرد قومیت کو ہوا دے کر عراق، ایران اور ترکی میں دہشت گردی اور خون خرابے کی آگ کو بھڑکانا، یہ سب اسی حکمت عملی کے مختلف پہلو ہیں۔

پاکستان ایک بار پھر اس صلیبی جنگ کی زد میں ہے۔ ۲۰۰۶ء میں رالف پیٹرز (Ralph Peters) نے USArmed Forces Journal میں Blood Borders (خونی سرحدیں) کے عنوان سے ایک شر انگیز مضمون لکھا جس میں پاکستان کی تقسیم اور تبدیل کی جانے والی سرحدوں کا نقشہ پیش کیا گیا۔ اس میں آزاد بلوچستان کو ایک الگ ملک کی حیثیت سے دکھایا گیا تھا۔ بھارت اور امریکہ دونوں اپنے اپنے انداز میں پاکستان میں تخریب کاری کے ساتھ علیحدگی کی تحریکوں کی سرپرستی کرتے رہے ہیں۔ اس وقت جب عوامی دباؤ کے تحت پاکستان امریکہ سے تعلقات کی نوعیت پر نظر ثانی کر رہا ہے اور پاکستان، ایران اور افغانستان علاقے کے امن اور سلامتی کے لیے علاقائی بندوبست کی تلاش میں ہیں، پاکستان کے اندرونی حالات کو خراب کرنے کی کوششیں تیز تر ہو گئی ہیں۔ نیز امریکہ اور بھارت دونوں کی نگاہ میں پاکستان اور چین کا قریبی تعلق اور خصوصیت سے بلوچستان میں چین کی بڑھتی ہوئی دل چسپی کا راستہ روکنے اور پاکستان ایران گیس پائپ لائن اور بجلی کی فراہمی میں تعاون کو مؤخر و ملتوی اور معاملے کو خراب کرنے کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔

امریکہ کے ان جارحانہ عزائم کو سمجھنا اور ان کا مؤثر انداز میں مقابلہ کرنا دفاعِ پاکستان

کا اہم ترین پہلو ہے۔ اس کے لیے 'امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ' سے نکلنا اور افغانستان سے امریکی اور نیٹو فوجوں کی مکمل اور جلد از جلد واپسی کے لیے علاقے کے ممالک کے تعاون سے فیصلہ کن جدوجہد کرنا وقت کی اصل ضرورت ہے۔ اس کے لیے قوم کو بیدار اور متحرک کرنا ازبس ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی کانگریس میں جو کھچڑی پک رہی ہے، اس کا سختی سے نوٹس لینا اور قوم کو اپنی آزادی اور امریکہ کی گرفت سے نکلنے کے لیے متحد اور منظم کرنا ضروری ہے۔ امریکہ کی طرف سے گذشتہ ایک سال میں جو کچھ ہوا ہے، خواہ اس کا تعلق ریمنڈ ڈیوس کو قانون کی گرفت سے چھڑا لے جانے سے ہو، یا ہر دم بڑھتے ہوئے ڈرون حملوں سے، ۲ مئی ۲۰۱۱ء کا ایبٹ آباد کا حملہ[1] ہو یا ۲۶ نومبر ۲۰۱۱ء کا سلالہ چیک پوسٹ[2] پر فوج کشی، یا فروری ۲۰۱۲ء کی کانگریس کی سفارتی لبادے میں سیاسی جنگ یہ سب ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں، جو قوم کو بیدار کرنے کے لیے تازیانے کی حیثیت رکھتی ہیں اور جن کا جواب موجودہ حکومت کے بس کا کام نہیں۔ اس چیلنج کا مقابلہ نئی باصلاحیت، دیانت دار اور قوم کی معتمد علیہ قیادت ہی کر سکتی ہے۔

مسئلے کا دوسرا پہلو بلوچستان کے حالات اور ان کی اصلاح ہے۔ بیرونی ہاتھ اپنا کام کر رہا ہے مگر اسے یہ کھیل کھیلنے کا موقع ہماری اپنی سنگین غلطیاں اور حالات کو بروقت قابو میں نہ لانے بلکہ مزید بگاڑنے والی پالیسیاں ہیں۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے سانحے سے ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ایک 'جمہوری وزیراعظم' نے ۱۹۷۳ء کے دستور کے نفاذ کے چند

---

۱ ۲ مئی ۲۰۱۱ء کو سی آئی اے کی قیادت میں امریکی افواج کے خصوصی دستوں نے جو ہیلی کاپٹروں پر آئے تھے، مشترکہ آپریشن کر کے القاعدہ کے رہنما اسامہ بن لادن کو جن کے بارے میں کہا گیا کہ وہ ایبٹ آباد میں رہائش پذیر تھے ہلاک کر دیا۔ رپورٹ کے مطابق ان کی لاش کو پہلے افغانستان منتقل کیا گیا اور بعد ازاں سمندر میں بہا دیا گیا۔ اس آپریشن کے دوران امریکی فوجی دستوں کو پاکستان میں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا، آپریشن کی نگرانی خود اس وقت کے امریکی صدر باراک اوباما نے کی۔

۲ اشارہ ہے نیٹو افواج کی جانب سے ۲۶ نومبر ۲۰۱۱ء کو پاک افغان بارڈر پر سلالہ کے قریب دو پاکستانی فوجی چوکیوں پر حملہ کی طرف۔ اس حملہ میں ۲۸ پاکستانی فوجی جاں بحق اور ۱۱ زخمی ہو گئے تھے۔

ماہ ہی کے اندر، بلوچستان کی منتخب حکومت کو برطرف کر کے سیاسی مسائل کے لیے فوجی حل کے تباہ کن راستے کو اختیار کیا، اور دستور کے مخلصانہ نفاذ سے جو برکتیں ملک و قوم کو حاصل ہو سکتی تھیں ان سے محروم کر دیا۔ یہ ستم ظریفی سے کم نہیں کہ جو آگ پیپلز پارٹی کے پہلے دورِ حکومت میں لگائی گئی تھی وہ اس کے بعد وجود میں آنے والی ایک فوجی حکومت کے دور میں سرد پڑی اور تصادم کی وہ شکل ختم ہوئی جو تباہی کی طرف لے جا رہی تھی۔ مقامِ افسوس ہے کہ اس کے بعد آنے والے نئے جمہوری اَدوار میں بھی نہ مرکزی قیادت نے اور نہ صوبے کی قیادت نے بلوچستان کے مسئلے کا صحیح حل تلاش کرنے کی کوئی منظم اور مؤثر کوشش کی، اور زیرِ زمین آگ پھر سُلگنے لگی جو پرویز مشرف کے فوجی حکمرانی کے دور میں ایک بار پھر بھڑک پڑی، اور آج نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بلوچستان کے بعض علاقوں میں پاکستان کے پرچم اور ترانہ کی توہین کے واقعات بھی سامنے آجاتے ہیں۔ قانون نافذ کرنے والی قوتیں ہی لاقانونیت کا مظاہرہ کر رہی ہیں اور اپنے ہی شہریوں پر آگ اور خون کی بارش کر رہی ہیں۔ لاپتا افراد کی تعداد بڑھ رہی ہے اور سیکڑوں کی تعداد میں مسخ شدہ لاشیں بے گور و کفن تختے کی صورت میں دی جا رہی ہیں۔ نواب اکبر بگٹی جو بلوچستان کے مسئلے کے سیاسی حل کے لیے فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے تھے، ان کو جس بے دردی اور رعونت کے ساتھ شہید کیا گیا ہے اور جس طرح انھیں سپردِ خاک کیا گیا ہے، اس نے غم و غصے کا وہ سیلاب برپا کیا ہے جس نے صوبے ہی نہیں ملک کے دروبست کو ہلا دیا ہے۔

ہمیں بڑے دُکھ سے اس حقیقت کو بیان کرنا پڑ رہا ہے کہ بلوچستان اپنی تمام اسٹریٹیجک اہمیت اور معدنی اور مادی وسائل سے مالا مال ہونے کے باوجود ملک کا پس ماندہ ترین صوبہ ہے اور معاشی اور سیاسی اعتبار سے بنیادی ڈھانچے سے محروم ہے۔ ملک میں سماجی و اقتصادی بنیادی ڈھانچے (Socio-economic infrastructure) سے محرومی کے سلسلے میں پنجاب کا محرومی کا اشاریہ ۲۹ فی صد، سندھ کا ۵۰ فی صد، خیبر پختونخواہ کا ۵۱ فی صد اور بلوچستان کا ۸۸ فی صد ہے۔ غربت کی انتہائی سطح پر رہنے والی آبادی پنجاب میں ۲۶ فی صد، سندھ میں ۳۸ فی صد،

خیبر پختونخواہ میں ۲۹ فی صد اور بلوچستان میں ۴۸ فی صد ہے۔ خواندگی کی شرح پاکستان میں ۵۰ فی صد ہے لیکن بلوچستان میں مردوں میں ۲۳ فی صد اور خواتین میں صرف ۷ فی صد ہے۔ بلوچستان جس کی گیس نے پورے پاکستان کو روشنی اور گرمایش دی ہے اور ۵۰ برس سے دے رہا ہے، وہ صوبہ اس نعمت سے محروم رہا ہے۔ گیس کی دریافت کے ۳۲ سال بعد ۱۹۸۵ء میں کوئٹہ میں گیس آئی ہے اور اب بھی بلوچستان کا ۷۸ فی صد حصہ گیس سے محروم ہے۔ گیس کی رائلٹی کے لیے بھی جو منبع (Well-head) پر مقررہ قیمت اسے دی گئی ہے وہ دوسرے صوبوں سے نکلنے والی گیس کا بمشکل ۲۵ فی صد ہے۔ ایک تازہ مطالعے کے مطابق:

> ”بلوچستان کے ہر دو باشندوں میں سے ایک خطِ غربت کے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔ ہر دو میں سے ایک کی صاف پانی تک رسائی نہیں ہے۔ ہر دو میں سے ایک بچہ پرائمری سکول کے سایے سے بھی محروم ہے۔ ہر تین میں سے صرف ایک بچے کو حفاظتی ٹیکے لگائے جاتے ہیں اور دو اس بنیادی حفاظتی سہولت سے بھی محروم ہیں“۔ (دی نیوز، ۲۱ فروری ۲۰۱۲ء)

اسی طرح ملازمتوں میں بلوچستان کے لوگوں کی محرومی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے۔ جو کوٹہ دیا گیا ہے وہ بھی کسی سرکاری یا نیم سرکاری اداروں میں ان کو میسر نہیں اور کم از کم گذشتہ سات برسوں میں، (جب کہ پارلیمنٹ کی کمیٹی برائے بلوچستان (۲۰۰۵ء) نے اس ناانصافی کے فی الفور خاتمے کا مطالبہ کیا تھا) کوئی نمایاں فرق نہیں پڑا ہے۔ ستمبر ۲۰۰۵ء میں پارلیمنٹ کی کمیٹی نے ۱۳۵ اہم سفارشات دی تھیں[1] اور ان پر عمل اور نگرانی کے لیے ۹۰ دن کے اندر اندر پارلیمانی کمیٹی کے تقرر کی سفارش کی تھی، مگر آج تک وہ کمیٹی بنی ہے اور نہ سفارشات میں سے بیش تر پر عمل ہوا ہے جس کی ذمہ داری مرکز اور صوبے دونوں کی قیادت پر آتی ہے۔ مجرمانہ غفلت کا حال یہ ہے کہ پارلیمنٹ میں بڑی لے دے کے بعد چھے ماہ

---

[1] پارلیمنٹ کی کمیٹی کی سفارشات اس کتاب میں صفحہ نمبر ۸۳ پر ملاحظہ کیجیے۔

پہلے وزیر مذہبی امور جناب سید خورشید شاہ صاحب کی سربراہی میں مسئلہ بلوچستان کے سیاسی حل کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی مگر آج تک اس کا اجلاس کوئٹہ میں نہ ہو سکا۔

صوبے کی اسمبلی اور حکومت کا جو حال ہے، وہ ناقابلِ بیان ہے۔ ۶۵ ارکان کے اس ایوان میں ۵۸ وزیر یا مشیر ہیں اور متعدد ایسے ہیں جنھیں چار برس میں بھی کوئی محکمہ نہیں ملا ہے، نہ ہی کوئی ذمہ داری ہے، مگر مراعات وہ پوری حاصل کر رہے ہیں۔ صوبے میں سب سے اہم کمیٹی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی ہوتی ہے جو آج تک قائم نہیں ہوئی ہے اور متعدد قائمہ کمیٹیاں ہیں جن کے قیام کے لیے اتنی مدت گزر جانے کے باوجود کوئی زحمت آج تک نہیں کی گئی۔ وزیر اعلیٰ مہینوں صوبے سے باہر (زیادہ تر اسلام آباد میں) رہتے ہیں۔ صوبائی اسمبلی کے ہر ممبر کو ہر سال ۲۵ کروڑ روپے ترقیاتی فنڈ کے نام پر دیے جاتے ہیں لیکن صوبے کے طول و عرض میں ترقیاتی عمل کا کہیں وجود نہیں۔ ۷۰ فی صد اسکول بند ہیں۔ پورے صوبے میں صرف ایک ہزار ۵ سو ۶۴ ڈاکٹر ہیں اور اس طرح ۴ ہزار ایک سو ۹۸ افراد پر ایک ڈاکٹر بنتا ہے۔ لاقانونیت اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے حالانکہ فرنٹیر کور کے افسروں اور جوانوں کی وہاں تعینات کی گئی تعداد ۵۰ ہزار سے زیادہ ہے۔ گویا ہر ۱۳۰ افراد پر ایف سی کا ایک فرد متعین ہے۔

نئے این ایف سی ایوارڈ کے تحت بلوچستان کا جو حصہ ملک کے محصولات (ٹیکس ریونیو) میں بنتا تھا، پہلی مرتبہ اس میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے لیکن اس کا کوئی اثر عام آدمی کی زندگی پر یا صوبے کی معاشی حالت اور ترقیاتی کام پر نظر نہیں آتا۔ فوج کا دعویٰ ہے کہ وہ بارکوں میں چلی گئی ہے مگر عملاً ایف سی اور خفیہ ایجنسیاں من مانی کر رہی ہیں۔ مرکز اور صوبوں میں ایک ہی پارٹی کی حکومت ہے لیکن صوبے کا وزیر اعلیٰ برملا کہتا ہے کہ ایف سی میرے قابو میں نہیں۔ عملاً فوجی آپریشن جاری ہے۔ صرف ۲۰۱۱ء کے بارے میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق دہشت گردی کے ایک ہزار ۴ سو ۶۷ واقعات ہوئے ہیں جن میں ۳۶ بم حملے، ۶۸ دھماکے اور ۱۳۴ گیس تنصیبات پر حملے شامل ہیں۔ ان حملوں میں ۱۷۱ راکٹ فائر ہوئے اور ۲۱۵ بارودی سرنگوں کے دھماکے ہوئے۔ ۲۹۱ افراد کو اغوا کیا گیا۔ صرف ایک سال میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد

ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں لاپتا افراد کی ۲۷۰ مسخ شدہ لاشیں ملی ہیں۔ ایک طرف بلوچ نوجوانوں کے خون سے ہولی کھیلی جارہی ہے، تو دوسری طرف پنجاب اور دوسرے صوبوں سے آکر بسنے والے لوگوں کے ڈھائی سو سے زیادہ بے گناہ افراد، مردوں، عورتوں، بچوں کو بے دردی سے قتل کیا گیا ہے۔ پھر اس میں مسلک کی بنیاد پر کشت وخون کا بھی ایک حصہ ہے اور تازہ ترین واقعات میں پشتون مزدوروں کو بھی موت کے گھاٹ اُتارا جارہا ہے۔ اس کشت وخون کی ذمہ داری سب پر ہے۔ وہاں تعینات فوج، ایف سی، کوسٹل گارڈز، پولیس، لیوی اور علیحدگی پسند جماعتوں کے مسلح ونگ، سب کے ہاتھوں پر معصوم انسانوں کا خون ہے اور اداروں اور خفیہ ایجنسیوں کی فوج ظفر موج کے باوجود نہ اصل مجرم پکڑے جاتے ہیں اور نہ ان بیرونی ہاتھوں کی نشان دہی ہو پاتی ہے جن کا بڑے طمطراق سے بار بار ذکر کیا جاتا ہے۔

مسئلے کا یہ پہلو بیرونی عناصر کی شر انگیزیوں سے بھی کچھ زیادہ ہی اہم ہے اور جب تک یہ مسئلہ اپنے تمام سیاسی، سماجی اور معاشی پہلوؤں کے ساتھ حل نہیں ہوتا، بیرونی قوتوں کے کردار پر بھی قابو نہیں پایا جاسکتا۔ اصل مسئلہ سیاسی، معاشی اور اخلاقی ہے۔ حقیقی شکایات کا ازالہ ہونا چاہیے۔ فوجی آپریشن کسی بھی نام یا عنوان سے ہو، وہ مسائل کا حل نہیں۔ حل کا ایک ہی راستہ ہے، اور وہ اس مسئلے سے متاثر تمام افراد (اسٹیک ہولڈرز) کو افہام و تفہیم اور حق و انصاف کی بنیاد پر مل جل کر حالات کی اصلاح کے لیے مجتمع اور متحرک کرنا ہے۔ مذاکرات کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ اعتماد کا فقدان بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اس لیے اعتماد کی بحالی ہی پہلا قدم ہو سکتی ہے جس کے لیے فوجی آپریشن کا خاتمہ، عام معافی، تمام گرفتار شدہ اور لاپتا افراد کی بازیابی، نواب اکبر بگٹی کے قاتلوں کے خلاف کارروائی کا آغاز اور بہتر فضا میں تمام سیاسی اور دینی قوتوں کی شرکت سے نئے انتخابات اور ایک بہتر قیادت کا زمامِ کار سنبھالنا ناگزیر ہے۔ بیرونی قوتوں کے کھیل کو بھی اسی وقت ناکام بنایا جاسکتا ہے جب ہم اپنے گھر کی اصلاح کریں اور جو حقیقی شکایات اور محرومیاں ہیں ان کی تلافی کا سامان کریں۔ ستمبر ۲۰۰۴ء میں بننے والی پارلیمانی کمیٹی کی

سفارشات اور ۲۳دسمبر ۲۰۰۹ء کا آغاز حقوق بلوچستان پیکج[1] سیاسی حل اور انتظامِ نو کے لیے اولین نقشۂ کار کی تیاری کے لیے بنیاد بن سکتے ہیں۔ اصل چیز اعتماد کی بحالی، سیاسی عمل کو شروع کرنا اور تمام قوتوں کو اس عمل کا حصہ بنانا ہے۔ عوام ہی کو حقیقی طور پر بااختیار بنانے سے نئی راہیں کھل سکتی ہیں۔ بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔ ایک ایک دن اور ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ یہ ہمارا گھر ہے اور ہم ہی کو اسے بچانا اور تعمیر نو کی ذمہ داری ادا کرنا ہے۔ مسئلہ صرف بلوچستان کا نہیں بلکہ پاکستان کا ہے۔ بلوچستان کا پاکستان سے باہر کوئی مستقبل نہیں ہے اور نہ پاکستان کا بلوچستان کے بغیر وجود ممکن ہے۔ سیاسی اور عسکری دونوں قیادتوں کا امتحان ہے۔ اس لیے کہ ؎

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصہ محشر میں ہے
پیش کر غافل اگر کوئی عمل دفتر میں ہے

(عالمی ترجمان القرآن مارچ ۲۰۱۲ء)

[1] آغاز حقوق بلوچستان پیکج کا مکمل متن اس مضمون کے آخر میں ملاحظہ کیجیے۔

## امریکی ایوان نمائندگان میں بلوچستان کے مسئلے پر پیش کی گئی قرارداد کا متن

امریکی ایوانِ نمائندگان میں ۱۷ فروری ۲۰۱۲ء کو مسٹر روہرابیکر، مسٹر گوہمرٹ، اور مسٹر اسٹیو کنگ نے درج ذیل قرارداد پیش کی، جسے خارجہ امور کی کمیٹی کے حوالے کر دیا گیا۔

**قرارداد:** کانگریس اس احساس کا اظہار کرتی ہے کہ بلوچستان کے عوام، اس وقت پاکستان، ایران اور افغانستان کے درمیان بٹے ہوئے ہیں اور حق خود ارادیت اور اپنے لیے خود مختار ملک کا حق رکھتے ہیں۔

- جیسا کہ بلوچستان کے لوگوں نے قدیم دور سے اپنی فخریہ اور مخصوص قومی، ثقافتی اور مذہبی شناخت کو برقرار رکھا ہے۔
- جیسا کہ ۱۶۶۶ء میں قلات کی بلوچ ریاست کی بنیاد رکھی گئی جو آزاد، خود مختار ملک کے طور پر کام کرتی تھی۔
- جیسا کہ ۱۹ویں صدی میں بلوچ عوام پر غلبہ حاصل کر کے اور انھیں تقسیم کر کے فارس (ایران) اور برطانوی سلطنت کی سامراجی توسیع کی گئی
- جیسا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو خان آف قلات نے آزادی کا اعلان کیا۔ اپریل ۱۹۴۸ء میں پاکستان نے حملہ کر کے بلوچوں کی امنگوں کو کچل دیا اور دو سال کی خونی مہم کے نتیجے میں عوامی مزاحمت کو ختم کیا۔
- جیسا کہ ۱۹۵۸ء، ۱۹۷۳ء اور ۲۰۰۵ء کی بغاوتیں اسلام آباد کی حکمرانی اور بلوچستان کے وسیع قدرتی وسائل کی لوٹ مار کے خلاف مسلسل عوامی عدم اطمینان کی نشاندہی کرتی ہیں۔ جبکہ بلوچستان پاکستان کا غریب ترین صوبہ ہے۔
- جیسا کہ سیستان بلوچستان (ایران) میں بھی عوامی شورش جاری ہے۔ جسے ایران میں آمرانہ حکومت کی طرف سے وحشیانہ جبر و ظلم اور مذہبی تعصب کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔
- جیسا کہ قومی گروہوں کو محکوم بنانے کے لیے جارحیت اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی مخالفت کرنا امریکہ کی پالیسی ہے۔ جو کہ اس وقت ایران اور پاکستان میں بلوچ عوام کی امنگوں کے خلاف نظر آرہا ہے۔

چنانچہ ایوان نمائندگان (سینیٹ) کے اتفاق کے ساتھ کانگریس محسوس کرتی ہے کہ بلوچستان کے

لوگ، جو اس وقت پاکستان، ایران اور افغانستان میں بٹے ہوئے ہیں، حق خود ارادیت اور اپنے لیے خود مختار ملک کا حق رکھتے ہیں اور انھیں اقوام عالم میں اپنی حیثیت کا تعین کرنے کا موقع فراہم کیا جانا چاہیے تاکہ وہ امن اور ہم آہنگی کے ساتھ بغیر کسی بیرونی جبر کے اپنی زندگی گزار سکیں۔

---

## مکمل متن: آغاز حقوق بلوچستان پیکج

وفاقی حکومت نے آغاز حقوق بلوچستان پیکج پیش کیا جس میں سیاسی، انتظامی اور معاشی اقدامات شامل تھے۔ یہ پیکج سینیٹ کے چیئرمین میاں رضا ربانی کی سربراہی میں ایک پارلیمانی کمیٹی نے تیار کیا اس کی تیاری میں تمام جماعتوں کی قیادت اور بلوچستان سے وابستہ تمام قوتیں شامل ہیں۔ اس پیکج میں مندرجہ ذیل اہم اقدامات کا اعلان کیا گیا۔

۱۔ تمام سیاسی کارکنوں کو رہا کر دیا جائے گا اور جو جلاوطن ہیں ان کو واپس لایا جائے گا، وفاقی حکومت بلوچستان حکومت کے مشورے سے سیاسی کارکنوں کو رہا کرے گی سوائے ان لوگوں کے جو گھناؤنے جرائم میں ملوث ہیں۔ سیاسی مذاکرات شروع کیے جائیں گے۔ لاپتہ افراد کے سلسلے میں سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں ایک کمیشن قائم کیا جائے گا جو لوگ لاپتہ ہیں ان کے نام مشتہر کیے جائیں گے اور جن کے خلاف کوئی الزامات نہیں ہیں انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ جن کے خلاف الزامات ہیں سات دن کے اندر متعلقہ عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ لاپتہ افراد کے خاندان کے افراد کو ان کے بارے میں معلومات فراہم کی جائیں گی اور ان کو ملاقات کا حق دیا جائے گا۔ اور عوام کے حقوق بحال کیے جائیں گے، لوگوں کے خلاف کوئی آپریشن نہیں کیا جائے گا۔

۲۔ بلوچستان تیل گیس، سونا، تانبا، گندھک اور دیگر معدنی وسائل سے مالا مال صوبہ ہے لیکن سب سے زیادہ پسماندہ ہے اس لیے بلوچستان کے مالی وسائل پر اس کو مالکانہ حقوق دینے کی ضرورت ہے۔

۳۔ صوبائی خود مختاری کو مستحکم کرنے کے لیے ضروری آئینی ترمیم کی جائے گی جس میں قانون سازی کی مشترکہ فہرست، پولیس آرڈر اور بلوچستان لوکل گورنمنٹ آرڈیننس ۲۰۰۱ء میں ترمیم کی جائے گی اور مشترکہ مفادات کونسل سے متعلق آئین کے آرٹیکل ۱۵۳ پر مؤثر عملدرآمد کیا جائے

گا۔ آغاز حقوق بلوچستان پیکج کے تحت آئین کے آرٹیکل ۱۵۴ سے ۱۵۹ اور ایک ۱۶۰ پر مؤثر عملدرآمد کیا جائے گا۔

۴۔ قومی مالیاتی کمیشن کا ڈھانچہ دوبارہ تشکیل دیا جائے گا اور نئے معیار کے مطابق آبادی کا تناسب، غربت اور وسائل کی ترقی کو بنیاد بنایا جائے گا۔

۵۔ بلوچستان اسمبلی کی ۲۰۰۲ء سے اب تک متفقہ طور پر منظور کی گئی قراردادوں کی روشنی میں آئین کا قانونی ڈھانچہ صوبے میں نافذ کیا جائے گا اس کے مطابق صوبے میں وفاقی ایجنسیوں کے کردار پر نظر ثانی ہوگی، دہشت گردی کے خلاف جنگ کے علاوہ صوبے میں جاری تمام آپریشنز روک دیے جائیں گے، سوئی کے علاقے میں موجود فوج کو ہٹالیا جائے گا اور اس کی جگہ فرنٹیئر کانسٹیبلری کو تعینات کیا جائے گا۔ تمام شہری علاقوں میں عمومی طور پر پولیس ہوگی، قانون کے نفاذ کے لیے فرنٹیئر کانسٹیبلری وزیر اعلیٰ کے ماتحت کام کرے گی۔ کسٹم ایکٹ کے تحت جو اختیارات دیے گئے ہیں وہ واپس لے لیے جائیں گے، کوسٹ گارڈ سرحدوں پر اسلحہ اور منشیات کی سمگلنگ روکنے کی بنیادی ڈیوٹی کرے گی۔ سرحدی علاقوں کے علاوہ دیگر علاقوں میں چیک پوسٹیں صوبائی حکومت کی ہدایت پر قائم ہوں گی۔

۶۔ سرحدی علاقوں کے علاوہ صوبے میں نئے کنٹونمنٹ کی تعمیر نہیں کی جائے گی، سوئی اور کوہلو کے علاقے میں کنٹونمنٹ کی تعمیر روک دی جائے گی۔

۷۔ نواب اکبر بگٹی کے قتل کی وجوہات جاننے کے لیے ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج پر مشتمل کمیشن قائم کیا جائے گا۔ اعلیٰ عدالتی حکم کے ذریعے بلوچ سیاسی کارکنوں کے قتل اور ٹارگٹ کلنگ کی عدالتی تحقیقات کروائی جائیں گی۔ ڈیرہ بگٹی کے بے گھر ہونے والے افراد کے لیے وفاقی حکومت ایک ارب روپے ادا کرے گی۔

۸۔ گوادر کی زمین کی الاٹمنٹ کی اعلیٰ عدالتی تحقیقات کروائی جائے گی، صوبے میں تمام بڑے منصوبے صوبائی حکومت کی رضامندی سے شروع کیے جائیں گے ان منصوبوں کے معاہدوں میں صوبے کے منافع اور مفادات کو یقینی بنایا جائے گا۔ گوادر میں گریڈ ایک سے لیکر ۱۶ تک تمام ملازمتیں مقامی آبادی کو دی جائیں گی اور اسی طرح مقامی ٹھیکیداروں کو ٹھیکے دینے میں ترجیح دی

جائے گی۔ گوادر کی بندر گاہ کی وجہ سے جو ماہی گیر متاثر ہوئے ہیں انھیں معاوضہ دیا جائے گا۔ ماہی گیروں کے لیے پورٹ کی مغربی اور مشرقی جانب دو بر تھیں تعمیر کی جائیں گی۔ گوادر پورٹ سے ہونے والی آمدنی کا ایک حصہ صوبے کی ترقی پر خرچ کیا جائے گا۔ وزیر اعلیٰ گوادر پورٹ کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کا چیئرمین ہو گا اور وہ پورٹ اتھارٹی کا چیئرمین نامزد کرے گا۔

۹۔ صوبے کے زیر زمین وسائل کے سلسلہ میں متعلقہ قبائل کو رائلٹی کی ادائیگی کو مناسب انداز میں طے کیا جائے گا۔ صوبائی حکومت اس ضلع کو جہاں قدرتی وسائل نکلے ہیں ۱۵ فیصد رائلٹی دے گی۔ وفاقی حکومت ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۹۱ء تک گیس ڈویلپمنٹ سرچارج پر ایک سو بیس ارب روپے رائلٹی اگلے بارہ سال میں ادا کرے گی۔ قدرتی وسائل بازیاب ہونے پر وفاقی حکومت منافع کا دس فیصد علاقے کی ترقی پر خرچ کرے گی۔

۱۰۔ سوئی کے علاقے کی خصوصی ترقی کے لیے پیکج دیا جائے گا، پاکستان پٹرولیم، آئل اینڈ گیس اور سوئی سدرن گیس کے اوپن مارکیٹ سے بیس فیصد حقوق بلوچستان حکومت خریدے گی جبکہ وفاقی حکومت سینڈیک منصوبے سے اپنے تیس فیصد حصص میں سے بیس فیصد حصص صوبے کو منتقل کرے گی اور منافع میں صوبائی حکومت کی شراکت کے حوالے سے معاہدوں پر نظر ثانی ہو گی۔

۱۱۔ پورے ملک میں گیس کی یکساں قیمت مقرر کی جائے گی، کوہلو کے علاقے میں تیل اور گیس کی تلاش میں مدد کرنے کے بدلے مقامی قبائل کو خصوصی ترغیبات دی جائیں گی۔

۱۲۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC) کی اندرون و بیرون ملک پی ایچ ڈی کے لیے سکالر شپ میں بلوچستان کا خصوصی کوٹہ مقرر کیا جائے گا۔

۱۳۔ بلوچستان پیکج پر عملدرآمد کی نگرانی کے لیے ایک طریقہ کار متعین کیا جائے گا۔

۱۴۔ سیلاب متاثرین کی جو امدادی رقوم وفاقی حکومت نے ابھی تک نہیں دی ہیں ان کی ادائیگی کی جائے گی۔

۱۵۔ وفاقی حکومت بلوچستان کے کوٹے پر سختی سے عمل کرائے گی اور پانچ ہزار اضافی آسامیاں مہیا کرے گی۔ کوسٹ گارڈ میں مقامی لوگوں کو ملازمت دی جائے گی۔

۱۶۔ صوبے میں بالخصوص کوئٹہ، پشین، قلعہ عبداللہ، قلعہ سیف اللہ اور ژوب میں چھوٹے ڈیم تعمیر کیے جائیں گے۔

۱۷۔ وفاقی، صوبائی حکومتیں اور تمام محکمے ان تجاویز پر عمل درآمد کی رپورٹ پارلیمنٹ کی نیشنل سیکورٹی کمیٹی کو دے گی۔ آغاز حقوق بلوچستان پیکج پر عملدرآمد پر وفاقی اور صوبائی حکومتیں ہر تین ماہ بعد ایک رپورٹ پارلیمنٹ میں پیش کریں گی۔ بین الصوبائی رابطہ کا وزیر ہر سال کے آخر میں اس پیکج کے حوالے سے خرچ کی گئی رقم کی تصدیق کرے گا۔

# بحران کی نوعیت: اصلاح احوال کیسے ہو گی؟

عشروں کی بد انتظامی کے باعث بلوچستان میں موجود بے چینی اور وہاں جاری تحریک کی کارروائیوں کے سبب بلوچستان میں نہ صرف امن و امان کے مسائل گھمبیر ہوئے بلکہ وفاق کے خلاف جذبات میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اس دوران ۲۰۰۴ء میں چوہدری شجاعت حسین ایک مختصر عرصے کے لیے نگران وزیر اعظم بنے۔ انہوں نے بلوچستان کے معاملات کو حل کرنے کے نقطہ نظر سے پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے منتخب اراکین پر مشتمل ایک پارلیمانی کمیٹی ۲۹ ستمبر ۲۰۰۴ء کو تشکیل دی۔ کمیٹی میں سینیٹر پروفیسر خورشید احمد بھی شامل تھے۔ جیسا کہ اس کتاب میں شامل پہلے مضمون کے حاشیہ میں بھی ذکر کیا گیا ہے اس کمیٹی نے اپنے کام کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے دو ذیلی کمیٹیوں کے سپرد کیا۔ ایک کمیٹی سینیٹر وسیم سجاد کی سربراہی میں بنی جس کے سپرد دستوری امور کیے گئے جبکہ دوسری کمیٹی سینیٹر مشاہد حسین کی سربراہی میں بنائی گئی جس کے دائرہ کار میں معاشی و سماجی امور شامل تھے۔

مشاہد حسین سیّد کی سربراہی میں بلوچستان کے معاشی و سماجی اور دیگر مسائل کے حوالے سے ذیلی کمیٹی کی رپورٹ کسی قدر تاخیر کے ساتھ سامنے آگئی۔ لیکن آئینی و قانونی مسائل کے حوالے سے دوسری ذیلی کمیٹی جو سینیٹر وسیم سجاد صاحب کی سربراہی میں تھی اس کی رپورٹ نہ آسکی۔

زیر نظر مضمون میں پروفیسر خورشید احمد کی سینیٹ میں فروری ۲۰۰۵ء اور مارچ ۲۰۰۶ء میں کی گئی چار مختلف تقاریر میں ان رپورٹوں کے حوالہ سے شامل گفتگو میں بہت سے اہم مباحث سامنے آتے ہیں۔

---

جناب چیئرمین! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اس اہم موضوع پر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اس مسئلے کی اہمیت کی خاطر ہی اس

وقت حاضر ہوا تا کہ اپنی گزارشات اس ایوان کے سامنے اور آپ کے ذریعے پوری قوم کے سامنے پیش کر سکوں۔

سب سے پہلے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ بلوچستان کے مسئلے پر جو گفتگو اس ایوان میں ہو رہی ہے اور اس سے پہلے ہوئی ہے وہ بہت اہم ہے۔ ہمارے بلوچستان کے بھائیوں نے درد مندی اور دکھ کے ساتھ اور کہیں کہیں شاید جذبات کی فراوانی کے ساتھ اپنے مسائل کو ایوان میں رکھا ہے۔ میں پوری دیانتداری کے ساتھ ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ الفاظ کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتا لیکن بنیادی معاملات میں مکمل طور پر ان کی تائید کرتا ہوں۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میری نگاہ میں یہ صرف بلوچستان یا صرف بلوچوں کا مسئلہ نہیں ہے یہ ہم سب کا اور پورے پاکستان کا مسئلہ ہے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ حق اور انصاف کا علمبردار ہونے کے ناطے جہاں ظلم ہو اور زیادتی ہو ہمیں مظلوم کی آواز میں آواز ملانا چاہیے اور ظلم واستحصال کے خاتمے کے لیے ان کے شانہ بشانہ جدوجہد کرنی چاہیے۔

پارلیمانی کمیٹی برائے بلوچستان میں مجھے شرکت کا موقع ملا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس کے سارے اجتماعات میں شریک ہوں۔ ہم نے بلوچستان کے مختلف علاقوں کے بشمول گوادر دورے کیے اور ان اجتماعات اور دوروں میں ہم نے بے شمار افراد کو سنا۔ میں آپ سے دیانتداری سے کہتا ہوں کہ مجھے پاکستان کے حالات کا کافی علم ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ عام لوگوں کی مشکلات اور مسائل سے واقف ہوں لیکن بلوچستان جا کر اور وہاں لوگوں کے حالات دیکھ کر اور ان کو سن کر مجھے شدید دکھ بھرا احساس ہوا۔ میں اسے اپنے لیے اپنی تعلیم اور پاکستان کے مسائل کے ادراک کا بڑا اہم تجربہ سمجھتا ہوں۔

میں اپنے بلوچ بھائیوں کے ساتھ ان کے مسائل کے حوالہ سے اس پورے معاملے میں اسی طرح شریک ہوں جس طرح وہ افراد شریک ہیں جو اپنے آپ کو قوم پرست کہتے ہیں۔ اس وقت سینیٹ میں میری موجودگی کا تعلق صوبہ سرحد سے ہے اور پشتو بولنے والا نہ

ہونے کے باوجود میں نے وہاں پر اپنا مسکن بنایا ہے۔ میرا جینا مرنا اس صوبے کے ساتھ ہے لیکن ایک پاکستانی کی حیثیت سے میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت مسائل بلوچستان میں لاوے کی طرح پک رہے ہیں اور درحقیقت آتش فشاں کی سی کیفیت ہے۔ خدا کے لیے اسے محسوس کریں اور علاقائی انداز میں نہ دیکھیں۔ ہر قسم کے تعصب اور تعلق سے مبرا ہو کر پاکستان اور اسلام ان دو حوالوں سے اس پر غور کرنا چاہیے۔

میں آپ کو یہاں پر یاد دلانا چاہتا ہوں کہ قومیت خواہ جدید ہو یا قدیم اس کا ایک اصول یہ رہا ہے کہ میری قوم اور ملک خواہ صحیح ہو یا غلط یعنی گویا کہ سچ ہو یا جھوٹ، حق ہو یا ناحق مجھے، اپنی قوم کا ساتھ دینا ہے۔ عربوں میں بھی یہی مقولہ تھا کہ اپنے بھائی کا ساتھ دو، خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق۔ حضور پاک ﷺ نے اس کی تردید کی۔ اس تناظر میں ایک مرتبہ آپ ﷺ نے جب یہ بات کی کہ اپنے بھائی کا ساتھ دو خواہ وہ درست ہو یا نادرست، تو جو تربیت آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کی تھی اس کی بناء پر ان کی جانب سے سوال ہوا کہ یارسول اللہ ﷺ اگر ہمارا بھائی حق پر ہو تو ہم اس کا ساتھ دیں گے، لیکن اگر وہ ناحق پر ہو تو ہم اس کا ساتھ کس طرح دے سکتے ہیں۔ تو آپ کو معلوم ہے کہ جواباً نبی ﷺ نے کیا فرمایا؟ آپ ﷺ نے کہا کہ اگر وہ ناحق پر ہو تو اس کو ظلم سے روک کر اس کا ساتھ دو۔ اور یہاں پر ساتھ دینے کے معنی یہ ہیں کہ اسے ظلم نہ کرنے دو اور اسے ناحق پر قائم نہ رہنے دو کیونکہ اس طرح وہ اپنی دنیا اور آخرت خراب کر رہا ہے۔ ہمیں دراصل اسی جذبے اور اسی احساس کے ساتھ بلوچستان کے مسئلہ پر غور کرنا چاہیے۔ یہ مسئلہ اس وقت عدل اور انصاف کا مسئلہ ہے۔ بلاشبہ ہم نے اپنے دستور میں بہت توڑ پھوڑ کر لی ہے۔ اس کے باوجود اس دستور کی تین بنیادیں بہت واضح ہیں۔ پہلی چیز اسلام ہے یعنی اللہ کی حاکمیت اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی بالادستی کی بنیاد پر ہم نے اس ملک کو قائم کیا ہے۔ دوسری بنیاد پارلیمانی جمہوریت ہے۔ جمہوریت اور وہ بھی پارلیمانی جمہوریت، تیسری بنیاد وفاقیت ہے۔ یعنی مرکز اور صوبوں کے درمیان نہ صرف ہم آہنگی بلکہ تمام علاقوں کے حقوق کا پورا پورا احساس اور احترام موجود ہو۔ اور یہ کوئی خیرات کا معاملہ نہیں ہے بلکہ یہ حقوق اسی وقت

پورے ہوتے ہیں جب احساس شراکت ہو، صرف کاغذوں پر نہیں بلکہ حقیقی اور مؤثر شراکت ضروری ہے۔

جناب والا! میں آپ کے سامنے اس وقت ان واقعات اور حقائق کو نہیں دہراؤں گا جو میرے ساتھیوں نے یا ایوان کے مختلف ارکان نے پیش کیے ہیں۔ البتہ میں یہ ضرور کہوں گا کہ امان اللہ کنرانی، ثناء اللہ بلوچ، رحمت اللہ کاکڑ اور دوسرے ساتھیوں نے اس طرف سے بہت تفصیل سے حقائق و واقعات دہرا دیے ہیں۔ بلکہ مجھے یہ بات کہنے میں کبھی کوئی باک نہیں کہ مہیم خان بلوچ اور جناب نعیم حسین چٹھہ نے جو باتیں کی ہیں ان سے مکمل اتفاق تو مشکل ہے لیکن بحیثیت مجموعی انہوں نے بھی حقائق ہی پیش کیے ہیں، میں ان کا اعتراف کرتے ہوئے ان میں اضافہ کروں گا۔ لیکن میں چاہوں گا کہ خصوصاً یہ بات پیش کروں کہ ہمیں اس مسئلے کو اب کس طرح لینا چاہیے۔

## مسئلہ کا پسِ منظر

جناب والا! اس سلسلے میں میری پہلی درخواست تو یہ ہے کہ اس مسئلے کو اس کے اصل پس منظر میں، تاریخی بھی اور فوری بھی، لے کے چلنا ضروری ہے۔ اس سے پہلے ہم نے بلوچستان کا مسئلہ اٹھایا تھا اور چوہدری شجاعت صاحب نے جو اس وقت وزیر اعظم تھے پارلیمانی کمیٹی بنائی۔[1] ہم نے اس میں بھرپور شرکت کی اور اسے ہم نے بڑا ہی مفید اقدام قرار دیا۔ میں دیانتداری سے کہتا ہوں کہ سیاسی اعتبار سے یہ ان کا بڑا مثبت اقدام تھا۔ مجھے تین مہینے ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے اور حزب اختلاف کا ایک ذمہ دار رکن ہونے کے باوجود میں یہ کہتا ہوں کہ بحیثیت مجموعی چوہدری شجاعت حسین اور مشاہد حسین سیّد دونوں نے ہمارے ساتھ مل کر مخلصانہ کوشش کی کہ مسئلے کا حل نکالا جائے۔ اس کے ساتھ مجھے یہ بھی کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ان حضرات کی کوششوں کو بار آور نہیں ہونے دیا گیا۔ کمیٹی نے جو محنت کی اور میں

---

[1] کمیٹی کی رپورٹ (تلخیص) آئندہ صفحات میں شامل کی جا رہی ہے۔

ذمہ داری سے یہ بات کہتا ہوں کہ جس کمیٹی میں، میں تھا اس کمیٹی نے دن رات کام کر کے تمام معاملات میں متفق علیہ تجاویز مرتب کی تھیں صرف دو مسائل تھے جن میں تھوڑا سا اختلاف الفاظ کے بارے میں ہمارے درمیان تھا۔ لیکن آپ نے دیکھا ان متفق علیہ تجاویز کا کیا ہوا؟ ہم آہنگی کی اس فضاء کو پارہ پارہ کر دیا گیا۔ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ کون ہے جو انتشار پھیلانے کا یہ کھیل کھیل رہا ہے۔

یہاں مشرقی پاکستان کا بار بار ذکر کیا گیا ہے جو اس اعتبار سے درست ہے کہ مشرقی پاکستان کے جدا ہونے میں حقیقی اندرونی اسباب تھے۔ ایک جانب سیاسی قیادتوں کی ناکامی تھی اور دوسری جانب فوج کا غلط کردار تھا۔ یوں بڑی ذمہ داری ہم پر آتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح ہم نے اپنے دشمنوں کو موقع دیا اور انہوں نے صورت حال کو استعمال کیا۔ چنانچہ بھارت نے فوج کشی کی بالآخر ہمیں دولخت کیا۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ بلوچستان میں خدا کے لیے وہ حالات پیدا نہ ہونے دیجیے۔ جتنا مجھے وہاں کے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کا موقع ملا ہے اس کی بنیاد پر میں یقین سے کہتا ہوں کہ بلوچستان کے تمام ساتھی اختلاف کے باوجود پاکستان کو مضبوط دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہی ہم سب کے مفاد میں ہے۔ لیکن اگر آپ نے حالات ایسے پیدا کر دیے جس کے نتیجہ کے طور پر کچھ افراد دشمن کے آلہ کار بن جائیں یا بیرونی قوتیں کوئی کھیل وہاں کھیلیں تو آپ اپنی ذمہ داری سے دامن نہیں چھڑا سکتے۔

دوسری جانب اس معاملے میں بھارت اور امریکہ، دونوں کے کردار کے بارے میں بھی ہمارے شدید تحفظات ہیں۔ جتنا میں مطالعہ کر رہا ہوں اس میں صاف نظر آ رہا ہے کہ بین الاقوامی ہاتھ سرگرم ہے اور مسلسل سازشیں تیار کی جا رہی ہیں۔ معراج خالد صاحب نے جب وہ نگراں وزیر اعظم تھے امریکہ کے ایک تھنک ٹینک National Intelligence Council کی ایک رپورٹ کا ذکر کیا تھا جس میں پاکستان کے پارہ پارہ کیے جانے کا پورا منصوبہ پیش کیا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں یہ بتایا گیا تھا کہ ۲۰۱۵ء تک ہم نے یہ کام کر دینا ہے۔ اسی طرح اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ اس لیے میں کہنا چاہتا ہوں کہ یہ مسائل اپنی جگہ پر ہیں لیکن میری نگاہ میں جہاں گوادر پورٹ

بلوچستان اور پورے ملک اور اس ریجن کے لیے ایک بڑا اہم دور رس اقدام ہے اور اس کے بڑے اثرات ہوں گے وہاں مجھے یہ بھی یقین ہے کہ بھارت اور امریکہ دونوں اس پر ناخوش ہیں، خصوصیت سے اس بات پر بھی کہ اس حوالہ سے چین سے ہمارا تعاون چل رہا ہے۔ تو یہ پورا معاملہ بہت نازک ہے۔ اگر آپ نے اس نازک معاملہ کو ٹھیک طریقے سے نہ نمٹایا تو یہ بین الاقوامی قوتوں کو ہمیں نقصان پہنچانے کا موقع فراہم کرے گا۔ ہم اپنی ذمہ داری سے سبک دوش نہیں ہو سکتے۔ اس لیے میں کہنا چاہتا ہوں کہ بجائے اس کے کہ آپ لوگوں کو محب وطن ہونے یا نہ ہونے کے سر ٹیفکیٹ دیں، اس مسئلہ پر سنجیدگی سے کام کریں۔ ہم سب پاکستانی ہیں اور ہم سب اس کی خیر چاہتے ہیں۔ چنانچہ جو حقیقی مسائل ہیں ان کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

**اشتعال کا ایک فوری سبب:** جناب والا! دوسری بات ڈاکٹر شازیہ سے متعلق ہے[1]۔ ہماری بیٹی، پوری قوم کی بیٹی ڈاکٹر شازیہ خالد کے ساتھ ہونے والا سانحہ ایک فرد کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ یہ پوری قوم کے ساتھ ہوا ہے۔ اس کا بروقت نوٹس نہ لینا، صحیح طرز عمل نہیں ہے۔ یہ ۲ اور ۳ جنوری (۲۰۰۵ء) کی درمیانی رات کا واقعہ ہے لیکن اس پر ردعمل وہاں ۷ یا ۸ تاریخ کو شروع ہوا ہے۔ مجھے آپ اجازت دیں کہ میں یہ بات کہوں کہ اس معاملہ میں جلتی پر تیل کا کام، جنرل پرویز مشرف صاحب کا وہ انٹرویو ہے جو انہوں نے جیو ٹی وی کو دیا۔ ۱۱ تاریخ کو یہ انٹرویو نشر ہوا ہے اور غالباً ۸ یا ۹ کو ریکارڈ ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ابھی ۷/۸ تاریخ تک اس واقع پر کوئی بڑا ردّ عمل شروع بھی نہیں ہوا اور اگر ہوا تھا تو اس کا ابھی محض آغاز تھا۔ لیکن جنرل صاحب کا ٹی وی پر آکر دھمکیاں دینا، یہ کہنا کہ ہم یہ اور یہ کر دیں گے اور اس اس طریقے سے ان کو ماریں گے اور یہ کہ یہ ۱۹۷۰ء نہیں ہے، انھیں کسی طرح زیب نہیں دیتا تھا۔ میری نگاہ میں اس انٹرویو نے ایک قسم کے اعلان جنگ کی حیثیت اختیار کر لی اور بعد میں معاملات کو بگاڑنے میں اس کا بہت ہاتھ ہے۔ اس لیے میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ جہاں ہماری اس بیٹی کا معاملہ ہے اور اس کی تفصیلات آپ کے سامنے آگئی ہیں، اس سے انصاف

---

[1] اس واقعہ کی تفصیلات اس کتاب کے پہلے مضمون کے ذیل میں صفحہ نمبر ۵ پر موجود ہیں۔

کے بارے میں حکومت کی مجرمانہ تاخیر اور اب تک مؤثر کارروائی نہ کرنا، ایک ایسی چیز ہے جو کسی بھی صورت میں ناقابل معافی ہے۔ اس پر کسی تاخیر کے بغیر انصاف، قانون اور حق کے مطابق اقدام ہونا چاہیے۔ اور یہ شفاف ہونا چاہیے تاکہ اس کے ذمہ داران کو قرار واقعی سزا ملے۔ محض زبانی جمع خرچ اس میں کافی نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ صورت حال کا بگاڑ صرف اس ایک واقعہ تک محدود نہیں ہے اس معاملہ میں فوری اقدام تو ہونا ہی چاہیے، لیکن جو حقیقی اور مستقل مسائل ہیں، ان کو بھی آپ کو لینا پڑے گا۔

**محرومیاں-اشتعال کا مستقل سبب:** یہ مستقل مسائل اس علاقے کی محرومیاں ہیں، وہاں ہونے والا ظلم اور معاشی ناہمواریاں ہیں اور سب سے بڑھ کر سیاسی محرومی اور شراکت کا فقدان ہے۔ میں یہ بات کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ اس کی ذمہ داری صرف موجودہ حکومت پر نہیں ہے، ماضی کی حکومتیں بھی اس کی ذمہ دار ہیں۔ تاہم موجودہ حکومت پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ جنرل پرویز مشرف صاحب تو آئے ہی اس دعوے کے ساتھ تھے کہ ہم صوبائی اختلافات اور کھچاؤ کو دور کریں گے اور ہم آہنگی پیدا کریں گے۔ آپ ان کی ۱۷ اکتوبر ۱۹۹۹ء کی تقریر پڑھ لیجیے، اس میں ایک بڑا نکتہ یہی تھا۔ لیکن اب کیا شکل ہے۔ جناب والا! حقیقت یہ ہے کہ صوبائی سطح پر جتنا انتشار، بے اطمینانی اور دوری اس پانچ سالہ دور میں پیدا ہوئی، وہ پچھلے تمام ادوار سے آگے بڑھ گئی ہے۔ این ایف سی ایوارڈ کے حوالے سے ہمیں جس طرح تنگ کیا جارہا ہے اس کا کوئی جواز موجود نہیں ہے۔ میں خود صوبہ سرحد کی طرف سے بجلی کے خالص منافع کی تقسیم کے معاملہ میں ثالثی کے عمل میں شریک ہوں، جناب چیئرمین! ثالثی کی تجویز منظور ہوئے آج تقریباً سوا سال ہونے کو آگیا ہے۔ ہماری طرف سے ثالثوں کے نام جاچکے ہیں اور حکومت خاموش بیٹھی ہے۔ نیا سال شروع ہو کر ایک ماہ سے زائد گزر چکا ہے۔ اب جون میں نیا بجٹ آنا ہے لیکن ابھی تک ایوارڈ کے بارے میں کوئی چیز سامنے نہیں آئی ہے۔

**بگاڑ کی ذمہ دار-مقتدرہ کی تکون:** میں نے واضح طور پر کہا ہے کہ موجودہ حکومت ذمہ دار ہے

اور اس کے ساتھ ساتھ اس سے پہلے کی حکومتوں کا بھی اس میں دخل ہے۔ ہم سب ذمہ دار ہیں اور خاص طور پر تمام حکمراں جماعتیں۔ تاہم میں یہ بھی کہوں گا کہ اس کے ساتھ ساتھ حالات کے بگاڑ میں تین قوتیں ایسی ہیں جن کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ ایک اس ملک میں قائم مفاد پرست جاگیر دارانہ اشرافیہ کا کنٹرول ہے، درحقیقت اس طبقہ کے کنٹرول نے مسائل در مسائل پیدا کیے ہیں۔ جب تک آپ اس کنٹرول کو غیر مؤثر نہیں کریں گے عوام اور مڈل کلاس اپنے حقوق حاصل نہیں کر سکیں گے۔

دوسرا بیوروکریسی کا کردار ہے جو خالص نو آبادیاتی حیثیت کے ساتھ آج تک حکومت چلا رہی ہے اور تیسرا فوج کی قیادت، جس نے اپنے آپ کو ملک کا اصل حکمران سمجھ لیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ فوج کے بارے میں ایک بڑا مشہور جملہ ہے کہ 'فوج ملک کے لیے' یا 'ملک فوج کے لیے'۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں 'ملک فوج کے لیے' کی شکل پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ یہ سب اس کے ذمہ دار ہیں۔ خاص طور پر میری نگاہ میں اس وقت کی جو حکومت ہے وہ اپنی ذمہ داری سے کسی حیثیت سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو رہی ہے۔

## کیا کیا جائے؟

کیا کیا جائے اور کیسے کیا جائے؟ اس بارے میں اپنے مطالعہ کی روشنی میں آپ کے سامنے تین بنیادی نکات کی صورت میں بات رکھنا چاہتا ہوں:

**ا۔ الزام تراشی سے پرہیز اور وسعت قلبی:** سب سے پہلی بات یہ ہے کہ، ہمیں ماحول کو سازگار بنانے کے لیے الزام تراشی اور ردعمل کے طرز کو شعوری طور پر ترک کرنا ہوگا۔ مجھے حزب اقتدار کی طرف سے ان کے چند افراد کی تقاریر سے یہ امید بندھتی ہے کہ ابھی بھی یہ ممکن ہے۔ یہ سب سے پہلی چیز ہے۔ ملکی اور اجتماعی رویہ تبدیل ہو۔ یہ جو پنجاب اور بلوچستان، پنجاب اور سرحد، پنجاب اور سندھ کی بنیاد پر گفتگو کا انداز ہے۔ ہمیں اس بارے میں سوچنا پڑے گا اور اس معاملے میں پنجاب کی قیادت کو زیادہ بالغ نظری اور وسعت قلب

کا مظاہرہ کرنا ہو گا۔ جب تک کہ ہم بڑھ کر اپنے مظلوم بھائیوں کے درد کو اپنا درد نہ کہیں، اسے اپنا درد نہ سمجھیں اور اپنی تکلیف کو دور کرنے کے جذبے سے آگے نہ بڑھیں قومی یکجہتی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس لیے بجائے اس کے کہ ایک دوسرے پر الزام تراشی کی جائے۔ رد عمل میں کہا جائے کہ تم نے یہ کیا اور ہم نے بھی یہ کیا یا ہم جواباً یہ کریں گے، یہ طرز عمل صحیح نہیں ہے۔ اس کے برعکس ہمیں زور دینا چاہیے کہ انصاف وہ چیز ہے جو ہر ایک کا حق ہے اور یہ ہر ایک کو ملنا چاہیے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پنجاب یا اسی طرح دوسرے علاقوں میں غربت نہیں ہے۔ بلاشبہ دوسرے علاقوں میں بھی غربت ہے لیکن ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ بحیثیت مجموعی ملک کے حالات کیا ہیں اور جو زیادہ غریب ہے، زیادہ تکلیف میں ہے، جس کی جان کو زیادہ خطرہ ہے، اس کی طرف توجہ دینا اوّلیت ہے۔

**۲۔ سیاسی مسائل کا سیاسی حل:** دوسری بات یہ ہے اور یہ میں بہت صاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کا کوئی حل قوت کے استعمال اور فوجی کارروائی میں نہیں ہے۔ فوج کا عمل دخل ہمارے سول اور سیاسی معاملات کے اندر جتنا بڑھ گیا ہے وہ پورے ملک اور ملک کے مستقبل کے لیے خطرہ ہے۔ جمہوریت کے سر پر تلوار لٹک رہی ہے، دستور اس کے نتیجے کے طور پر پامال ہو رہا ہے، لیکن اس سے آگے بڑھ کر یہ سوچنا کہ ہم قوت کے ذریعے اس معاملے کو ختم کر دیں گے یہ کسی طرح بھی درست سوچ نہیں ہے۔ یہ مسائل کو بڑھائے گا کم نہیں کر سکتا۔ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ تشدد کا استعمال خواہ وہ حکومت کی طرف سے ہو، یا عوام کے کسی طبقہ کی طرف سے ہو غلط ہے۔ اس معاملے میں میرے پاس مناسب الفاظ نہیں ہیں لیکن میں پھر بھی کہنا چاہتا ہوں کہ سب سے زیادہ ذمہ داری حکومت کی ہے۔

بلوچستان کے حالات کے بارے میں جو بھی معروضی جائزہ لے گا۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ بلوچستان کے لوگوں نے ۵۲ سال میں گیس پائپ لائن کی حفاظت کی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے اس کو استعمال کیا ہو، لیکن اگر آپ وہاں ایک ایسی کیفیت پیدا کر دیں گے کہ جس سے لوگ غلط ہاتھوں میں جانے کے لیے مجبور ہوں، تو پھر حفاظت کی بجائے

خطرات کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ حقائق ہیں اور زندگی کے مسائل ہیں۔ اس تناظر میں، میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت کی صورت حال میں سب سے اہم چیز ریاستی کارروائیاں اور حکومت کی طرف سے فوج کا غلط استعمال ہے۔ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ عام حالات کے اندر خواہ گیس پائپ لائن ہو، خواہ مواصلات اور بجلی کی لائنیں ہوں ان سب کی حفاظت ان اداروں کی ذمہ داری ہے جو امن و امان کے ذمہ دار ہیں۔ وہ ادارے مقامی آبادی اور پولیس پر مشتمل ہیں۔ فوج کی یہ ذمہ داری نہیں ہے۔ ٹھیک ہے اگر کوئی بحرانی حالت ہو تو دستور کے تحت وقتی اور عارضی طور پر فوج کی تائید حاصل کی جاسکتی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر یہ کام فوج کا نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ فوج کی چوکیاں ہم نے قائم کرنی ہیں اس لیے یہ ان کی سیکورٹی کے لیے ضروری ہے یہ فوج کا قطعاً غلط استعمال ہے۔ اگر وہاں پر کوئی کمی ہے تو آپ پولیس کو مستحکم کریں اور وہاں دوسرے سول ذرائع استعمال کیجیے۔ سیکورٹی توپ کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتی اصل سیکورٹی آپ کو لوگوں کے اطمینان اور ان کے تعاون سے حاصل ہو گی۔ اس طرح کہ وہ خود اپنے گھر کی حفاظت کریں اور انہوں نے کی ہے۔ اس لیے میں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ مسئلے کا حل سیاسی ذرائع سے ہونا چاہیے اور اس کے لیے مذاکرات واحد راستہ ہے۔ فوج کی طرف سے دھمکیاں دینا اور قوت کا استعمال معاملات کو بگاڑنے کی طرف لے جانے والی چیز ہے، اصلاح کی طرف لے جانے والی چیز نہیں۔

**۳۔ سیاسی و معاشی مسائل کا حل:** جناب والا! تیسری بات بنیادی سیاسی اور معاشی مسائل کے حل سے متعلق ہے۔ ہم انہیں مسلسل مؤخر کر رہے ہیں۔ مجھے دکھ ہوتا ہے کہ ہماری کمیٹی اب پانچویں مہینے میں داخل ہو رہی ہے اور اس کی رپورٹ بھی نہیں آسکی۔ سلگتے ہوئے سیاسی اور معاشی مسائل کے بارے میں وقت کا اتنا ضیاع یہ میری نگاہ میں درست نہیں ہے۔ جہاں تک میں نے تجزیہ کیا ہے اس کی روشنی میں متعین طور پر آٹھ مسائل آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

**ملازمتوں کے مسائل:** میری نگاہ میں سب سے پہلی ضرورت وہاں ملازمتوں کی ہے۔ اس لیے کہ یہ ان کا حق ہے اور اس کی وجہ سے مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ ملازمتوں میں، خاص طور پر

مرکز اور صوبے میں، وہاں کے لوگوں کی صحیح نمائندگی ہونی چاہیے۔ میں کہتا ہوں کہ ہمیں ایک ماسٹر پلان بنانا چاہیے تاکہ جو کمی پچھلے ستاون سالوں میں رہ گئی ہے اگلے دو سال کے اندر ہم اس کو دور کریں اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ایک خصوصی پلان کے ذریعے سے اس کا اہتمام کیا جائے۔ مقامی ضروریات اور مواقع پر توجہ ہو خاص طور سے فنی تعلیم کے ایسے ادارے قائم ہوں جن کے ذریعے سے آپ لوگوں کو تیار کر سکیں۔ دو سے تین سال کی اسکیم بنائیے تاکہ یہ جو برسوں کا جمع شدہ انبار ہے وہ سارے کا سارا دور ہو سکے۔

**دستور کے مطابق معاشی وسائل کی تقسیم:** جناب والا! دوسری بات میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ معاشی وسائل کے بارے میں جو بات دستور میں طے کی گئی ہے ہم اس پر عمل نہیں کر رہے ہیں۔ میں آپ کو یہ پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں کہ دستور کے خصوصیت سے آرٹیکل ۱۵۱ سے لے کر این ایف سی کے آرٹیکل ۱۶۰ تک، ان پر ۵ فیصد بھی عمل نہیں ہو رہا۔ دستور نے یہ اصول طے کیا ہے کہ جو وسائل جس علاقے کے ہیں وہاں کے لوگوں کا اس کے اوپر پہلا حق ہے اور جو اس سے آمدنی ہو گی اس آمدنی پر بھی ان ہی کا حق ہے اور یہ آمدنی پوری پوری اور صحیح طور پر ان کو ملنی چاہیے۔

اسی طریقے سے رائلٹی کی تقسیم کا معاملہ ہے۔ ان تمام چیزوں کے بارے میں دستور نے نقشہ دیا، مشترکہ مفادات کونسل بنانے کے لیے کہا ہے۔ لیکن مشترکہ مفادات کونسل آج تک قائم نہیں کی گئی۔ ۱۹۷۳ء میں دستور کی تشکیل کے بعد سے اب تک جو ادارہ سب سے زیادہ غیر مؤثر رہا ہے وہ مشترکہ مفادات کونسل ہے۔ دوسرا ادارہ قومی اقتصادی کونسل تھا وہ بھی عملاً مفقود ہے۔ نیشنل فنانس کمیشن لنگڑا لنگڑا کر چل رہا ہے۔ یہ تین بنیادی ادارے تھے جو معاشی وسائل کو انصاف اور توازن کے ساتھ تقسیم کرتے۔ وسائل پر حق علاقے اور ملک دونوں کا ہے۔ ان کے درمیان ایک توازن مفاہمت کے ساتھ قائم ہونا چاہیے۔ آپ خیال فرمائیے کہ ۱۹۵۲ء میں یہ گیس دریافت ہوئی ہے، ۸۵ میں پہلی مرتبہ کوئٹہ کو پہنچائی جا سکی ہے۔ پورے ملک کو اس سے فائدہ ہوا ہے لیکن وہ علاقہ آج بھی غیر ترقی یافتہ ہے، کیوں؟ اس لیے کہ آپ نے اس علاقے کے حقوق کو پورا نہیں کیا۔ یہ کہنا کہ ہم نے فلاں اور، فلاں افراد کو

پیسے دے دیے تھے، یہ غلط ہے۔ اگر آپ نے پیسے غلط دیئے ہیں تو آپ ذمہ دار ہیں، اگر آپ نے صحیح دیئے ہیں تو پھر یہ جتانے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ باقی تمام وسائل اور آمدنی، جو اس ذخیرے سے حاصل ہو رہے ہیں، اس کا کتنا حصہ کون سے لوگوں کو دیا گیا ہے۔ ان کی تعلیم، ان کے ہاں صحت، ان کے لیے مواقع پیدا کرنا، اس قانون کے مطابق بنانا اور وہاں معاشی ترقی کی راہیں تلاش کرنا، یہ ساری چیزیں آخر کیوں نظر انداز کی گئی تھیں؟ یہ دستور کا تقاضا تھا اور یہی حق وانصاف کا تقاضا تھا۔

جناب والا! مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ ہمیں پالیسی اور دستور دونوں اعتبار سے نظر ثانی کرنا پڑے گی کہ ہر علاقے کو اپنے معاشی وسائل کے بارے میں فیصلے کا اختیار ملنا چاہیے اور یقینی بنانا چاہیے کہ جو ان کا حق ہے، انہیں ملے اور دوسری جانب جو کچھ ملک کی ضرورت ہے کہ ہم سب، بلاشبہ ایک اکائی ہیں، وہ پوری ہونی چاہییں۔ لیکن یہ کام ان کے مشورے سے مل جل کر، مشاورت اور افہام و تفہیم سے ہو گا۔

**گوادر پورٹ کا مسئلہ:** جناب! تیسرا مسئلہ گوادر پورٹ کا ہے۔ میں نے اس پر بہت غور کیا ہے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ گوادر پورٹ ہمارے ملک کی ایک ضرورت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بیک وقت بلوچستان اور پاکستان کی ہی نہیں، وسطی ایشیا کی بھی ضرورت ہے اور اگلے پچاس سال کا جو معاشی ویژن ہے، اس میں اس کا ایک بڑا اہم کردار ہے۔ میں آپ سے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ اس کے اوپر بھارت اور امریکہ ناخوش ہیں اور ایران کے بھی تحفظات ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لیے یہ بہت ضروری ہے۔

اس کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ گوادر پورٹ کو سو فیصد مرکز کے ہاتھوں میں رکھنا اور مقامی لوگوں کو فیصلہ سازی کے تمام اداروں، جو ان کو فوائد پہنچانے والے ہیں سے محروم رکھنا، یہ نہ صرف ظلم ہے بلکہ گوادر پورٹ کے منصوبے کو مایوسی میں تبدیل کرنے کا نسخہ ہے۔ ہم جب وہاں گئے اور ہم نے لوگوں کو سنا تو جناب والا! میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ مچھیرے جن کا روزگار صدیوں سے اس علاقے سے وابستہ ہے، آج وہ رو

رہے ہیں۔ آپ نے ان کے لیے کوئی متبادل انتظام نہیں کیا۔ ان کے لیے اسی علاقے میں جو قریب ترین مناسب جگہ ہو سکتی ہے وہ دو چار ایکٹر نہیں، ۱۲۷۰۰ ایکٹر رقبہ ہے جس پر بحریہ کی عملداری ہے اور اس کے بعد ان کا یہ مطالبہ ہے کہ ہمیں مزید ۱۴ ہزار ایکٹر کی ضرورت ہے۔ ہم دنیا بھر سے لوگوں کو وہاں پر لا رہے ہیں اور مقامی لوگوں کی ترقی کے لیے کوئی انتظام نہیں کرتے۔ آپ نے جو نظام بنایا ہے، اس میں ان کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آئینی طور پر بندرگاہیں وفاقی ذمہ داری ہے لیکن اس کے ساتھ صوبے کا کردار انتظام میں، کنٹرول میں، منصوبہ سازی میں، عملداری میں لازمی ہونا چاہیے۔ اگر آپ نے یہ نہیں کیا تو گوادار کے منصوبے کو مکمل نہیں کر سکیں گے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ گوادر کا مسئلہ اہم ہے اور اس کو ضرور حل کرنا چاہیے۔

بڑے منصوبوں کے بارے میں میری یہ رائے بھی ہے کہ بڑے منصوبے بہت دیر سے شروع ہوئے ہیں۔ جب بھی شروع ہو جائیں اصولی طور پر غلط نہیں ہے لیکن یہ بڑے منصوبے اسی وقت مفید اور کامیاب ہوں گے جب وہاں کے لوگ اس میں شامل ہوں اور وہاں کے لوگ ان کے فوائد اور ثمرات سے فیضیاب ہو سکیں۔ اگر وہ محروم رہتے ہیں اور باقی جگہوں پر اس کا فائدہ پہنچتا ہے تو آپ ۲۱ نہیں، ۲۰۰۰ ارب بھی خرچ کر دیں تو اس کا فائدہ نہیں ہو گا۔ اس لیے پورے معاملے کو دوبارہ دیکھنے اور ایک نئی اپروچ کی ضرورت ہے کہ وہاں کے لوگوں کی شمولیت سے آپ ان منصوبوں کو مفید شکل دے سکیں۔

**امن و امان کے مسائل:** جناب والا! چوتھا مسئلہ امن و امان کے اعتبار سے ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ بڑا اہم ہے۔ ہمیں حکام نے جو کچھ بتایا ہے، اس میں بھی یہ بات سامنے آئی کہ ۵ سے ۶ فیصد علاقہ جہاں پولیس کا کنٹرول ہے، وہاں جرائم کی شرح زیادہ ہے اور لیویز جو ایک مقامی پولیس ہے، اس کے زیر کنٹرول ۹۵ فیصد علاقہ ہے۔ لیویز کے زیر کنٹرول علاقے میں امن و امان کی صورت حال بدرجہا بہتر ہے۔ وہاں کے لوگ پریشان ہیں کہ آپ نے اگر عوام کی زبردستی توہین کی جس پر عمل شروع ہو گیا ہے تو پورے صوبے میں بے اطمینانی اور جرائم میں

اضافہ ہو گا۔ یہ حساس معاملہ ہے اور میری نگاہ میں قانون کی بالادستی کو قائم کرنے کا جو ان کا روایتی طریقہ ہے ہمیں اس کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس کو بہتر اور مستحکم کرنا چاہیے۔ اسے منتشر کرنا اور اس کو پولیس کے نظام سے ملیامیٹ کرنا میری نگاہ میں ایک بہت بڑی غلطی ہو گی۔

جناب والا! اسی طرح ایف سی اور کوسٹ گارڈ کا مسئلہ بھی بڑا اہم مسئلہ ہے۔ ہم نے جتنا بھی اس کا مطالعہ کیا ہے ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اپنی موجودہ صورت کے اعتبار سے یہ فورسز ایک حلیف فورس نہیں بلکہ حاکم اور قابض قوت کا کردار ادا کر رہی ہیں جنھیں کرپشن کی عادت بھی ہو گئی ہے۔

**ترقیاتی گرانٹس اور علاقائی مساوات:** ایک اور حساس معاملہ جس کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ترقیاتی گرانٹس میں بھی بلوچستان کے سارے اضلاع کو انصاف اور برابری کے ساتھ مدنظر نہیں رکھا گیا۔ یہ بھی ایک پہلو ہے جو آج بھی ہمارے سامنے آیا ہے، کل اور زیادہ گھمبیر ہو سکتا ہے۔ اس لیے میں چاہوں گا کہ علاقائی مساوات کے مسئلے کو بھی سامنے رکھا جائے۔

**مالیاتی مسائل:** جناب چیئرمین! چھٹا مسئلہ این ایف سی ایوارڈ کا ہے۔ اس معاملے میں جو تساہل اور تغافل اب تک رہا ہے وہ بہت تکلیف دہ ہے۔ یہ مسئلہ بلوچستان کا بھی ہے اور سرحد کا بھی ہے۔ آیئے مل کر بیٹھیں اور اس کا حل نکالیں۔ اگر اس کو آپ نے حل نہ کیا تو وہ وسائل جو ان صوبوں کو چاہییں وہ انہیں نہیں ملیں گے۔ جناب والا! میں صاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ فیڈریشن محض سیاسی اختیارات کے نچلی سطح پر منتقلی کا نام نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مالیاتی اختیار کی منتقلی بھی ضروری ہے۔ اگر مالیاتی اختیار اور مالیاتی کنٹرول سارے کا سارا مرکز کے پاس رہتا ہے تو پھر سیاسی اختیار کی منتقلی محض ایک مکاری اور دکھاوے کی چیز ہو گی۔ کہا جاتا ہے کہ وسائل کم ہیں۔ میں اسے ماننے سے انکار کرتا ہوں۔ جناب والا! میں سمجھتا ہوں کہ ہم اپنے وسائل کو غلط استعمال اور ضائع کر رہے ہیں اور دوسری جانب آج بھی کرپشن کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھی ہے۔ اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اور شفافیت کے ساتھ قومی مالیاتی ایوارڈ اور وسائل کی تقسیم کو یقینی بنانا چاہیے۔

**خشک سالی کے مسائل:** جناب والا! ساتواں نکتہ خاص طور پر کوئٹہ شہر لیکن عمومی طور پر پورے خطے میں خشک سالی کی بناء پر پانی کی فراہمی کے مسائل ہیں۔ مجھے یہ دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ آٹھ سال سے زیادہ عرصہ گزر گیا ہے جس میں خاص طور پر اس حکومت کا پانچ سالہ دور بھی شامل ہے لیکن اس میں انہوں نے کوئی ایسی کوشش نہیں کی کہ اس مسئلہ کے حل کے لیے کوئی اہم پروجیکٹ شروع کیا جائے۔ اس پر فوری توجہ کی ضرورت ہے۔

**فوجی چھاؤنیوں کا مسئلہ:** اگلا مسئلہ جس پر میری نگاہ میں توجہ بہت ضروری ہے وہ ہے فوجی چھاؤنیوں کا مسئلہ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے پر بھی ہمیں قومی نقطہ نظر سے غور کرنا چاہیے۔ فوج اس ملک کی ضرورت ہے اور ایک اہم ترین ادارہ ہے۔ لیکن فوج صرف دفاع کے لیے ہوتی ہے، حکمرانی کے لیے نہیں ہے۔ اگر آپ فوج کو حکمرانی کے لیے استعمال کریں گے اور پھر چھاؤنیاں بنائیں گے تو اس سے لازمی طور پر سیاسی رد عمل ہو گا کسی طرح اچھا نہ ہو گا۔

میں ان لوگوں میں سے ہوں جو سوچتے ہیں کہ ملک کے جس حصہ میں بھی ملک کے دفاع اور تحفظ کے لیے چھاؤنی کے قیام کی ضرورت ہو اس پر میرٹ پر ضرور غور ہونا چاہیے اور میرٹ پر اس کا فیصلہ ہونا چاہیے۔ جہاں تک میں نے اس وقت مطالعہ کیا ہے۔ میری نگاہ میں گوادر بندر گاہ کے اعتبار سے ایک ایسا حقیقی مسئلہ ہے کہ جہاں مناسب حدود کے اندر اس کی ضرورت ہو گی۔ لیکن باقی مقامات کے اوپر بظاہر کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ جو بہانے بنائے جا رہے ہیں کہ قومی اثاثوں کے دفاع کے لیے یا ترقیاتی کاموں کے لیے اس کی ضرورت ہے۔ جناب والا! میں نے جتنا مطالعہ کیا ہے سامراجی یا نو آبادیاتی کے علاوہ فوج کا اور چھاؤنیوں کا کہیں بھی یہ کردار نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ چھاونی کے قیام کے بعد کچھ ترقیاتی کام تیز رفتاری سے ہوتے ہیں لیکن ترقی ایک الگ چیز ہے۔ اس کا تعلق فوجی چھاؤنیوں کے قیام سے نہیں ہے۔ اسی طرح میں کہتا ہوں کہ قومی اثاثوں کی سلامتی اور ان کی حفاظت بھی امن و امان کے اداروں کا کام ہے فوج کا کام نہیں ہے۔ اس لیے فوج کو مختلف بہانوں سے استعمال نہ کیا جائے۔ جہاں حقیقی تحفظ ہو وہاں باہم مشورے سے اور صوبائی اسمبلیوں کے مشورے سے آپ غور کر سکتے ہیں۔ اس وقت

فوجی چھاؤنیوں کا مسئلہ ایک سیاسی تنازعہ بن گیا ہے۔ اس لیے اسے فوری طور پر حل کرنا، اچھی فضا کو قائم ہونے دینا اور پھر میرٹ پر معاملات کو طے کرنا ضروری ہے۔

## دستوری مسائل

جناب والا! میں آخری بات یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ مذکورہ تمام سیاسی مسائل کے بعد تزویراتی مسائل کا بھی ہمیں سامنا کرنا پڑے گا اور وہ ہے دستور میں دیئے ہوئے صوبائی اختیارات کو منتقل کرنا اور دستور پر مناسب انداز میں نظر ثانی کرنا تاکہ یہاں صحیح معنوں میں فیڈریشن قائم ہو سکے۔ مرکز کی حیثیت مسلم ہے اور اس کے ساتھ وہ شعبے ضرور ہونے چاہئیں جو پورے ملک کے دفاع اور استحکام کے لیے درکار ہیں۔ لیکن اس وقت صورت یہ ہے کہ ہم نے ایک فیڈرل دستور پر عملاً ایک وحدانی نظام قائم کر دیا ہے۔ میری نگاہ میں ۱۹۷۳ء میں دستور کی تشکیل کے عمل میں جو مفاہمت ہوئی اگر اس پر درست طور پر عمل ہو جاتا تو آج یہ نوبت نہ آتی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے کا ہمیں سامنا کرنے پڑے گا۔ صوبائی خود مختاری عملاً بھی اور دستوری اعتبار سے بھی ملنی چاہیے لیکن یہ ساری بات قومی افہام و تفہیم سے ہونی چاہیے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کے لیے ہمارے سارے لیڈر میز پر بیٹھ کر معاملات کو طے کریں۔ لیکن اگر آپ قوت کا استعمال کریں گے، دھمکیاں دیں گے اور ایک دوسرے پر دشنام طرازی کریں گے یا حب وطن کو چیلنج کریں گے تو میں سمجھتا ہوں یہ صحیح نہیں ہو گا۔

جناب والا! میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ مجھے خود سردار عطاء اللہ مینگل صاحب اور عبد الباقی بلوچ کے ساتھ دس مہینے جیل میں اس طرح رہنے کا موقع ملا ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان صرف ایک دیوار تھی۔ ہم ان سے بات چیت کر سکتے تھے اور باہم ملتے تھے، میں ان قدیم رابطوں کی بنیاد پر کہتا ہوں، کسی کی حب الوطنی کو چیلنج نہ کیجیے، یہ سب محب وطن ہیں البتہ یہ ہے کہ ہر ایک کا اپنا انداز ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر کوئی آپ کی بات سے اتفاق کرے لیکن جب ایک میز پر بیٹھیں گے تو یہ معاملات خوش اسلوبی سے حل ہو سکتے ہیں۔

ان الفاظ کے ساتھ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قیادت خوش فہمی کا شکار نہ ہو، وہاں کے حالات خراب ہیں۔ خدا کے لیے طاقت اور قوت کے ذریعہ حکومت کے نظام سے نکلیں اور کوشش کریں کہ معاملات بیٹھ کر افہام و تفہیم کے ساتھ طے کر سکیں۔ (۴ فروری ۲۰۰۵ء)

- ۲ -

جناب چیئر مین ! میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس اہم موضوع پر خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔ ہم کئی اہم تقاریر اس اہم موضوع پر سن چکے ہیں۔ اس وقت بلوچستان میں جو صورتحال ہے، بلکہ آپ اجازت دیں کہ میں کہوں کہ جو آگ لگی ہوئی ہے، اس کے مختلف پہلو سامنے آرہے ہیں۔ میں اپنی جانب سے سب سے پہلی بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بلوچستان کے موجودہ حالات اور وہاں کے مسائل، صرف بلوچستان کے نہیں بلکہ پاکستان کے مسائل ہیں، یہ میرے اور ہم میں سے ہر ایک کے مسائل ہیں اور اس ایوان کا فرض ہے کہ جزوی اور پارٹی ترجیحات سے بلند ہو کر پاکستان اور اسلام کے مفاد میں، انصاف، حقائق اور انسانی پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ایک دانشمندانہ اور صحیح پالیسی اختیار کرے۔ یہ بڑا نازک لمحہ ہے، جوش کا اظہار نہ اس طرف سے ہونا چاہیے اور نہ اس طرف سے ہونا چاہیے۔ محض ایک دوسرے کی بات کو کاٹنا اور نیچا دکھانا ہمارے پیش نظر نہیں ہونا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں بلوچستان پاکستان کا حصہ ہے اور میں پاکستانی ہوں بلوچستان پر بات کر کے میں پاکستان کی ہی بات کر رہا ہوں۔ میں یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے بلوچستان کے سینیٹر جو بات کہہ رہے ہیں، وہ ان کا حق ہے لیکن انہیں یقین رکھنا چاہیے کہ جس طرح وہ اس کو محسوس کر رہے ہیں، اس طرح ہم بھی اس کو محسوس کر رہیں۔

میں درخواست کرتا ہوں کہ خدا کے لیے صوبائیت کی سطح سے بلند ہو جایئے۔ میں اللہ کو گواہ کر کے یہ بات کہتا ہوں کہ بلوچستان میں بہت سے لوگ جس کرب سے گزر رہے ہیں اور جس کا مشاہدہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے کیا ہے، وہ صرف ان کا مسئلہ نہیں ہے، وہ میرا مسئلہ ہے، وہ آپ کا مسئلہ ہے، ہم سب کا مسئلہ ہے۔ حکومت میں جو لوگ ہیں، ان کی بھی ذمہ داری

ہے، اگر وہ اس سے غفلت برتتے ہیں اور روگردانی کرتے ہیں تو وہ پاکستان کے ساتھ زیادتی کریں گے۔ میں نے عرض کیا کہ پاکستانیت، اسلام اور انسانیت، ان تینوں کی بنیاد پر ہمارا فرض ہے کہ ہم اس آگ کو بجھائیں اور جو حقیقی مسائل ہیں، ان کی طرف توجہ دیں۔ افہام و تفہیم کا کوئی راستہ نکالیں اور ایک دوسرے کو اعتماد میں لینے اور انصاف کی بنیاد پر مظلوم کو اس کا حق دینے کے لیے کام کریں۔ ایسے کوئی معاملات آج تک قوت سے طے نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہی آج یا کبھی مستقبل میں ہوں گے۔ اس لیے یہ وقت ہے کہ ہم ہوش کے ناخن لیں۔ میں اس مختصر وقت میں تین نکات کے تحت بات کروں گا۔

## پارلیمانی کمیٹی برائے بلوچستان[1]

میں آپ سے یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ میں نے بہت جذبے کے ساتھ بلوچستان کمیٹی میں شرکت کی۔ اپنی صحت کی خرابی کے باوجود ہر جگہ گیا اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ جتنے افراد نے کمیٹی میں بلوچستان سے متعلق اپنے معاملات کو پیش کیا، انہوں نے سنجیدگی سے حقائق بیان کرنے کے ساتھ افہام و تفہیم کے لیے کوئی راستہ نکالنے کی کوشش کی لیکن حکومت کا رویہ اس معاملے میں منفی رہا ہے۔ اس کمیٹی نے اپنی کارروائی مکمل کر لی اور پانچ مہینے کے بعد یہ رپورٹ یہاں آئی۔ اس کے بعد ہمیں ضمانت دی گئی کہ ہم نے اس کے لیے عملدرآمد کا نظام بنایا ہے اور مشاہد حسین صاحب گواہی دیں گے کہ انہوں نے یہ بات کہی کہ ہم اس کی نگرانی کریں گے اور یہ دیکھیں گے کہ ہر مہینے ہمیں بتایا جائے کہ اس میں سے کیا کچھ حاصل کیا گیا ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس میں سے کون سی چیزوں پر عمل ہوا ہے۔

(جناب وسیم سجاد صاحب کی سربراہی میں) دوسری کمیٹی جس نے دستوری معاملات کو لینا تھا، وہ آج تک صحیح معنوں میں اپنے کام کو شروع بھی نہیں کر سکی۔ اگر ہمارا یہ رویہ ہے

---

[1] اشارہ ہے سابق وزیر اعظم چوہدری شجاعت حسین کی جانب سے تشکیل کی گئی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اراکین پر مشتمل کمیٹی کی جانب جو ۲۹ ستمبر ۲۰۰۴ء کو تشکیل دی گئی تھی۔ کمیٹی نے تین ماہ کے اندر بلوچستان کے معاملات کا جائزہ لے کر حالات کی بہتری اور مسائل کے حل کے سلسلے میں سفارشات دینا تھیں۔

اور پھر ہم کہتے ہیں کہ ہم سنجیدہ ہیں اور ہم معاملات کو حل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی بات پر کس طرح یقین کیا جاسکتا ہے۔ بڑے منصوبوں کی بات ہوتی ہے، بڑے منصوبوں پر بلوچستان کا اسی طرح حق ہے جس طرح پاکستان کے دیگر تمام صوبوں کا ہے۔ کوئی ان پر احسان نہیں ہے لیکن جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ بڑے منصوبوں کو کچھ خاص مقاصد حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جارہا ہے۔

## امریکہ اور بھارت کے کھیل

جناب والا! میں یہاں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ میں بہر حال بین الاقوامی حالات کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور جب تجزیہ کرتا ہوں اس پورے سیاسی منظر نامے کا تو میرے خدشات بہت بڑھ جاتے ہیں۔ جس جغرافیائی و سیاسی منظر نامے سے ہم گزر رہے ہیں، میں اس میں صاف دیکھ رہا ہوں کہ اگر بلوچستان میں اختیار کی گئی موجودہ روش جاری رہتی ہے تو اس میں ہندوستان اور امریکہ دونوں کو اپنا اپنا کھیل کھل کر کھیلنے کا موقع ملتا رہے گا۔ وہ ہر گز نہیں چاہتے کہ بلوچستان میں ترقی ہو، وہ ہر گز نہیں چاہتے کہ چینیوں کے تعاون سے گوادر کی ترقی ہو، وہ ہر گز نہیں چاہتے کہ وہاں ایسے حالات پیدا ہوں جس سے بلوچستان پاکستان سے زیادہ سے زیادہ جڑے۔ ان کے اس علاقے کے بارے میں خاص عزائم ہیں اور یہ بد قسمتی ہے کہ جن کی نگاہ اس پر ہے ہم ان کے مقاصد پورے ہونے میں ان کا آلہ کار بن رہے ہیں۔ افغانستان میں بھارت کے جو قونصل خانے اور اطلاعاتی مراکز قائم ہوئے ہیں، یہ ان علاقوں میں قائم ہوئے ہیں جہاں ان کے کوئی دوسرے مفادات اور ضروریات نہیں ہیں۔ وہ وہاں اس لیے قائم کیے گئے ہیں کہ وہاں سے پاکستان میں اور خصوصیت سے سرحد اور بلوچستان میں ایک کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہ ساری چیزیں حقائق ہیں۔ خدا کے لیے ان کو دیکھیے اور بلوچستان کے عوام نے جو قربانیاں دی ہیں ان کا احترام کیجیے۔

جہاں تک بلوچستان کے لوگوں کی محبت کا تعلق ہے اس پر شبہ نہ کیجیے آپ ان کو سینے سے لگائیے، انہیں ایک میز پر بٹھائیے اور ان کی بات کو سنیے۔ اگر ان کا کوئی مطالبہ ناجائز ہے یا

غلط ہے تو اس کا دلیل کے ساتھ جواب دیجیے لیکن اگر آپ انہیں گولی سے جواب دیں گے تو مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ پھر گولی کا جواب گولی سے ہی آئے گا جو کسی کے لیے خیر کی بات نہیں ہے۔ بلاشبہ جن لوگوں نے گولی کا استعمال کیا ہے اور تخریب کاری کے واقعات ہوئے ہیں، ہم نے اس کی مذمت کی ہے۔ ہم نے کبھی بھی ان کی تائید نہیں کی لیکن اس کے ساتھ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب تک آپ اسباب کو درست نہیں کریں گے اس وقت تک حالات کو سنبھال نہیں سکیں گے۔ اگر آپ طاقت کی بنیاد پر معاملات طے کرنا چاہتے ہیں تو یاد رکھیئے آپ آج اقتدار میں ہیں کل آپ اقتدار میں نہیں ہوں گے لیکن یہ ملک ہو گا اور ہمیں مل کر اس کو سنوارنا ہے۔ اس لیے میں پرزور انداز میں یہ بات کہوں گا کہ بلوچستان کے معاملات میں جماعتی سیاست سے بلند ہو کر سب لوگوں کو ساتھ لے کر چلیے۔ مجھے یقین ہے وہ افراد جو اس وقت احتجاجی صورت حال میں ہیں۔ ان کے دلوں میں پاکستان کی محبت ہے۔ وہ پاکستان میں عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں لیکن یہ اس وقت ممکن ہے جب ہم سب کھلے دل کے ساتھ ایک دوسرے کا احترام کریں۔ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ خدا کے لیے اسے سیاست کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ معاملات کو سنبھالنے کی کوشش کریں۔ جناب والا! میری تجویز یہ ہے کہ اب بھی حالات قابو میں آسکتے ہیں لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب گولی، طاقت اور دھونس کی بات کو آپ چھوڑیں گے۔ یہ بات کہ ہم طاقتور ہیں اور ہم جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ جس وقت تک آپ یہ ذہن نہیں بدلیں گے اس وقت تک حالات نہیں بدل سکتے۔

## سیاست میں فوج کا کردار

دوسری بات یہ ہے کہ فوج کا کردار سیاست میں نہ ہو۔ یہ ہمارے مسائل کو بگاڑنے کا مؤثر ذریعہ بنا ہے۔ آیئے! اس معاملے میں ایک قومی اتفاق رائے کریں کہ فوج کو صرف دفاع کے لیے محدود ہونا چاہیے۔ دفاع کے لیے اس کی جو حقیقی ضروریات ہیں وہ پوری کرنا قوم کی ذمہ داری ہے۔ لیکن اگر فوج سمجھتی ہے کہ ملک کی سیاست کو چلانا بھی اس کا کام ہے تو یہ فوج کے پیشہ ورانہ اور دفاعی کردار کو بھی مجروح کرے گا اور اس کے ذریعے پاکستان میں

کبھی بھی سیاسی، معاشی اور تہذیبی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔ بگاڑ بڑھتا چلا جائے گا۔ ایک ہی راستہ ہے کہ دستوری اداروں کو آپ مستحکم کریں۔

آپ (جنرل مشرف) کہتے ہیں کہ ہم دستوری ضمانت بھی دے دیں گے۔ لیکن آپ کی اس بات کو کون مانے گا جبکہ آپ (جنرل مشرف) کے اقتدار کی بنیاد دستور کو توڑنا ہے۔ اور ایک نہیں، دستور کی دس سے زیادہ دفعات ایسی ہیں کہ جنہیں مسلسل آپ توڑ رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ کی بات، آپ کی ضمانت اور آپ کے قول پر کون اعتبار کر سکتا ہے۔ اس لیے خدا کے لیے ہوش کے ناخن لیجیے اور اس بات کی کوشش کیجیے کہ اداروں کو فیصلہ کرنے کا ذریعہ بنایا جائے۔

دستور نے جو دائرہ کار میں دیا ہے، وہ ہے پارلیمانی وفاقی اور اسلامی جمہوریت۔ یہ تین بنیادیں ہیں دستور کی۔ ان تین بنیادوں پر اگر ہم سب مل کر کام کریں تو پھر پاکستان ترقی کرے گا۔ اگر آپ نے طاقت استعمال کی تو اس کا نقصان پوری قوم کو پہنچے گا محض بلوچستان کو نہیں۔ پاکستان کا مفاد اسی میں ہے کہ ہم بلوچستان کے معاملات کو علاقائی اور جزوی انداز سے نہ دیکھیں بلکہ دستور کے تحت پاکستانیت کے تناظر میں اور کھلے دل کے ساتھ سیاسی عمل کے ذریعے معاملات کو حل کریں۔ موجودہ بحران سے نکلنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ (۲۳ دسمبر ۲۰۰۵ء)

- ۳ -

جناب چیئرمین! وزیرستان اور بلوچستان کے مسئلے پر ایوان کے دونوں حصوں میں بڑی سیر حاصل بحث ہوئی ہے میں سمجھتا ہوں خصوصاً مولانا گل نصیب صاحب، شاہد بگٹی صاحب، مولانا محمد صالح صاحب اور اسفندیار صاحب کی طرف سے جو باتیں آئی ہیں، ان سے مسئلے کے سارے پہلو بڑی حد تک واضح ہو گئے ہیں۔ بلاشبہ اس بحث میں بہت سی ایسی باتیں بھی کہی گئی ہیں جو میری نگاہ میں نہ صرف غلط بلکہ غیر متعلق بھی ہیں لیکن میں اس وقت ان کا تعاقب نہیں کروں گا بلکہ آپ کی اجازت سے چاہوں گا کہ نہایت اختصار کے ساتھ جو بنیادی مسائل ہیں ان کا جائزہ لوں اور اصلاح احوال کا کیا راستہ ہے، اس کی نشاندہی کروں۔

اس ضمن میں پہلی بات یہ ہے کہ وزیرستان اور بلوچستان کا مسئلہ اس حد تک تو قدر مشترک

رکھتا ہے کے دونوں جگہ حکومت اور اس کے مد مقابل ایک دوسرے گروہ کی طرف سے قوت استعمال کی جارہی ہے۔ لیکن ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ تشدد یا محض طاقت کے استعمال کے ذریعے، خواہ وہ سرکاری سطح پر ہو یا عوامی سطح پر ہو، مسائل حل نہیں ہوسکتے البتہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے دونوں مسائل الگ الگ ہیں۔ وزیرستان کے بارے میں صرف اتنی بات کہوں گا کہ اس علاقے کی اپنی روایات اور اپنی تاریخ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ پاکستان بننے سے لے کر اب سے ایک سال پہلے تک وہ علاقہ ہر اعتبار سے امن و آشتی کا نمونہ تھا اور پاکستان کے تحفظ اور پشتی بانی کا کام انجام دے رہا تھا۔ ہم نے کچھ بیرونی مطالبات اور دباؤ پر ایسی کارروائیاں کیں جو ناحق اور وہاں کی روایات اور طریقوں سے ہٹی ہوئی ہیں جس کے نتیجے کے طور پر ایک آگ سی لگ گئی ہے۔ اس لیے میں ایک بار پھر یہ کہتا ہوں کہ قوت کا استعمال خواہ وہ کسی بھی شکل میں ہو راکٹ، ہیلی کاپٹر کا استعمال، فوج یا حکومت کی طرف سے اور یا قبائل اور وہاں کے مختلف لوگوں کی طرف سے، دونوں غلط ہیں، دونوں کو روکنا چاہیے۔ ماضی میں مفاہمت کی بنیاد پر امن تھا، آج امن نہیں ہے اس لیے کہ اب انتقام کی آگ سلگ رہی ہے اور جیسا کہ میرے کچھ ساتھیوں نے کہا، مجھے ڈر ہے کہ یہ آگ مسلسل پھیل رہی ہے۔ خدا کے لیے اسے اہمیت دیجیے اور اس کا حل نکالیے۔

میں یہاں پر یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ ہماری اپنی خارجہ پالیسی کی خامیاں اور کمزوریاں ہیں جن کی بناء پر ہم نے دوستوں کو دشمن بنالیا ہے اور ہم اس صورتحال کو پیدا کرنے کے خود ذمہ دار ہیں۔ آج دینی مدارس اور مساجد کو ہدف بنایا جارہا ہے، میران شاہ کا علاقہ ایک قسم کا قبرستان بن گیا ہے، وہاں سے آبادی منتقل ہوگئی ہے اور یہی کیفیت اور جگہوں پر بھی پھیل رہی ہے۔ یہ صورتحال تباہ کن ہے اور اس کے فوری تدارک کی ضرورت ہے۔

میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ مجلس عمل کی قیادت اور وہاں کے ممبران قومی اسمبلی اور سینیٹرز نے برملا یہ بات کہی ہے کہ آیئے سب مل کر اس مسئلے کو حل کریں۔ جرگہ، مشاورت، باہمی تعاون اور دونوں طرف سے قوت کے استعمال کو ختم کرنا ہی مسئلے کا حل ہے۔ میں اس تجویز کی تائید کرتا ہوں۔

بلوچستان کی کمیٹی کا تجربہ گو پوری طرح کامیاب نہیں ہوا لیکن میں یہ کہنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ پارلیمانی کمیٹی کی حد تک اس نے اپنا فرض ادا کیا ہے، وہ نشستند و گفتند والا معاملہ نہیں تھا، اس نے ایک واضح حل دیا ہے۔ وزیرستان کے لیے بھی یہی راستہ اختیار کرنا چاہیے اس اضافے کے ساتھ کہ پارلیمانی کمیٹی متفقہ طور پر جو بھی تجاویز پیش کرے ان کے نفاذ کا انتظام ہونا چاہیے، مانیٹرنگ ہونی چاہیے اور پارلیمنٹ کے سامنے اس کی رپورٹ آنی چاہیے۔

جناب والا! بلوچستان کے بارے میں، میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جس طرح وہاں پر فوج اپنی قوت کو استعمال کر رہی ہے بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں اس سے بڑے خطرناک مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اجنبیوں کے حقوق، مہاجروں کے حقوق اور پناہ گزینوں کے حقوق یہ تینوں بین الاقوامی قوانین کا حصہ ہیں اور ہماری حکومت جو کچھ وہاں کر رہی ہے اس میں ایک درجہ میں ان سب کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔

بلوچستان کے سلسلے میں، جہاں تک میں نے تجزیہ کیا ہے بلوچستان کا پہلا مسئلہ وہاں سیاسی حقوق اور فیصلوں میں شراکت کا حق ہے اور متوازن حدود کے ساتھ صوبائی خود مختاری کے بغیر میری نگاہ میں بلوچستان کا یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ دوسرا مسئلہ صوبے کے معاشی وسائل اور اس سلسلہ میں صوبے کے لوگوں کا حق، اختیار اور ان کی شراکت ہے اگرچہ یہ بات بھی یہاں بیان کرنا مناسب ہوگی کہ محرومی کا احساس جو وہاں ہے وہ اور صوبوں میں بھی ہے۔ یہ مسئلہ ہر جگہ ہے۔ تیسرا مسئلہ صوبے کی غربت، بدحالی اور خاص طور سے تعلیم، صحت اور روزگار کے میدانوں میں ان کا پیچھے رہنا ہے۔ چوتھا مسئلہ ہے وہاں فوجی چھاؤنیاں، ایف سی، رینجرز، کوسٹل گارڈرز اور ان کا کردار، اس مسئلے کے لیے بھی کمیٹی نے واضح ہدایات دی ہیں۔ یہ چوتھا مسئلہ ہے جس کو حل کیے بغیر میں سمجھتا ہوں کہ وہاں امن قائم نہیں ہو سکتا۔ پانچواں مسئلہ وہاں پولیس اور لیویز کے تعلق کا ہے۔ یہ وہاں کا مخصوص مسئلہ ہے۔ وہاں امن و امان کی ۹۵ فیصد ذمہ داری لیویز پر تھی اور اس کا کردار، کارکردگی بہت بہتر تھی۔ دوسری جانب جہاں جہاں پولیس کی مداخلت ہوئی ہے وہاں جرائم بڑھے ہیں، امن و امان کی صورتحال خراب ہوئی

ہے اور ایک خاص گروپ ہے جو اسے آگے بڑھانے کی کوششیں کر رہا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کی جو روایات اور تاریخی ادارے ہیں جن پر ان لوگوں کا اعتماد ہے اور لوگ اس میں شرکت کرتے ہیں وہ مقامی ہیں اور ان کو استعمال کرنا چاہیے۔ چھٹا مسئلہ جو سب سے زیادہ حساس ہے لیکن اس کا سامنا کرنا چاہیے اور وہ وہاں آبادی کی ساخت تبدیل ہونے کا ہے۔ جس کے بارے میں شدید خدشات کا اظہار کیا جارہا ہے کہ آئندہ جو بھی وہاں کی سیاسی شناخت ہو گی وہ آبادی کی ساخت کی بناء پر متاثر ہو گی، ہمیں وہاں کے حالات کی مناسبت سے اس مسئلے پر بھی غور کرنا چاہیے۔ جب تک یہ مسائل وہاں حل نہیں ہوتے، میں سمجھتا ہوں کہ بلوچستان کے ماحول کو امن وامان اور ترقی کے لیے ساز گار بنانا مسلسل چیلنج رہے گا۔

## کیا کرنا ہے؟

اب کیا کرنا ہے؟ میری پہلی تجویز یہ ہے کہ سب سے پہلی چیز قوت کے استعمال کو ترک کرنا ہے۔ بلوچستان کمیٹی کا قیام اسی اصول پر ہوا تھا کہ مسئلے کا حل سیاسی ہے، سیاسی عمل کے ذریعے ہے۔ تمام متعلقہ عناصر خواہ ان کا تعلق اس علاقے سے ہو یا ملک کے دوسرے حصے سے ہو، ان کو شریک ہونا چاہیے اور افہام و تفہیم سے اور باہم مشاورت سے ہی مسئلے کا حل نکالنے پر توجہ دینی چاہیے۔ طاقت کے استعمال سے اجتناب ہو اور یہ دعوے کہ حکومت کی رٹ ہم قائم کر کے رہیں گے، میری نگاہ میں یہ غرور اور تکبر ہے اور یہ سب سے بڑی غلطی ہے۔ یاد رکھیے کہ حکومت کی رٹ فوجی قوت کے استعمال سے نہیں قائم ہوتی، وہ قائم ہوتی ہے انصاف سے، وہ قائم ہوتی ہے مشاورت سے، وہ قائم ہوتی ہے حقوق کی پاسداری سے، وہ قائم ہوتی ہے سب کو ساتھ لے کر چلنے سے، وہ قائم ہوتی ہے حکمرانی کے عمل کو بڑھانے سے، ٹھیک ہے اس میں پولیس اور فوج کا بھی ایک مرحلے پر ایک کردار ہے لیکن جس طرح آپ قوت کے ذریعے چاہ رہے ہیں کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے تو یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا، یہ بڑھتا جائے گا۔ یہی ماضی کا تجربہ ہے، یہی تاریخ کا سبق ہے۔ خدا کے لیے آنکھیں کھولیے اور اپنا رویہ تبدیل کیجیے۔

**باہمی اعتماد کی بحالی:** اس کا دوسرا لازمی تقاضا یہ ہے کہ باہمی اعتماد کو بحال کرنے کے لیے کچھ ضروری اقدام کیے جائیں۔ لوگ گھروں کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے ہیں کیونکہ آپ اجتماعی سزا دے رہے ہیں۔ یہ صریحاً غلط طرز عمل ہے، ٹھیک ہے اگر ایک راکٹ کہیں سے پھینکا گیا ہے تو وہ غلط ہے لیکن اس راکٹ کا وہاں پہنچنا، آپ کی ساری سراغ رسانی اور آپ کی ساری انتظامیہ پر ایک عدم اعتماد کا ووٹ ہے۔ پھر اس بنا پر کہ ایک علاقے سے راکٹ پھینکا گیا ہے تو اس پورے گاؤں کو آپ تباہ کر دیں، یہ اسلام، انسانیت، بین الاقوامی قانون اور پاکستان کے دستور کے خلاف ہے۔ مجرم کو جرم کے تعین کے بعد سزا دینا آپ کا صرف حق ہی نہیں بلکہ فرض ہے لیکن مجرم کے تعین کے بغیر ہر کسی کو نشانہ بنانا یہ صریحاً ظلم ہے یہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ اعتماد سازی کا کام بہت ضروری ہے اور اس کے لیے آپ نے جن لوگوں کو گرفتار کیا ہے ان کو چھوڑنا ہو گا اور جو لوگ چلے گئے ہیں ان کو واپس لانا ہو گا۔ اس کے لیے وہاں کا جو روایتی طریقہ ہے، جرگہ، اسے طلب کیا جائے جس میں ساری سیاسی جماعتیں شریک ہونے کے لیے تیار بھی ہیں۔ اعتماد سازی کے اقدام کیے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔

**بلوچستان کمیٹی کی سفارشات پر عمل درآمد:** تیسری چیز یہ ہے کہ پہلے قدم کے طور پر بلوچستان کے سلسلے میں بلوچستان کمیٹی[1] نے جو سفارشات دی ہیں اور جو ہماری متفقہ سفارشات ہیں ان پر عملدرآمد شروع کیا جائے۔ حکومت ان کو ماننے سے انکار کر رہی ہے، حالانکہ حکومت کی پارٹی کے نمائندے اس میں شریک تھے، یہ مشورے سے طے کیا گیا لائحہ عمل ہے اور متفق علیہ ہے۔ میری نگاہ میں حکومت کا یہ رویہ نہایت غلط رویہ ہے۔ حکومت کو ان تجاویز کو من و عن تسلیم کرنا چاہیے اور آپ کم از کم اس حد تک کام کا آغاز کر دیں۔ میری نگاہ میں یہ بڑا خوش آئند آغاز ہو گا۔ اس کے لیے کمیٹی کو دوبارہ بلایئے، وزیر اعظم خود اس میں آئیں اور وہ اعلان کریں اور اس کے بعد پھر ایک ایک چیز پر وقت کے تعین کے ساتھ عمل کریں۔ ورنہ ماضی میں جس طریقے سے چیزیں معلق رہی ہیں، آئندہ بھی اسی طریقے سے معلق رہیں گی۔

---

[1] ۲۹ ستمبر ۲۰۰۴ء کو بلوچستان کے مسائل کے سلسلے میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے منتخب اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی (بلوچستان کمیٹی) تشکیل دی گئی تھی۔

**دستوری ترامیم:** چوتھی چیز یہ ہے کہ دستوری ترامیم لازمی ہیں۔ اس کے لیے ایک وقت متعین کیجیے۔ دستور میں مشترکہ فہرست (Concurrent list) کا موجودہ شکل میں، اب جاری رہنا میری نگاہ میں بے کار ہے۔ مشترکہ فہرست میں دیے گئے بہت سے اختیارات صوبوں کو دیے جانے چاہییں البتہ جو وفاقی فہرست ہے اس پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے کہ ان میں سے کن چیزوں کو منتقل کیا جائے اور کن چیزوں کو مشترکہ فہرست میں رکھا جاسکتا ہے۔ اگلے پانچ سال کے لیے۔ یہ دستوری ترامیم میری نگاہ میں بہت ضروری ہیں۔

خلاصہ کے طور پر میں کہوں گا کہ پہلی چیز فوری جنگ بندی، قوت کے استعمال سے اجتناب اور دونوں طرف سے قوت کے استعمال کو ختم کرنا۔ دوسری چیز .CBMs، تیسری چیز جو متفقہ تجاویز ہیں ان پر فوری عمل اور آئندہ کے لیے مشاورت کے ذریعے نئے مسائل، نئی چیزوں کا حل نکالنا اور چوتھی چیز دستوری ترامیم، ان کو بھی التوا میں نہ ڈالا جائے بلکہ اس کام کو غیر معمولی اہمیت دے کر اگلے دو، تین مہینوں میں سر جوڑ کر بیٹھیے اور اسے کر ڈالیے، تب یہ مسائل حل ہوں گے۔

آخر میں، میں یہ کہوں گا کہ قوت کا استعمال کرنے والوں نے ایک دعویٰ یہ بھی کیا ہے کہ ایک مہینے میں مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس قسم کی باتیں پچھلے دو سال سے کہی جارہی ہیں۔ یہ کہنا آگ پر تیل ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے۔ خدا کے لیے اپنی زبانوں کو لگام دیجیے اور ہوش کے ناخن لے کر وہ راستہ اختیار کیجیے، جس سے ہم ملک کو اس بحران سے نکال سکیں۔ یہ ملک ہمارا ہے، اسے بچانا، اسے ترقی دینا، اس کی ضروریات پوری کرنا ہماری ذمہ داری ہے، ہماری ہی نہیں بلکہ ہماری آنے والی نسلوں کے ساتھ، ہماری اس رواداری، افہام و تفہیم اور مل کر کام کرنے پر ہے۔ اس کے علاوہ جو راستہ آپ اختیار کریں گے وہ خسارے کا راستہ ہے۔ خدا کے لیے اس سے اجتناب کیجیے۔ (۲۰ مارچ ۲۰۰۶ء)

میں اپنی گزارشات کا مثبت بات سے آغاز کروں گا۔ اسفندیار صاحب کی طرح قائد ایوان کے اس بیان کا میں بھی خیر مقدم کرتا ہوں کہ وہ کھلے ذہن اور کھلے دل کے ساتھ حل تلاش کرنے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن حقائق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ درحقیقت حقائق کو تسلیم کر کے ہی اپنی غلطیوں کی تلافی کر سکتے ہیں۔ پہلی بات وہی ہے جس کی طرف اسفندیار ولی صاحب نے متوجہ کیا ہے۔ اور میں برادرم وسیم سجاد کو یاد دلاؤں گا کہ ہم نے جو کام شروع کیا اسے کس طرح سبوتاژ کرنے کی کوشش کی جاتی رہی۔ چوہدری شجاعت صاحب نے اس موقع پر تدبر کا ثبوت دیتے ہوئے اس بات کو اختیار کیا تھا کہ ہمیں اس مسئلے کا سیاسی اور صرف سیاسی حل نکالنا ہے۔ فوجی حل یا قوت کے ذریعے اس کا حل کسی طرح نہیں ہو گا۔ اس موقع پر پہلی نشست میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ سارا کام ایک ایسی فضا میں ہو سکتا ہے، جس میں ایک دوسرے کے ساتھ اعتماد کے ساتھ بات چیت کی جا سکتی ہے۔ اس لیے جو بُعد واقع ہو گیا ہے یا جو نفرتیں پیدا ہو رہی ہیں، اعتماد سازی کے ذریعے وہ دور کی جائیں، یہ اس کا عملی قدم ہے۔ اس بارے میں کمیٹی کی حد تک کوئی اختلاف رائے نہیں تھا۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ جیسے جیسے کمیٹی نے کام شروع کیا، کوئی مخفی ہاتھ اس کمیٹی کی پوری کارروائی کو سبوتاژ اور پٹڑی سے اتارنے میں مصروف تھا اور یہ بات میں آج نہیں کہہ رہا بلکہ میں نے یہ بات کمیٹی میں، اس ایوان میں اور عوامی سطح پر بھی کہی ہے۔ اس پس منظر میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ آپ کو دوبارہ اعتماد کی اسی فضا کو بحال کرنا ہو گا۔

دوسری بات مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ مشاہد حسین کمیٹی نے متفقہ طور پر اپنی تجاویز پیش کیں اور وسیم سجاد کمیٹی نے متفقہ طور پر ان کو قبول کیا۔ درحقیقت جس وقت بنیادی تجاویز مرتب کی گئی تھیں اس وقت تمام پارٹیاں شریک تھیں۔ اسی طرح ڈرافٹنگ کمیٹی کی سطح پر بھی ایک پارٹی کو چھوڑ کر تمام پارٹیاں شریک تھیں۔ اس کے باوجود جو تجاویز آئیں اور منظور کی گئیں ان پر پانچ فیصدی بھی عمل نہیں ہوا، حالانکہ ہمیں ضمانت دی گئی تھی کہ مہینے میں ایک بار مانیٹرنگ کی جائے گی اور اطلاع دی جائے گی کہ کن چیزوں پر عمل ہوا ہے اور کن پر عمل کی راہ میں کیا

مشکلات حائل ہیں۔ ایک نشست جو ہوئی ہے اس میں میرے سامنے یہ تکلیف دہ حقیقت آئی کہ کمیٹی کی سفارشات کے بارے میں، جو متفق علیہ تھیں، جس میں سرکاری پارٹی اور دیگر تمام پارٹیاں شریک تھیں، وزیر اعظم شوکت عزیز نے یہ بات کہی کہ اس میں ابھی بہت سی چیزیں ایسی ہیں، جن کے بارے میں ہمارے تحفظات ہیں اور ہم نے انہیں قبول نہیں کیا۔ یہ بڑی افسوسناک بات ہے اور اس طرح الجھاؤ پیدا کرنا صحیح نہیں ہے۔

تیسری بات میں یہ بھی کہوں گا کہ مشاہد حسین کمیٹی سے جب ایک رکن دستبردار ہو گئے اور وسیم سجاد کمیٹی سے دو پارٹیوں نے دستبرداری اختیار کی تو ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھے رہے بلکہ ہم نے اپنے کام کو آگے بڑھایا اور جو لوگ موجود تھے، انہوں نے متفقہ تجاویز آگے پیش کیں۔ یہی کام دوسری کمیٹی کو کرنا چاہیے تھا کہ اگر ایک دو حضرات نہیں آرہے تھے تو ان کو منانے کی، لانے کی کوشش کی جاتی اور باقی لوگ ساتھ ساتھ کام کرتے رہتے۔ جہاں تک دو تہائی اکثریت کی بات ہے تو جو جماعتیں آخری وقت تک موجود تھیں اور رہی ہیں، وہ دو تہائی نہیں، تین چوتھائی بھی نہیں بلکہ ۴/۵ حصہ اس پارلیمنٹ میں رکھتی ہیں۔ محض دو پارٹیوں کے احتجاج کو عذر بنا کر پروگرام کو معلق کر دینا میرے خیال میں صحیح بات نہیں تھی۔ میں کوئی چارج شیٹ نہیں لگا رہا ہوں، بلکہ یہ حقائق میں نے اس لیے پیش کیے کہ حقائق یہی ہیں۔ اس کے باوجود ہمارا دل اب بھی کھلا ہوا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آگے بڑھیں اور اس کے سوا کوئی راستہ نہیں کہ مل بیٹھ کر حالات کو سنبھالیں، ایک طرف جنگ بندی کیجیے تاکہ جو آگ لگی ہوئی ہے، وہ رکے اور دوسری طرف مذاکرات کی میز پر آیئے، ماضی میں جو لوگ شریک رہے ہیں، وہ سب شریک ہوں۔ جو پیچھے ہٹ گئے تھے، ہم ان کو بھی لانے کی پوری کوشش کریں گے اس کے لیے آپ بھی کوشش کریں، ہم بھی کریں گے یہی درست راستہ ہے، اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ (۲۰ مارچ ۲۰۰۶ء)

# واقعات کا تشویشناک تسلسل

## حکمت عملی میں بہتری کی ضرورت

بلوچستان نیشنل پارٹی کے سینیٹر ثناء اللہ بلوچ نے بلوچستان کے معاملات پر وفاقی حکومت کے مسلسل منفی رویے کے حوالہ سے اپنی پارٹی کے حکم پر سینیٹ سے استعفیٰ دیا۔ اس موقع پر اپنی تقریر میں انہوں نے نواب اکبر بگٹی کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ نواب اکبر بگٹی آخر وقت تک صلح کے متمنی تھے۔ انہوں نے سردار اختر مینگل کے ساتھ حکومت کے رویے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ انھیں معروف دہشت گردوں کے ساتھ جیل میں رکھا گیا۔ اپنی تقریر میں ثناء اللہ بلوچ نے بلوچستان میں لاپتہ افراد کا مسئلہ، ٹارگٹ کلنگ، بلوچستان کی لاکھوں ایکٹر زمین کی سول و عسکری اداروں کو الاٹمنٹ اور بلوچستان میں منصوبہ بندی کے ذریعے بلوچ آبادی کے تناسب میں تبدیلی کی کوششوں نیز آپریشنز کے نتیجے میں کا ذکر کرتے ہوئے متنبہ کیا کہ اگر بلوچستان کی سیاست، معیشت اور عوام کو وفاقی حکومت کی جانب سے نقصان پہنچے گا تو خود پاکستان کا نقصان ہو گا۔ پروفیسر خورشید احمد کی زیر نظر تقریر اسی موقع پر کی گئی ہے۔ بعد ازاں تمام پارلیمانی جماعتوں کے ممبران نے ثناء اللہ بلوچ سے استعفیٰ واپس لینے کی درخواست کی تاہم سینیٹر ثناء اللہ کی جانب سے استعفیٰ واپس نہ لینے پر اسے قبول کر لیا گیا۔

---

جناب چیئرمین! سینیٹ جس موضوع پر گفتگو کر رہی تھی وہ بھی اہم ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے نوجوان اور عزیز بھائی ثناء اللہ بلوچ صاحب نے جو تقریر کی ہے اور اس تقریر میں جن جذبات اور خیالات کا اظہار کیا ہے، اور پھر استعفے کی جو بات ہوئی ہے اس نے باقی تمام موضوعات کو غیر اہم بنا دیا ہے۔ ہمارے لیے اس وقت اولیت اس مسئلے کی اور اس

کے ساتھ ساتھ استعفے کی بھی ہے۔ میں اپنے عزیز بھائی رضا ربانی، مشاہد حسین اور خود رحمان ملک صاحب نے جو بات کہی ہے اس کی تائید کرتے ہوئے یہ بات کہوں گا کہ اس وقت ملک کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہم اس ملک کی آزادی اور اس کے وفاقی کردار کی حفاظت کریں۔ اس وقت دونوں پہلوؤں سے ہم پر ضرب لگ رہی ہے۔ یہ ہمارے وجود اور ہمارے مستقبل کا مسئلہ ہے اور خدا کے لیے اسے غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہ کر دیں۔ ثناء اللہ بلوچ نے جو باتیں کی ہیں، میں ان کی مکمل تائید کرتا ہوں اور ہم اس ایوان میں بار بار اس بات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔

میں اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنا چاہتا ہوں کہ معاشرہ حق اور حقوق، انصاف اور رواداری اور محبت، اخوت اور اپنائیت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو دل پھٹ جاتے ہیں، خاندان منتشر ہو جاتے ہیں، قومیں ختم ہو جاتی ہیں اور ملک خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ اس لیے یہ سب سے بنیادی مسئلہ ہے۔

میں حکومت کے اس رویے کا خیر مقدم کرتا ہوں کہ ماضی میں جو کچھ ہوا ہے اس حوالہ سے ہمیں حقائق کو تسلیم کرنا چاہیے۔ یہ حق اور ناحق، عدل اور ظلم کا مسئلہ تھا، جہاں اس کمیٹی[1] نے دیانتداری کے ساتھ اور سب کو ساتھ لے کر کام کیا۔ ہم نے جا کر اپنے بھائیوں کے ساتھ کھلے دل سے بات چیت بھی کی، ان کے غم اور دکھ کو سمجھا اور اسے اپنا دکھ اور غم بنایا اور اسی جذبے سے ہم نے وہاں کام کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنرل مشرف اور وزیر اعظم شوکت عزیز، دونوں نے اس کو سبو تاژ کیا۔ محض اسٹیبلشمنٹ پر بات ڈالنا صحیح نہیں ہے۔ اس لیے میں گواہی دیتا ہوں کہ اپنی رائے کے خلاف صرف برادرم مشاہد حسین کے کہنے پر میں ایک بار اس کمیٹی کی میٹنگ میں بھی گیا جو follow-up کے لیے قائم کی گئی تھی لیکن اس میٹنگ میں وزیر اعظم کا رویہ کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔ ان کی پارٹی کے

---

[1] بلوچستان کی صورتحال پر پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اراکین پر مشتمل سابق وزیر اعظم چوہدری شجاعت حسین کی سربراہی میں قائم کمیٹی کی ذیلی کمیٹی جو سینیٹر مشاہد حسین سیّد کی سربراہی میں قائم کی گئی تھی۔

لوگ کمیٹی میں شریک تھے اور ہماری رپورٹ متفقہ تھی لیکن وہاں وزیر اعظم کسی بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اس کے بعد میں نے باقی تمام میٹنگز کا بائیکاٹ کیا۔ اس لیے کہ یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ انہوں نے یہ کام محض ہمیں یا عوام کو دھوکہ دینے کے لیے کیا ہے۔ وہ اس کے بارے میں مخلص نہیں ہیں۔ اس لیے مسئلہ شکاری اور شکار کا نہیں ہے بلکہ یہ دو مختلف سوچ اور فکر کا مسئلہ تھا۔ اگر موجودہ مخلوط حکومت اس ذہن پر غور کر کے اسے تبدیل کرتی ہے تو مجھے یقین ہے کہ حالات بہتر ہوں گے اور حالات کو بہتر کرنے کے لیے افہام و تفہیم، دوستی، پیار و محبت، حقوق کو ادا کرنے کی مخلصانہ کوشش ضروری ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ عدل سے آگے احسان ہے جس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ قرآن نے ہمیں جو حکم دیا ہے وہ یہ ہے کہ سب کے ساتھ احسان کرو۔ عدل کے معنی یہ ہیں کہ حق دار کو اس کا حق دو لیکن احسان یہ ہے کہ حق سے زیادہ دو تا کہ اس کی تکلیف کی تلافی ہو سکے۔

جناب والا! یہ ہے اصل مسئلہ۔ میں اپنے ساتھیوں کی حمایت کرتا ہوں۔ ثناء اللہ بلوچ اور ان کی پارٹی کا یہ بڑا دیانتدارانہ اور جرأت مندانہ اقدام ہے کہ جو ان کی پارٹی کا مؤقف ہے وہ اس کے مطابق کام کرنے کو تیار ہیں۔ ہمیں ایسے ہی کردار کی ضرورت ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ جو حالات ہیں ان میں ہم یہاں ان کی موجودگی کی ضرورت کو پہلے سے زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ ان سے اور ان کی پارٹی سے پورے خلوص کے ساتھ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جن حالات میں انہوں نے فیصلہ کیا تھا وہ اپنی جگہ صحیح تھا۔ جب اختر مینگل صاحب نے اسمبلی سے استعفیٰ دیا ہے تو ذاتی طور پر میں نے ان سے رابطہ کر کے انہیں مبارکباد دی تھی اور یہ کہا تھا کہ ہم بھی آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔ لیکن آج کے حالات کے مطابق میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ثناء اللہ بلوچ ہمارے ساتھ رہیں اور ہم مل کر حق اور انصاف کے حصول کی جد و جہد کریں۔ ہم ان کے ساتھ ہیں اور ان شاء اللہ مل کر ہم حالات کو سنبھالنے کی پوری کوشش کریں گے۔ (۶ جون ۲۰۰۸ء)

- ۲ -

میں جو پوائنٹ آف آرڈر اٹھانا چاہ رہا تھا، وہ کشمیر کے مسئلے پر تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ جناب والا ! میں اس موضوع پر، جس پر ہمارے چار بھائیوں نے بات کی ہے، گفتگو کو اوّلیت دیتا ہوں۔ خدارا! اسے محض بلوچستان کے افراد کا یا سینیٹروں کا مسئلہ نہ سمجھیے[1]۔ یہ ہمارا مسئلہ ہے، یہ میرا اور اس پورے ایوان کا مسئلہ ہے۔ یہ پاکستان کا مسئلہ ہے اور جو کھیل بلوچستان میں کھیلا جا رہا ہے، وہی کھیل آج وزیرستان اور سوات میں بھی کھیلا جا رہا ہے اور دوسرے علاقے بھی اس سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس لیے اس خطرے کو پوری طرح محسوس کیجیے۔ میں پیپلز پارٹی کی قیادت سے بہت صاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ سب سے زیادہ آزمائش میں ہیں۔ ان پانچ مہینوں میں آپ نے مشرف اور بش کی پالیسیوں میں کوئی تبدیلی نہیں کی ہے۔ جس کے نتیجے کے طور پر انسپکٹر جنرل فرنٹیئر کانسٹیبلری خود طاقت کا ایک مرکز بن کر لوگوں کو چیلنج کر رہا ہے۔ یہ کیا صورتحال ہے؟

بلوچستان میں ایک ایک فرد جو شہید کیا جا رہا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ آپ بغاوت کے بیج بو رہے ہیں۔ آپ ملک کو تباہی کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ یاد رکھیے یہ کرسیوں کا یا مفادات کا کھیل نہیں ہے، آپ پر تاریخ نے ایک بہت بڑی ذمہ داری ڈالی ہے۔

---

[1] نواب اکبر بگٹی کی شہادت کے دو سال مکمل ہونے سے دو روز قبل بلوچستان کے مختلف علاقوں ناصر آباد، تربت، ڈیرہ بگٹی، کلی قمبرانی، مری ایجنسی اور اولڈ مکران میں فوجی آپریشن کیا گیا جس میں گن شپ ہیلی کاپٹروں سے بھی حملے کیے گئے۔ علاقوں کو گھیرے میں لے کر سرچ آپریشن کیا گیا جس میں کئی لوگ مارے گئے اور آبادیوں کو نقصان پہنچا۔ ان واقعات پر سینیٹ کے اراکین کامران مرتضیٰ، شاہد بگٹی، ڈاکٹر عبدالمالک، اسرار اللہ زہری، اور سعدیہ عباسی نے پوائنٹ آف آرڈر پر گفتگو کی۔

اس گفتگو میں مختلف اراکین نے کہا کہ ۱۸ فروری ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی کی حکومت بننے کے بعد توقع تھی کہ فوجی آپریشن ختم ہو جائے گا لیکن آپریشن کے تسلسل سے معلوم ہوتا ہے کہ اسٹیبلشمنٹ وفاقی حکومت کے تابع نہیں ہے۔ مقررین نے انتہائی مایوسی میں کہا کہ ہمیں بتایا جائے کہ بلوچستان کی حدود کہاں تک ہیں کیونکہ اسٹیبلشمنٹ کی کارروائی کے سبب پورے بلوچستان میں آزادی کے نعرے لگ رہے ہیں۔ اس پس منظر میں پروفیسر خورشید احمد نے کہا کہ بعض قوتیں بلوچستان کے مسائل کے حل کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

ہمیں آپ سے توقعات تھیں لیکن وہ توقعات آہستہ آہستہ دم توڑ رہی ہیں۔

میں آپ سے یہ بات کہنا چاہتا ہوں کہ ابھی وقت ہے، جس طرح طاقت کا بے محابہ استعمال بر سر اقتدار قوتیں کر رہی ہیں، میں انہیں ریاستی قوت نہیں کہتا، میری نگاہ میں وہ ریاست کے باغی ہیں، اور ریاست کو کمزور کر رہے ہیں۔ در حقیقت ہم اگر ان کا ہاتھ نہیں روک سکتے تو ہمیں کوئی حق نہیں ہے کہ ہم یہاں بیٹھیں۔ آپ حکومتی منصب پر پہنچے ہیں تو آپ ہمت کریں اور ان کا ہاتھ روکیں، ان پالیسیوں کو بدلیں، اس کے بغیر ملک میں جو آگ لگی ہوئی ہے، آپ اسے بجھا نہیں سکتے ہیں۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ پچھلے دور میں بھی بلوچستان کمیٹی نے بڑی دیانتداری سے بڑی محنت سے صحیح کام کیا لیکن جنرل مشرف، اسٹیبلشمنٹ اور وہ تمام لوگ جو مشرف کے سامنے اسی طرح سانس بند کیے ہوئے تھے جس طرح آج پیپلز پارٹی کیے ہوئے ہے، وہ بھی ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے اس پوری کوشش کو رد کر دیا۔ خدا کے لیے اب وہی کہانی نہ دہرائیں، ہوش کے ناخن لیجیے اس ملک کو بچایئے۔ یہ بڑا نازک وقت ہے، میں بتانا چاہتا ہوں کہ ہم بلوچستان کے ساتھیوں کے ساتھ ہیں۔ ان شاء اللہ یہ لڑائی ہم سب مل کر لڑیں گے اور حالات بگاڑنے کے ذمہ داروں کو شکست دیں گے۔ پاکستان ہمارے ہاتھوں میں ایک امانت ہے، ہم اسے اس طریقے سے کھو نہیں سکتے۔ (۲۵ اگست ۲۰۰۸ء)

- ۳ -

جناب چیئرمین! میں تربت بلوچستان میں تین سیاسی رہنماؤں کے بے رحمانہ قتل[1]، صوبے میں سیکورٹی اور انسانی حقوق کی صورت حال کے بارے میں ایوان کی عمومی کارروائی کو ملتوی کر کے بحث کرنے کے لیے اجازت چاہتا ہوں۔

---

[1] اپریل ۲۰۰۹ء میں تربت کے بازار میں دن دہاڑے بلوچ لیڈران لالہ منیر بلوچ، شیر محمد بلوچ اور غلام محمد بلوچ کو کچکول علی (ایڈووکیٹ) کے دفتر سے اغوا کیا گیا۔ تین دن بعد ان کی لاشیں تربت کے علاقے کیچ سے جھاڑیوں میں پڑی ہوئی ملیں۔

جناب چیئر مین ! میری نگاہ میں یہ اس ایوان کا فرض ہے کیونکہ ہم وفاق کے تمام یونٹس کے حقوق کے محافظ ہیں۔ جو کچھ بلوچستان میں ہو رہا ہے اور جس سفاکی سے ہو رہا ہے اس پر ہم خاموشی اختیار نہیں کر سکتے، ہمیں دکھ سے یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ حکومت وقت اس وقت اپنی ذمہ داری ادا نہیں کر رہی۔

مشرف صاحب نے جو کچھ کیا وہ ظلم تھا اور اس ایوان نے اس کا بھرپور نوٹس لیا اور بار بار لیا لیکن ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی تھی۔ ہمیں توقع تھی کہ سیاسی حکومت معاملات کی سنگینی کو محسوس کرے گی اور اس سلسلے میں عملی اقدام کرے گی۔ شروع میں ایک کمیٹی کا اعلان بھی کیا گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ جو حشر بلوچستان کمیٹی کا مشرف کا زمانے میں ہوا، وہی سلسلہ اب بھی جاری ہے۔

حالیہ واقعہ اپنی شدت اور بہیمانہ نوعیت کے اعتبار سے بہت ہی سنگین ہے۔ جو حقائق میڈیا نے ہمارے سامنے پیش کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے اور خاص طور پر اس معاملے میں وکیل جناب کچکول علی کی گواہی ہے کہ مقتولین ان کے مؤکل تھے اور ان افراد کو ایجنسیز نے ان کے سامنے زیر حراست لیا تھا۔ حراست میں لینے کا یہ واقعہ تین اپریل کو ہوا اس کے بعد نو اپریل کو ان لوگوں کی مسخ شدہ لاشیں ملیں۔ اور پھر ان کو صرف مارا ہی نہیں گیا ہے بلکہ ان کی لاشوں کی بے حرمتی کی گئی ہے۔ ڈاکٹروں کا کہنا یہ ہے کہ ان کی موت تین چار دن پہلے واقع ہوئی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو تین اپریل کو اٹھانے کے بعد اسی وقت یا اس کے فوراً بعد ہلاک کیا گیا ہے۔ اس میں بلوچستان قومی موومنٹ کے صدر جناب غلام محمد بلوچ صاحب، لالہ منیر بلوچ صاحب اور شیر محمد بلوچ صاحب، یہ تین افراد شامل تھے۔

میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ یہ صرف ان تین افراد کا معاملہ نہیں ہے، یہ پوری پاکستانی قوم کا معاملہ ہے اور بلوچستان میں ہر روز ایسے واقعات ہو رہے ہیں۔ اس لیے میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ ایوان کی کارروائی روک کر بلوچستان کی صورتحال پر، وہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں، امن و امان کی صورتحال جو ناگفتہ بہ حالت میں ہے اور ایجنسیوں کے

ملوث ہونے پر بحث کی جائے۔ بظاہر یہ معلوم ہو رہا ہے کہ ایک نہیں سینکڑوں افراد کو اٹھایا گیا ہے، یعنی ۶۰۰ سے لے کر کئی ہزار تک کی تعداد ہے جو کہ ہمارے سامنے آ رہی ہے۔

جناب والا! میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ایک انسان کی قیمت پوری انسانیت کی قیمت کے برابر ہے۔ یہ بد قسمتی ہے کہ خون روز بہہ رہا ہے اور یہ ڈرامہ بار بار کیا جا رہا ہے۔ آخر کون ہو گا جو اس کو روکے گا؟ کون ہے جو ان حالات کو قابو میں لائے؟ کس طرح ہم اپنے بلوچستان کے بھائیوں اور بہنوں کو یہ یقین دلائیں کہ یہ محض ان کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ میرا، آپ کا، اس ایوان کا اور یہ پوری قوم کا مسئلہ ہے۔ جناب والا! اس بنا پر میں آپ سے اور اس ایوان سے درخواست کروں گا کہ عام کارروائی کو روک کر کے بلوچستان کی صورتحال اور خصوصیت سے ان تین افراد کی شہادت اور اس کے ساتھ ساتھ جتنے افراد وہاں 'نشان عبرت' بنائے جا رہے ہیں اور صوبے کے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے اس کو ہم زیر بحث لائیں۔ (۱۷ اپریل ۲۰۰۹ء)

– ۴ –

جناب چیئرمین! سب سے پہلے تو میں اس اندوہناک واقعے[1] کی پرزور مذمت کرتا ہوں۔ جو تفصیلات آج ہمارے بھائی ڈاکٹر شاہد حسن بگٹی صاحب نے ایوان کے سامنے رکھی ہیں، وہ اور بھی زیادہ اندوہناک اور دلخراش ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا کہ جیسے ہی یہ واقعہ ہوا، اس کی میں نے، مولانا عبدالغفور حیدری صاحب نے اور دوسرے سینیٹرز نے مذمت کی اور اس پر احتجاج کیا۔ بگٹی صاحب نے کہا کہ پوری کوشش کی جا رہی ہے کہ اس معاملے کو تبدیل کر کے کوئی خاندانی تنازعہ بنا دیا جائے۔ میرے خیال میں اس طرح کی کوئی بھی کوشش حالات کو اور بھی زیادہ بگاڑنے کا سبب بنے گی۔

میری نگاہ میں بلوچستان کے حالات بے حد سنگین ہیں۔ ہم تھک گئے ہیں یہ بات کہتے

---

[1] ۳۰ جنوری ۲۰۱۲ء کی شب سینیٹر شاہد حسن بگٹی کے بیٹے کے ولیمے سے واپس جاتے ہوئے سردار زادہ بختیار خان ڈومکی کی اہلیہ (جو براہمداغ بگٹی کی بہن تھیں) اور بیٹی کو نامعلوم افراد نے قتل کر دیا جس کا الزام انھوں نے ایجنسیوں پر ڈالا۔

ہوئے، کم از کم پچھلے نو سال سے میں خود بار بار اس بات کا اظہار اس ایوان میں، اس کی کمیٹیوں میں اور اس خصوصی کمیٹی میں جو بلوچستان پر بنائی گئی تھی، کر چکا ہوں۔ مجھے دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ جس طرح جنرل مشرف کے دور میں کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی، اسی طرح زرداری صاحب اور گیلانی صاحب کی اس حکومت میں بھی حالات بد سے بدتر ہو رہے ہیں۔ درحقیقت حکومت کی بے حسی مجرمانہ حدود میں داخل ہو چکی ہے۔

میں یہ بات بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری محترم بہن اور بیٹی کو اس طرح شہید کیا جانا وہاں کی کشمکش میں ایک صفاتی تبدیلی ہے۔ خدا کے لیے اسے غیر اہم نہ سمجھیے۔ اس معاملے پر جاگیے۔ پورا بلوچستان جل رہا ہے۔ میں یہ صاف کہنا چاہتا ہوں کہ یہ صرف بلوچستان کا مسئلہ نہیں، یہ پورے پاکستان کا مسئلہ ہے۔ یہ بگٹی خاندان ہی کا نہیں، یہ میرا اور آپ کا مسئلہ ہے۔ ہم سب کو اس میں پوری یکجہتی کے ساتھ صرف مذمت ہی نہیں بلکہ حکومت پر پورا پورا دباؤ استعمال کرنا چاہیے۔ حقائق سامنے آ رہے ہیں جو کہ صاف اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ کام 'اسٹیبلشمنٹ' کا ہے اور ان لوگوں کا ہے جو اپنی من مانی اس علاقے میں کر رہے ہیں۔ اگر اب بھی ان کے گریبانوں پر ہاتھ نہیں ڈالا جائے گا تو مجھے پتا نہیں کہ ہم کہاں پہنچیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ جیسا کہ میں نے آپ سے پہلے بھی درخواست کی تھی، میں بلوچستان کے مسئلے کی اس جہت کی طرف بھی توجہ مبذول کروں گا جس کی طرف حاصل بزنجو صاحب اور ہماری بہن نے ذکر کیا ہے۔ میرے پاس یہ رپورٹ موجود ہے۔ امریکی کانگریس کی خارجہ امور کمیٹی بلوچستان کے مسئلے کو ایک ایسا مسئلہ بنانا چاہ رہی ہے جو خدانخواستہ، خدانخواستہ، پاکستان کو توڑنے کی طرف لے کر جائے۔ جس مضمون کی بنیاد پر یہ بات کی گئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

> ''شاید ہمیں پاکستان سے بلوچستان کو علیحدہ کرنے کے لیے حمایت پر غور کرنا ہو گا تاکہ پاکستان میں انتہا پسند قوتوں کو کم کیا جا سکے''۔

امریکہ اسے واضح طور پر ایک سیاسی ہتھکنڈے کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور ہمارے اپنے اداروں کی جانب سے اس نوعیت کے واقعات اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا ہے۔ میں اس واقعے کی مذمت کرتا ہوں اور اس کی فوری تفتیش اور مجرموں کو پکڑنے کا مطالبہ کرتا ہوں۔ بلوچستان کے تمام لوگ جو اس وقت پاکستان سے دور ہیں، زخم زدہ ہیں، بغاوت کی طرف جارہے ہیں، ان سے بات چیت کرنا، گلے لگانا تمام جماعتوں کو مل کر یہ کام کرنا چاہیے۔ یہ وقت پاکستان کو بچانے کا ہے اور اس میں اگر ہم نے اپنا کردار ادا نہ کیا تو تاریخ ہمیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ (۸ فروری ۲۰۱۲ء)

- ۵ -

جناب چیئرمین! میں بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے اپنے خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ لاپتہ افراد کا مسئلہ وہ موضوع ہے جس پر یہ ایوان کم از کم چھ سال سے مسلسل اپنی آواز اٹھا رہا ہے۔ مجھے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ حکومت میں کوئی بھی ہو لیکن یہ آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی اور یہ بڑی خطرناک صورتحال ہے۔ اس لیے جناب چیئرمین! بڑی دردمندی کے ساتھ آپ سے اور حکومت کی تمام پارٹیوں سے میں یہ درخواست کرنا چاہتا ہوں کہ بلوچستان کے مسئلے کو اہمیت دیں۔ بلاشبہ فاٹا میں بھی آگ لگائی گئی ہے اور ملک کے اور حصوں میں بھی بدامنی ہے لیکن جو کیفیت مسلسل بلوچستان میں ہے وہ اب ایسی خطرناک صورت اختیار کر گئی ہے کہ میں اسے جمہوریت کے مستقبل اور ملک کی سالمیت دونوں کے لیے خطرہ دیکھ رہا ہوں۔ اس لیے بڑی دردمندی کے ساتھ یہ بات آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں اور اپنے بلوچ بھائیوں اور بہنوں کو بھی یقین دلاتا ہوں کہ یہ صرف بلوچستان کا مسئلہ نہیں ہے، میری نگاہ میں یہ پاکستان کا مسئلہ ہے، یہ ہم میں سے ہر ایک کا مسئلہ ہے اور کم از کم اس سینیٹ میں ہم صوبائی حدوں سے بالا ہو کر حکومت کو حق اور انصاف کی بنیاد پر اس مسئلے کے سلسلے میں ایک مؤقف اختیار کرنے کی دعوت دیں گے اور ان سے توقع رکھیں گے کہ وہ خواب غفلت سے بیدار ہوں گے اور فوری اقدام کریں گے۔

دوسری بات جناب چیئرمین! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ بلوچستان کا معاملہ قیام پاکستان سے آج تک مختلف شکلوں میں سامنے آتا رہا ہے لیکن بنیادی مسئلہ ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ بلوچستان کے لوگوں کو ان کا حق نہیں دیا گیا اور حق مانگنے کے مطالبے اور کوشش کا جواب قوت سے، گولی، بم اور میزائل سے دیا گیا۔ ایوب خان صاحب کے زمانے سے یہ معاملہ شروع ہوا ہے اور آج تک جاری ہے۔ کوئی بھی استثنیٰ نہیں ہے۔ ایوب صاحب کے بعد بھٹو صاحب کے زمانے میں فوجی کارروائی ہوئی، اور مشرف نے اس کو اپنی انتہا پر پہنچا دیا اور اس وقت کی حکومت ۱۴ مہینے ملنے کے باوجود اس معاملے میں کوئی مؤثر کوشش نہیں کر سکی۔

میں صاف طور پر کہنا چاہتا ہوں کہ بلاشبہ پاکستان کے دشمن جس میں ہندوستان اور خود امریکہ اور صیہونی قوتیں شامل ہیں، وہ وہاں ایک کردار ادا کر رہے ہیں لیکن ان کے کردار ادا کرنے کی وجہ ہماری غفلت، ہماری غلطیاں اور ہماری لاپروائیاں ہیں، اگر ہم حالات کو درست کرنے کے لیے مل جل کر بیٹھیں اور صحیح راستہ اختیار کریں تو ہمارے کسی دشمن کو یہ موقع نہیں ملے گا کہ وہ ہماری سرزمین کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کریں اور ہمیں بانٹ دیں یا تقسیم در تقسیم کی طرف دھکیلنے کی کوشش کریں۔ اس لیے اصل میں ہماری ذمہ داری دو طرفہ ہے۔ بلاشبہ بیرونی سازشوں سے نظر بچانا اور اس پر غور نہ کرنا حقیقت پسندی کے خلاف ہے لیکن یہ سمجھنا کہ ہر کوئی وہاں پر غدار یا دشمنوں کا آلہ کار ہے، صحیح نہیں ہے۔ ہمیں اسباب پر جانا چاہیے اور جناب چیئرمین! اس ایوان کے مختلف اراکین نے اور خصوصیت سے میرے رفقاء اور حزب اختلاف کے دیگر ارکان نے، واقعات کی نشاندہی کی ہے۔ تازہ ترین واقعہ تین بلوچی لیڈران کو بے دردی سے اغواء کر کے قتل کرنا ہے اور پھر کل دوبارہ تین مزید کے مارے جانے کی اطلاع آئی در حقیقت کوئی دن ایسا نہیں ہے کہ ایسی منحوس خبر نہ آتی ہو۔ لیکن میں ان تفاصیل میں جانے کی بجائے، جیسا کہ اس سے پہلے چیئرمین صاحب نے کہا تھا اپنی باقی گفتگو کو ان نکات پر مرکوز کرنا چاہتا ہوں کہ اس وقت کیا کرنے کی ضرورت ہے؟

جناب چیئرمین! پہلی بات یہ ہے کہ ہمیں اس بات کا کھلے دل اور ایمانداری سے

اعتراف کرنا چاہیے کہ فوجی کارروائی اور اس کے ساتھ ساتھ ایجنسیوں کی خفیہ کارروائیاں یہ دونوں اقدام بری طرح ناکام رہے ہیں۔ اس لیے سب سے پہلے ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ طاقت کا استعمال فوری طور پر روکا جائے کیونکہ فوجی اور خفیہ ایجنسیوں کی کارروائیاں ابھی تک بالکل ناکام رہی ہیں۔

جناب والا! دوسرا نکتہ میرا یہ ہے کہ حکومت کو فوری طور پر ان تمام عناصر سے، جو وہاں تنقید کر رہے ہیں اور جنھیں کونے سے اس طرح لگا دیا گیا ہے کہ وہ بندوق اٹھانے پر مجبور ہوئے ہیں، مذاکرات کی ضرورت ہے۔ سینیٹ اور قومی اسمبلی کی مشترکہ قرار داد[1] (۲۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء) میں یہ بنیادی اصول پیش کیا گیا ہے کہ سیاسی مسائل کا سیاسی حل ہے، فوجی حل نہیں، اس کے لیے اگر کوئی مقام ہے تو وہ صرف ایک وقتی تحفظ کے طور پر ہے، ایک حکمت عملی کی حیثیت سے نہیں ہے۔ اس لیے مذاکرات کا آغاز ہونا چاہیے۔ یوں دوسرا مطالبہ میرا یہ ہے کہ: حکومت فوری طور پر صوبے کے سیاسی اور معاشی مسائل کے حل کے لیے تمام متعلقہ قوتوں سے بات چیت کا عزم کرے۔

جناب والا! تیسری چیز یہ ہے کہ جن جرائم کا وہاں پر ارتکاب کیا گیا ہے، جن میں سیاسی کارکنوں کو شہید کرنا، انھیں بے گھر کرنا اور جائیداد کے نقصانات کرنا وغیرہ شامل ہیں ان سب کے بارے میں ذمہ داران کا تعین ہو اور ان کو قانون کے مطابق قرار واقعی سزا دی جائے۔ جب تک ہم احتساب اور مجرموں کی گرفت کا راستہ اختیار نہیں کرتے ہم جرائم کی روک تھام نہیں کر سکتے... ہم معاف کیے جاتے ہیں اور NROs کے ذریعے لوگوں کو احتساب کی گرفت سے نکالتے جاتے ہیں، لیکن جناب والا! یہ تباہی کا راستہ ہے اصلاح کا راستہ نہیں۔

اس لیے جناب والا! میں تیسرا نکتہ یہ اٹھاتا ہوں کہ اب اکبر بگٹی کے بہیمانہ قتل سے لے کر تین بلوچ رہنماؤں کے حالیہ اغوا اور قتل تک کے تمام سیاسی قتل اور اغوا کے تمام

---

[1] قرار داد کا مکمل متن اس تقریر کے اختتام پر ملاحظہ کیجیے۔

معاملات کی تحقیقات کے لیے سپریم کورٹ کے جج کی سربراہی میں عدالتی کمیشن کا قیام [کیا جائے] جنرل (ر) پرویز مشرف اور ان جرائم کے مرتکب تمام افراد کے خلاف مقدمہ چلا کر کے قانونی کارروائی کے ذریعے سزا دی جانی چاہئے۔

میرا پُرزور مطالبہ یہ ہے کہ عدالتی تحقیقات ہوں، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کیا جائے جنہیں قتل کیا گیا ہے، شہید کیا گیا ہے۔ لوٹا گیا ہے، دربدر کیا گیا ہے ان کے معاملات کی تحقیق ہو اور جو آج بھی لاپتہ ہیں ان کی خبر لائی جائے۔ پھر جو افراد اس کے ذمہ دار تھے، فیصلہ کرنے والے، ہدایات دینے والے اور جنہوں نے عمل کیا ہے انہیں قانون کے مطابق سزا دی جائے۔

میرا چوتھا مطالبہ یہ ہے کہ تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے اور لاپتہ افراد کو تلاش کیا جائے۔ جناب والا! یہ بڑا اہم مسئلہ ہے گو اس معاملے میں جو اعداد و شمار پیش کیے جارہے ہیں ان میں اختلاف ہے۔ حکومت کے نمائندوں نے یہ کہا ہے کہ دو ڈھائی سو افراد ہمارے پاس ہیں۔ بلوچستان کے لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ ایک ہزار سے زیادہ افراد لاپتہ ہیں۔ معلوم نہیں وہ قید میں ہیں، نجی قید خانوں میں ہیں یا ان کو اور کہیں لے جایا گیا ہے۔ تعداد کے اس اختلاف سے قطع نظر ایک ایک فرد قیمتی ہے اور ان تمام افراد کو جو قید میں ہیں، نظر بند ہیں یا اغواء شدہ ہیں، فوری تلاش کر کے پیش کیا جائے۔

پانچویں چیز یہ ہے کہ: ۲۰۰۴ء اور ۲۰۰۹ء کے دوران بے گھر ہوئے تمام لوگوں کی بحالی کے لیے مناسب انتظامات اور تمام متاثرین کو مناسب معاوضہ کی ادائیگی کا اہتمام کیا جائے۔

جس طرح یہ اصول سوات اور باجوڑ کے لیے مانا گیا ہے اسی طرح یہ اصول بلوچستان کے لیے مانا جانا چاہیے۔ جتنے افراد بھی بے گھر ہیں اور جو نقصانات ہوئے ہیں یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ان کو معاوضہ ادا کرے اور دوبارہ آباد کرے۔

میرا چھٹا نکتہ زیادہ بنیادی ہے اور وہ یہ ہے کہ: صوبے کے معدنیات اور توانائی کے وسائل کا اس طرح انتظام کیا جائے کہ صوبے کے عوام ان کے ترجیحی طور پر فائدہ اٹھانے والے بن جائیں اور اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ قیمتوں اور رائلٹی کی ادائیگی کو صوبے کے حقوق اور ضروریات کی تکمیل کو یقینی بنانے کے لیے ایکوئٹی کے ساتھ ادائیگی کی جائے۔

جناب چیئرمین! مجھے یہ بات کہنے کی اجازت دیجیے کہ بلوچستان کے معدنی وسائل سے پورے ملک نے فائدہ اٹھایا ہے لیکن بلوچستان کے لوگ اس گیس اور توانائی کے فوائد سے محروم رہے جو ان ہی کے علاقوں سے پورے ملک کو فراہم کی جارہی ہے۔ حد یہ ہے کہ جو رائلٹی وہاں دی جارہی ہے ملک میں دوسری جگہوں پر گیس اور توانائی کی رائلٹی کی شرح اس سے مختلف ہے۔ بلوچستان کو جہاں سترہ روپے فی یونٹ دیے جارہے ہیں وہیں اس ملک کے دوسرے حصوں میں ایک سو بیس روپے تک فی یونٹ رائلٹی دی جارہی ہے یہ تفریق کیوں ہے۔ اس لیے میں مطالبہ کرتا ہوں کہ گیس سے بھی وہاں کے لوگ فائدہ اٹھائیں اور اور رائلٹی سب کو حق کے مطابق دی جائے۔ ہر ایک کو اس کا حق ملے۔

جناب والا! میرا ساتواں نکتہ بھی اسی تسلسل میں ہے کہ: صوبے کے لیے باہمی مشورے سے روزگار کی فراہمی، اقتصادی ترقی کے لیے بنیادی ڈھانچے، تعلیم کے فروغ، پیشہ ورانہ تربیت اور صحت کی سہولیات میں اضافے اور فراہمی کے لیے خصوصی منصوبے تیار کیے جائیں۔

یہ بنیادی اسباب اور ان کے حل کی تجاویز ہیں۔ میں نے آغاز کیا طاقت کے استعمال کو روکنے سے اور قانون کی حکمرانی اور مجرموں کی گرفت سے، لیکن اس کے ساتھ ہی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اس کے بعد جب تک آپ بنیادی افلاس دور نہیں کریں گے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ اس لیے میرا اگلا نکتہ یہ ہے کہ ایسا پیکج جس کے ذریعے سے وہاں روزگار پیدا ہوسکے اس کا اہتمام کیا جائے۔ تعلیم اور فنی تربیت کے ذریعے سے وہاں کے نوجوانوں کو اس لائق بنایا جائے کہ وہ عزت سے زندگی گزار سکیں۔

میرا آٹھواں نکتہ اس چیز کے متعلق ہے جس کے بارے میں ہم اس ایوان میں چیخ چیخ کر تھک گئے کہ جو کوٹہ مرکزی حکومت اور کارپوریشنوں کی ملازمتوں میں مقرر کیا گیا ہے اس پر عمل کیا جائے۔ پہلے وہ ساڑھے تین فیصد تھا جو ناکافی تھا پھر اس کو بڑھا کر ۵ پلس کیا گیا۔ میں چاہتا ہوں کہ اس نظر ثانی کوٹہ کے مطابق مرکز کے تمام شعبوں میں اور سرکاری کارپوریشنز میں بلوچستان کے لوگوں کو واقعی ملازمت دی جائے۔ ماضی میں اس حوالہ سے جو کمی رہی اسے بھی چھ سے بارہ مہینے کے اندر اندر پورا کیا جائے۔ اگر ہم اس ایک کام کو بھی کر لیں تو وہاں کے لوگوں کو احساس ہو گا کہ ہمارا جو حق مارا گیا ہے اب ہمیں حق مل رہا ہے۔

میرا نواں نکتہ دستوری اصلاحات کے بارے میں ہے۔ میرے کچھ اور ساتھیوں نے بھی یہ بات کی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آ گیا ہے کہ دستوری اصلاحات کی جائیں۔ مشترکہ فہرست کو ختم کرنا، وفاقی فہرست پر نظر ثانی کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی عملی ضمانت کہ جو وزارتیں اور جو شعبے صوبے کے پاس ہونے چاہئیں انہیں عملاً مرکز سے وہاں منتقل کیا جائے۔ مرکز کے اندر کم از کم ۱۴ وزارتیں ایسی ہیں جن کے یہاں ہونے کا کوئی معقول جواز نہیں۔ انہیں صرف اور صرف صوبے میں ہونا چاہیے۔

میرا دسواں نکتہ قومی مالیاتی ایوارڈ کے بارے میں ہے کہ: این ایف سی ایوارڈ کا اعلان سن ۲۰۱۰-۲۰۰۹ء کے بجٹ سے پہلے کیا جائے اور اس میں صوبوں کے درمیان ایکوئٹی اور ترقیاتی ضروریات پر مبنی وسائل کی تقسیم کو یقینی بنایا جائے۔ اس صوبے میں اس کی آبادی کے ساتھ ساتھ ترقیاتی حالت اور خدمات کی متعلقہ لاگت کی حالت کے پیش نظر ترمیم شدہ فارمولے کے تحت وسائل کی تقسیم کو یقینی بنائیں۔

جناب والا! یہ ایک بڑا بنیادی مسئلہ ہے کہ قومی مالیاتی ایوارڈ میں آبادی کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے۔ آبادی بلاشبہ ایک اہم عامل ہے لیکن دوسرے عوامل جس میں غربت ہے، جس میں پسماندگی ہے اور جس میں جغرافیہ ہے انھیں بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ میں یہ سوال اٹھاتا ہوں کہ ایک سکول، ایک ہسپتال اور ایک بستی کو آباد کرنے کے

لیے پنجاب میں جتنے ذرائع چاہیے ہیں اگر بلوچستان کے وسیع علاقے کی وجہ سے وہاں اس سے زیادہ چاہیے تو آخر اس کا خیال کیوں نہ رکھا جائے۔ اس لیے بجائے اس کے کہ آنکھیں بند کر کے آپ مالیاتی ایوارڈ تقسیم کریں آپ یہ دیکھیے کہ یہ سروسز اس صوبے میں فراہم کرنے کے لیے کتنی لاگت آتی ہے اور اس لاگت کی روشنی میں پھر رقوم مختص ہوں۔ یہ عدل کے مطابق ہو گا ورنہ آپ مکھی پر مکھی ماریں گے اور حق ادا نہیں ہو گا۔

جناب والا! یہ دس مثبت تجاویز میں دیتا ہوں جن میں سے کچھ فوری، کچھ قانونی اور دستوری اور کچھ درمیانے اور طویل مدت ترقیاتی ہیں۔ یہ تمام اگر ہم اختیار کریں گے تو بلوچستان کے مسئلے کا حل ممکن ہے۔ میری درخواست ہے کہ حکومت اس پر سنجیدگی سے غور کرے اور پوری قوم حکومت کو مجبور کرے کہ وہ بلوچستان کی عوام کے ساتھ انصاف کرے۔ ان کا حق ادا کرے۔ ان کا حق ان کو دے اور دشمن جو فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں اس کو کامیاب نہ ہونے دیں۔ (۲۰۔ اپریل ۲۰۰۹ء)

## پارلیمنٹ کے بند کمرہ مشترکہ اجلاس کے اختتام پر منظور کی گئی متفقہ قرارداد

## (۲۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء)

پارلیمنٹ کے اس بند کمرہ مشترکہ اجلاس میں بڑی تشویش سے یہ بات نوٹ کی گئی کہ تشدد پسندی، عسکریت پسندی اور دہشت گردی کی تمام صورتیں اور جہتیں ملک کی سالمیت اور استحکام کے لیے سنگین خطرہ ہیں۔ یہ بات باور کرائی گئی کہ ماضی کے مطلق العنان حکمرانوں کی پالیسیوں کا مقصد قومی مفاد کی قیمت پر اپنے ذاتی اختیارات کو دوام بخشنا تھا۔

اس ایوان نے، اس مسئلے پر جامع اور وسیع پیمانے پر سوچ بچار کی ہے۔ لہٰذا اس تناظر میں، قوانین کی تیاری، اداروں کی تشکیل، اپنے شہریوں کو تشدد سے تحفظ فراہم کرنے، دہشت گردی کو جڑ سے ختم کرنے، اپنی معیشت میں نئی روح پھونکنے اور نقصانات کی تلافی کے لیے مواقع پیدا کرنے کے لیے ہم سب حسب ذیل کی پابندی کریں گے۔

۱۔ کہ ہمیں اپنی قومی سلامتی کی اسٹریٹجی کا فوری جائزہ لینے اور ایک آزاد خارجہ پالیسی کی تشکیل کے ذریعے خطے اور پاکستان کی سالمیت اور امن قائم کرنے کے لیے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے لائحہ عمل پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

۲۔ عسکریت پسندی اور انتہا پسندی کے خطرات کو تمام اسٹیک ہولڈروں سے مذاکرات کے ذریعے اتفاق رائے پیدا کر کے دور کیا جانا چاہیے۔

۳۔ قوم اس بڑھتے ہوئے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے دہشت گردی کی تمام صورتوں اور جہتوں کی عوامی پیغام کے ذریعے سختی سے مذمت کرتے ہوئے بشمول بڑھتی ہوئی فرقہ واریت سے نفرت اور تشدد کو مضبوط ارادہ کے ساتھ نمٹنے اور اس کے بنیادی اسباب کا تدارک کرنے کے لیے متحد ہے۔

۴۔ پاکستان کی خودمختاری اور علاقائی سالمیت کا ہر صورت تحفظ کیا جائے گا۔ قوم اپنے ملک پر ہر قسم کے حملوں اور چڑھائی کے خلاف متحد ہے اور حکومت کے ساتھ اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے بھرپور طور پر تیار ہے۔

۵۔ پاکستان کے علاقے کسی بھی ملک پر کسی بھی قسم کے حملے کے لیے استعمال نہیں کیے جائیں گے اور غیر ملکی جنگجو اگر پائے گئے تو وہ ہماری زمین سے بے دخل کر دیے جائیں گے۔

۶۔ اس وقت شورش کے انصرام و حل کے اہم ذریعہ کے طور پر مذاکرات کو ان تمام عناصر کے ساتھ اوّلین ترجیح دی جائے گی جو پاکستان کے دستور اور قانون کی حکمرانی کی پابندی کرنے کے لیے رضامند ہیں۔

۷۔ قبائلی علاقوں اور صوبہ سرحد (پختونخوا) میں خصوصی طور پر شورش زدہ علاقوں میں امن قائم کر کے وہاں نئی معاشی سرگرمیوں کے ساتھ امن قائم کیا جائے گا تاکہ کم مراعات یافتہ علاقوں کو پاکستان کے دیگر علاقوں کے برابر لایا جاسکے۔

۸۔ بلوچستان کے لوگوں کی محرومیوں کا ازالہ کیا جائے گا اور وسائل کی دوبارہ تقسیم کے لیے کام کو تیز کیا جائے گا۔

۹۔ مملکت قانون کی حکمرانی قائم کرے گی اور جہاں لوگوں کی جان و مال کا تحفظ یقینی بنانا ہو وہاں پہلے خبردار کیا جائے گا تاکہ شورش زدہ علاقوں میں بے گناہ جانی نقصان سے بچا سکے۔

۱۰۔ جمہوری عمل، سماجی انصاف، مذہبی اقدار، تحمل اور صوبوں کے درمیان ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق وسائل کی منصفانہ تقسیم کے ذریعے وفاق کو مضبوط بنایا جائے گا۔

۱۱۔ حکومت شورش زدہ علاقوں میں اپنی عمل داری یقینی بنائے گی اور اس مقصد کے حصول کے لیے مقامی آبادی (جرگہ) اور روایتی اقدامات کے ذریعے اعتماد سازی کا نظام تیار کیا جائے گا اور فوج کو جلد از جلد واپس بلا کر قانون نافذ کرنے والی سول ایجنسیوں کو بہتر استعداد کار کے ساتھ وہاں بھیجا جائے گا اور پائیدار سیاسی نظام مشاورتی عمل کے ذریعے حاصل کیا جائے گا۔

۱۲۔ مغربی اور مشرقی سرحدوں سے تجارت اور علاقائی امن کے فروغ کے معاملات میں پاکستان کے دفاعی مفادات کی حفاظت کی جائے گی۔

۱۳۔ داخلی سلامتی کے لیے نظام کو ادارہ جاتی بنایا جائے گا۔ اور جاں بحق ہونے والوں کے لیے معاوضے کی ادائیگی اور گھروں سے نقل مکانی کر جانے والے متاثرین کی جلد واپسی، ملک بھر میں

دہشت گردی کے اثرات، میڈیا اور مذہبی شراکت داری کے ذریعے دہشت گردی کے خلاف عوام کو متحد کیا جائے گا۔

۱۴۔ اس قرارداد میں دیے گئے طریقہ کار اور تیار کیے گئے اصولوں پر عمل درآمد کی نگرانی، رہنمائی کی فراہمی اور وقتاً فوقتاً جائزہ کے لیے پارلیمنٹ کی خصوصی کمیٹی تشکیل دی جائے گی۔ یہ ایوان اسپیکر کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ دونوں ایوانوں کے پارلیمانی قائدین کے ساتھ مشاورت کر کے مذکورہ کمیٹی تشکیل دیں۔ کمیٹی اپنے قوانین خود اپنے اجلاس میں بنائے گی۔

# بلوچستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل پر
# پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ (تلخیص)

۲۰۰۴-۲۰۰۳ء کے دوران بلوچستان میں امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورتحال اور سخت سیاسی مطالبات کے سبب تشویش پیدا ہو گئی تھی جس سے اس صوبے میں بڑھتے ہوئے احساس محرومی کی بناء پر بلوچستان کے عدم استحکام کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ان چیلنجوں کا جواب دینے اور ہم آہنگی اور امن کو فروغ دینے کے جذبے کے تحت، سابق وزیر اعظم چوہدری شجاعت حسین نے ۲۳ ستمبر ۲۰۰۴ء کو سینیٹ میں اعلان کیا تھا کہ بلوچستان کے مسائل پر تبادلہ خیال کرنے اور حالات سدھارنے کی راہیں تلاش کرنے کے لیے ایک کمیٹی برائے بلوچستان تشکیل دی جائے گی۔ اسی کے پیش نظر سینیٹ کی جانب سے "بلوچستان اور بین الصوبائی ہم آہنگی کا جائزہ لینے کے لیے" کمیٹی کی تشکیل کی قرارداد منظور کی گئی۔ کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ:

> "بلوچستان کی موجودہ صورتحال کا جائزہ لیا جائے اور اس پر سفارشات پیش کی جائیں اور بین الصوبائی ہم آہنگی کو فروغ دینے اور فیڈریشن کو مضبوط بنانے کے مقصد سے صوبوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے سفارشات دی جائیں"۔

کمیٹی کو پابند کیا گیا تھا کہ وہ اپنی تشکیل کے ۹۰ دن کے اندر اپنی رپورٹ پیش کرے۔ چودھری شجاعت حسین کی سربراہی میں یہ کمیٹی ۲۹ ستمبر ۲۰۰۴ء کو تشکیل دی گئی تھی، جس میں ۲۹ ممبران شامل تھے۔ بعد میں ۹ مزید ارکان کو شامل کیا گیا، جس سے مجموعی تعداد ۳۸

ہوگئی۔ کمیٹی میں ۲۶ سینیٹرز اور ۱۲ ایم این اے شامل تھے جن کو سیاسی جماعتوں کی وسیع نمائندگی کی بنیاد پر منتخب کیا گیا، اس میں بلوچستان سے ممبروں کو بھی مناسب نمائندگی دی گئی۔

اس کمیٹی کو بعد میں دو ذیلی کمیٹیوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ سینیٹر مشاہد حسین سیّد کی سربراہی میں ایک کمیٹی کو بلوچستان کی موجودہ صورتحال کا جائزہ لینے اور مناسب سفارشات پیش کرنے کا پابند کیا گیا ہے، دوسری ذیلی کمیٹی سینیٹر وسیم سجاد کی سربراہی میں تھی جس کے دائرہ کار میں ''بین الصوبائی ہم آہنگی کو فروغ دینا اور صوبوں کے حقوق کے تحفظ اور وفاق کو مضبوط بنانے کے لیے سفارشات پیش کرنا تھا''۔

موجودہ صورتحال پر پارلیمنٹری سب کمیٹی نے جو ۱۹ ممبران پر مشتمل تھی، جن میں سے ۵ ایم این اے تھے اکتوبر، ۲۰۰۴ء میں اپنا کام شروع کیا اور اس کے ۷۔ اجلاس ہوئے، جن میں سے ۳ کوئٹہ اور دو گوادر میں منعقد ہوئے۔

سب کمیٹی نے تمام متعلقہ وفاقی اور صوبائی حکام اور سیاسی جماعتوں کے مقامی رہنماؤں کے ساتھ تفصیلی اور ٹھوس بات چیت کی تاکہ مسائل کو بہتر طور پر سمجھنے اور ان کے حل کے لیے اقدامات تجویز کر سکے۔ کمیٹی کی کارروائی کو تیزی سے مکمل کرنے کے لیے کمیٹی کے چیئرمین چوہدری شجاعت حسین نے سب کمیٹی کو رپورٹ مکمل کرنے کے لیے ۷ جنوری ۲۰۰۵ء کی حتمی تاریخ دی۔ بات چیت کو آسان بنانے اور ایک خاص فریم ورک کی فراہمی کے لیے مسائل کی ایک چیک لسٹ تیار کی گئی تاکہ کمیٹی کی کارروائی کے دائرہ کار اور پیرامیٹرز کا تعین کیا جاسکے۔

اس کام کا آغاز سینیٹر ثناء اللہ بلوچ کی بلوچستان کی موجودہ صورتحال پر ایک تفصیلی پریزنٹیشن سے ہوا جس میں صوبے کو درپیش سیاسی، سماجی اور معاشی امور کا احاطہ کیا گیا۔ پریزنٹیشن کو ایک ورکنگ پیپر کے طور پر اپنایا گیا تھا اور اس کی کاپیاں متعلقہ صوبائی اور وفاقی حکام اور ممبروں کو تبصرے/آراء اور سرکاری جوابات حاصل کرنے بھیجی گئیں۔

مسائل کی پیچیدگی اور معاملات کی نازک نوعیت کے پیش نظر یہ ضروری سمجھا گیا کہ انھیں زمینی حقائق کے سیاق وسباق اور تناظر میں پیش کیا جائے۔

بلوچستان کا کل رقبہ ۱۹۰،۷۳۴ مربع کلومیٹر ہے اور اس کی مجموعی آبادی ۹۸ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۵ء۶ ملین ہے۔ فی مربع کلومیٹر آبادی ۱۹ افراد پر مشتمل ہے۔ اس میں ۲۷ اضلاع اور ۷۰۷ کلومیٹر سے زیادہ کا ساحل ہے۔ یہ صوبہ وسائل کی قلت کا شکار ہے اور اس کی آمدنی صرف ایک ارب ۶۰ کروڑ روپے ہے جس سے صرف سرکاری افسران کی ماہانہ تنخواہ ادا کی جاسکتی ہے۔ لہٰذا صوبہ کا انحصار فیڈرل گورنمنٹ کی جانب سے ۲۷ ارب روپے کی گرانٹ پر ہے، اور اس طرح ۵ء۱۵ بلین روپے کا خسارہ ہے۔

سماجی شعبوں میں بھی، بلوچستان ملک کی اوسط سے بہت پیچھے ہے۔ اس کی خواندگی کا تناسب ۶ء۲۶ فیصد ہے جب کہ قومی اوسط ۴۷ فیصد ہے۔ پاکستان کے ۸۶ فیصد کے مقابلے میں بلوچستان کے صرف ۲۰ فیصد افراد کو صاف پانی میسر ہے۔ صوبے کی آبادی کا ۴۷ فیصد خط غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔ صوبے میں سیکورٹی اور ترقی سے متعلق مختلف امور کا جائزہ لینے کے لیے، وفاقی سیکرٹریوں کو اپنے شعبوں سے متعلق رپورٹس پیش کرنے کے لیے کمیٹی میں طلب کیا گیا۔

سیکرٹری پٹرولیم اور قدرتی وسائل نے صوبے میں معدنیات، گیس اور تیل کی تلاش اور ان میں بلوچستان کے حصہ سے متعلق سوالات کے جواب دیے۔ انہوں نے بلوچ نمائندوں کی جانب سے پیش کردہ مختلف مطالبات کے جوابات متعلقہ حقائق اور اعداد و شمار اور وفاقی حکومت کی پالیسیوں کی روشنی میں دیئے۔ سینیٹر ثناء اللہ بلوچ نے مطالبہ کیا تھا کہ آئین میں ترمیم کے ذریعے زیر زمین وسائل کی تلاش اور استعمال لیز پر دینے کے اختیارات صوبوں کو دیئے جائیں۔ انہوں نے رائلٹی میں اضافے کا مطالبہ کیا اور آئین کے آرٹیکل ۵۸ کا حوالہ دیتے ہوئے مطالبہ کیا کہ صوبے کی ضرورتوں کو ترجیح دی جائے۔ یہ بھی تجویز کیا گیا کہ جہاں تیل کا کنواں واقع ہو اس صوبے اور کمپنی کے مابین ایکسپلوریشن کے معاہدے پر دستخط

کیے جائیں اور اسی دوران رائلٹی میں اضافے پر اتفاق کیا جائے۔ سیکرٹری پٹرولیم نے بتایا کہ بین الاقوامی طرز عمل کے مطابق پیداوار پر بطور رائلٹی ۱۲٫۵ فیصد ادا کی جاتی ہے۔ کمیٹی نے وسائل کی تلاش اور تقسیم سے متعلق امور پر تفصیلی ریکارڈ طلب کیا۔

ایڈیشنل سیکرٹری خزانہ نے کمیٹی کو بتایا کہ سابقہ این ایف سی ایوارڈ جس پر ۱۹۹۷ء میں دستخط ہوئے تھے، نیا ایوارڈ آنے تک جاری رہے گا۔ فیڈریشن اور صوبوں کے مابین آمدنی کی تقسیم کا تناسب ۲۰-۸۰ تھا، لیکن اب اسے کم کر دیا گیا ہے۔

سیکرٹری پورٹس اینڈ شپنگ نے گوادر پورٹ اتھارٹی (جی پی اے) جو اکتوبر، ۲۰۰۴ء میں قائم کی گئی تھی، سے متعلق کمیٹی کو بریفنگ دی۔ انہوں نے بتایا کہ بلوچستان سے تین ممبران کو جی پی اے کے بورڈ میں نامزد کیا گیا تھا لیکن ابھی تک کسی نے بھی کسی اجلاس میں شرکت نہیں کی۔ گوادر میں ایک خصوصی اقتصادی زون قائم کیا جائے گا جس سے مقامی لوگوں کو فائدہ پہنچے گا۔

ممبران نے تجویز پیش کی کہ گوادر کی ضلعی حکومت کو پورٹ کی آمدنی کا ایک مخصوص حصہ دیا جائے۔ اسی طرح سینڈک کاپر فیلڈ کی آمدنی کا ۲۵ فیصد بلوچستان کو جانا چاہیے۔ یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ بندرگاہوں کو صوبائی عملداری میں جانا چاہیے اور پابند کیا جائے کہ بی پی ایس ۱-۱۵ میں صرف مقامی افراد کی خدمات حاصل کی جائیں اور مقامی لوگوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے مناسب قانون سازی کی جائے۔

مینجنگ ڈائریکٹر گوادر پورٹ اتھارٹی نے بتایا کہ جب بندرگاہ پر کام شروع ہو جائے گا تو اسے ایک نجی پورٹ آپریٹر چلائے گا، جیسا کہ جدید ممالک میں ہوتا ہے۔

سیکرٹری دفاع نے تین امور پر بریفنگ دی: (۱) چھاؤنیوں کا قیام۔ (۲) دفاعی افواج کو الاٹ کی گئی زمین۔ (۳) بلوچستان میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کا کردار۔ اس لیے فوجی سامان کی نقل و حمل کی ضرورت کی بنا پر گوادر، ڈیرہ بگٹی اور کوہلو میں چھاؤنیوں کے مجوزہ قیام کا جواز ہے، کمیٹی

ممبران نے دفاعی افواج کے ذریعہ اراضی کے حصول سے متعلق اپنے تحفظات کا اظہار کیا اور اس موضوع پر مزید تفصیلات طلب کیں۔ چونکہ صوبہ میں کسی بھی نقل و حرکت کے لیے فاصلے بہت زیادہ ہیں۔ انہوں نے دفاعی افواج کے مختلف شعبوں کو زمین کی الاٹمنٹ کی تفصیلات بھی بتائیں۔

انٹیلی جنس ایجنسیوں کے کردار کے حوالے سے انہوں نے، اس دعوے کی تردید کی کہ یہ ایجنسیاں کوئی سیاسی کردار ادا کر رہی ہیں۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے کردار کے حوالے سے انسپکٹر جنرل فرنٹیئر کانسٹیبلری بلوچستان نے ایک پریزنٹیشن دی جس میں اداروں کے مینڈیٹ کی وضاحت کی گئی پریزنٹیشن میں درج ذیل موضوعات شامل تھے۔

- ایران اور افغانستان کے ساتھ سرحدوں کی حفاظت۔
- امن و امان کی بحالی
- منشیات کی اسمگلنگ کی روک تھام اور گوادر کی سیکورٹی جو آئی جی ایف سی کو سونپی گئی ہے۔

ایف سی ڈیرہ بگٹی میں پی پی ایل اور او جی ڈی سی کے گیس کمپریشن پلانٹوں اور خطے کے دیگر اداروں کی حفاظت کی بھی ذمہ دار ہے۔ ایف سی نے قبائلی جھگڑوں اور فرقہ وارانہ جھڑپوں میں بھی امن برقرار رکھا ہے۔ صرف کوئٹہ میں مذہبی انتہا پسندوں کی کارروائیوں میں ۱۲۱ ہلاک اور ۱۵۰ زخمی ہوئے تھے۔ کمیٹی کو ایف سی کی تاریخ، تنظیمی ڈھانچے، قبائلی ساخت، سرحدی دستوں، داخلی سیکورٹی پر مامور دستوں کی تعیناتی سے متعلق بھی آگاہ کیا گیا۔

سینیٹر ثناء اللہ بلوچ نے شکایت کی کہ بلوچستان کو مسلح افواج میں مناسب نمائندگی نہیں دی گئی۔ تاہم ڈی جی ایف سی نے بتایا کہ ایف سی میں بلوچستان کی نمائندگی آبادی کے تناسب سے ۲۴ فیصد زیادہ ہے۔ سینیٹر بلیدی نے بتایا کہ ۳۴۲ چیک پوسٹیں ہیں اور لوگ ایف سی کو دوستانہ طاقت نہیں سمجھتے۔ آئی جی ایف سی نے جواب دیا کہ اینٹی اسمگلنگ کردار کی وجہ سے ایف سی کو مخالفانہ ادارہ سمجھا جاتا ہے۔ سینیٹر مہیم خان نے تجویز پیش کی کہ

ایف سی کا انتظام مقامی لوگوں کے حوالے کیا جائے۔ تمام چیک پوسٹوں کو ختم کیا جائے اور کسٹم ایکٹ کے تحت اختیارات واپس لیے جائیں۔ سینیٹر ثناء اللہ نے پنجاب رینجرز کی طرز پر ایف سی کی تنظیم نو کی سفارش کی۔

ڈائریکٹر جنرل کوسٹ گارڈز نے کمیٹی کو اپنی فورس کے کردار، کام اور کارکردگی سے آگاہ کیا۔ کوسٹ گارڈ انسداد سمگلنگ کی واحد ایجنسی ہے جو ۹۶۰ کلومیٹر کے ساحلی پٹی کی نگرانی کرتی ہے۔ قانون کے تحت کوسٹ گارڈز کے اہلکاروں کو پولیس اور کسٹم کے اختیارات سونپے گئے ہیں۔

سینیٹر مشاہد حسین سید نے کہا کہ ہماری انسداد اسمگلنگ پالیسی ناکام ہو چکی ہے اور انسداد اسمگلنگ سے نمٹنے والی قوتوں کو صرف منشیات، اسلحہ کی اسمگلنگ کی روک تھام کرنی چاہیے۔ سینیٹر ثناء اللہ بلوچ نے کہا کہ آئین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کوسٹ گارڈز نے بلوچستان میں ۹۱ چیک پوسٹ قائم کی ہیں۔ یہ چیک پوسٹیں ایف سی کی ۴۹۳ پوسٹوں کے علاوہ ہیں۔

سیکرٹری داخلہ بلوچستان نے صوبے میں امن وامان کی صورتحال پر بریفنگ دی، بلوچستان کی افغانستان کے ساتھ ۱۲۰۰ کلومیٹر اور ایران کے ساتھ ۹۶۰ کلومیٹر سرحد مشترکہ ہے اور ۷۷۰ کلومیٹر کا ساحلی علاقہ ہے۔ اس کی آبادی ۴۵ فیصد بلوچ، ۳۸ فیصد پختون اور ۱۷ فیصد دیگر قومیتوں پر مشتمل ہے۔ بلوچستان میں ۲۷ اضلاع، ۸۹ تھانہ جات اور ۲۸۶ لیویز کے تھانے ہیں۔ پولیس کی منظور شدہ نفری ۱۹۱۴۵ اور لیویز کی نفری ۱۳۳۵۷ ہے۔ صوبے کو 'اے' اور 'بی' علاقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ 'اے' علاقے شہروں اور قصبوں پر مشتمل ہیں اور یہ پولیس کے دائرہ اختیار میں ہے۔ 'بی' علاقے لیویز کے دائرہ اختیار میں ہیں۔

کمیٹی کے اجلاس میں سیاسی جماعتوں کو اپنے تاثرات دینے کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ پختون خوا ملی عوامی پارٹی نے مطالبہ کیا ہے کہ گوادر میگا پراجیکٹس کے حوالے سے تمام سیاسی، قانونی اور انتظامی فیصلوں کا اختیار اور اس کی تمام تر آمدنی صوبے کو دی جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ نئی چھاؤنیوں کی تعمیر کا فیصلہ واپس لیا جائے۔

چار پارٹی بلوچ اتحاد کے نمائندہ نے کہا کہ گوادر میگا پروجیکٹس پر کام اورزیر التواء فزیبلٹی اسٹڈی روک دی جائے، اور اس سے منسلک نئی چھاؤنیوں کے قیام کے منصوبے کو روکا جائے۔ قدرتی وسائل پر صوبے کا حق تسلیم کیا جائے اور بلوچستان میں تمام فوجی فورسز کو روکا جائے اور تمام پیرا ملٹری فورس واپس بلائی جائے۔ ایم ایم اے نے تجویز پیش کی کہ صرف آبادی کی بنیاد پر وسائل کی تقسیم کے معیار کو تبدیل کیا جائے اور وسائل کی تقسیم کی شرائط میں علاقہ کی وسعت اور ترقی کی ضروریات کو شامل کیا جائے۔ بلوچستان کو گیس کی رائلٹی دوسرے صوبوں کے برابر دی جائے۔

نیشنل پارٹی نے میگا پروجیکٹس کے نام پر بیرونی افراد کو بلوچستان میں آباد کرنے کی مخالفت کی۔ جمہوری وطن پارٹی نے سوئی، کوہلو اور گوادر میں چھاؤنیوں کے قیام کی مخالفت کی۔ کمیٹی نے دو دن گوادر کا دورہ کیا۔ گوادر کے ضلعی ناظم نے ترقی کے تمام شعبوں کے حوالے سے متعدد تجاویز پیش کیں۔ انہوں نے گوادر پورٹ اتھارٹی اور گوادر ترقیاتی اتھارٹی میں گریڈ ۱ تا ۱۵ اسامیوں پر مقامی افراد کو ملازمت دینے پر زور دیا اور ناظم کو مزید اختیارات اور فنڈز دینے کا بھی مطالبہ کیا۔

چیئرمین گوادر پورٹ اتھارٹی نے منصوبے کی پیشرفت کے بارے میں تفصیلی بریفنگ دی۔ انہوں نے بتایا کہ پورٹ مکمل ہونے پر ۳۰،۰۰۰ ڈبلیو ٹی ٹرک کیریئرز اور ۲۵،۰۰۰ ڈی ڈبلیو ٹی کنٹینرز جہازوں کو سہولت مہیا کریں گے۔ اس منصوبے میں دو مراحل میں ۶۰۰ ملین کی سرمایہ کاری شامل ہے۔

گوادر ڈویلپمنٹ اتھارٹی سے متعلق بریفنگ اس کے چیئرمین نے دی۔ یہ منصوبہ مارچ، ۲۰۰۲ء میں شروع ہوا، اور جی ڈی اے اکتوبر، ۲۰۰۳ء میں قائم کیا گیا تھا۔ ۱۹۵۰۰ ایکڑ رقبے کو رہائشی مقاصد کے لیے ۲۰۰ ایکڑ تجارتی اور ۲۱۰ ایکڑ تفریحی مقاصد کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ پہلا مرحلہ مارچ ۲۰۰۵ء میں مکمل ہو گا۔ یہ بتایا گیا کہ گوادر میں صرف ایک انٹر میڈیٹ کالج ہے جسے پچھلے ۱۵ سالوں سے اپ گریڈ نہیں کیا گیا۔ یہاں گرلز کالج نہیں

ہے۔ ۲۰۰۲ء میں صدر مشرف نے ایک ڈگری کالج اور ایک ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کے قیام کا اعلان کیا تھا، لیکن اب تک کوئی بھی قائم نہیں کیا گیا۔

۴ جنوری ۲۰۰۵ء کو کمیٹی کے آخری اجلاس میں چیئرمین نے ممبروں کو آگاہ کیا کہ انہوں نے کمیٹی سے تبادلہ خیال کی روشنی میں نیشنل سیکورٹی کونسل کو بلوچستان کی صورتحال سے آگاہ کیا ہے۔ انہوں نے تین شعبوں میں معاملات کی وضاحت کی۔

- اعتماد سازی کے اقدامات (سی بی ایم)
- وہ کام جن کی انجام دہی ہوتی ہے۔
- اسٹریٹجک امور۔

سی بی ایم کے تحت مختلف مسائل پر فیصلہ ہوا اور اعلان کیا گیا تھا لیکن ابھی تک اس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ فوری عمل کے متقاضی اقدامات کے تحت این ایف سی کا جلد اعلان کرنے، ملازمتوں کے کوٹے کا تعین کرنے اور ایف سی اور کوسٹ گارڈ چیک پوسٹوں کے لیے ایس او پی تجویز کرنے جیسے معاملات شامل ہیں۔ اسٹریٹجک امور میں دہشت گردوں، ان کے تربیتی کیمپ سے نمٹنا اور چھاؤنیوں کا قیام شامل ہیں۔

ان اجلاسوں کی بنیاد پر، ممبران نے سوئی گیس رائلٹی سے لے کر گوادر کی ترقی اور چیک پوسٹوں تک ۳۱ امور کی نشاندہی کی۔ سفارشات کو حتمی شکل دینے کے لیے چھ رکنی ڈرافٹنگ کمیٹی تشکیل دی گئی تھی۔ اس نے جنوری ۲۰۰۵ء میں ۴ میٹنگیں کیں اور تمام پہلوؤں پر مشتمل سفارشات پیش کیں۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا کہ اصل امتحان ان سفارشات کا نفاذ ہے اور تجویز پیش کی کہ ایک ماہانہ رپورٹ باقاعدگی سے ذیلی کمیٹی کو پیش کی جائے۔ کمیٹی نے سفارش کی کہ ان سفارشات پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کے لیے ایک خصوصی ٹاسک فورس تشکیل دی جائے۔

# سفارشات

ڈرافٹنگ کمیٹی کی پیش کردہ سفارشات کی منظوری پارلیمنٹ کی بلوچستان پارلیمانی کمیٹی نے اپنے اجلاس میں ۲۳ جون ۲۰۰۵ء کو دی جس میں ایم این اے چوہدری شجاعت حسین کی زیر صدارت اجلاس ہوا۔ یہ سفارشات درج ذیل ہیں:

## ا۔ رائلٹی اور گیس کی ترقی کا سرچارج

- بلوچستان میں ضلع یا ایجنسی جہاں سے گیس پیدا ہو رہی ہے گیس کی آمدنی کے تعین کے بعد صوبائی حکومت کو وصول ہونے والی آمدنی میں سے کم از کم ۱۵ فیصد اس ضلع یا ایجنسی کو دی جائے۔
- پی پی ایل، او جی ڈی سی اور سوئی سدرن کے انتظامی بورڈ پر فوری طور پر صوبے کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی دی جانی چاہیے۔ بورڈ میں عوامی نمائندوں کو اگر وہ اس منصب کے لیے اہل ہوتے ہیں تو شامل کرنے پر بھی کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیے۔
- کسی علاقے میں قدرتی وسائل کی تلاش کرنے والی کمپنی کے کل اخراجات کا ۵ فیصد اسی علاقے کی معاشرتی فلاح و بہبود کے منصوبوں پر خرچ کیا جائے گا جبکہ وہ کمپنیاں، جو گیس یا تیل کی تلاش میں کامیاب ہو گئیں، اپنے قبل از ٹیکس منافع کا ۵ فیصد سماجی شعبے کے منصوبوں پر صرف کرنے کے پابند ہوں گی۔ متعلقہ ضلعی / ایجنسی کے عوامی نمائندوں سے مشاورت سے ایسے منصوبوں کی نشاندہی کی جائے گی۔ وہ کمپنیاں، جو گیس / تیل کی تلاش میں ناکام رہتی ہیں، انہیں پاکستان چھوڑنے سے قبل اپنے آڈٹ شدہ کھاتوں کو وزارت پٹرولیم کے پاس جمع کرنا ہو گا۔ مذکورہ بالا تجویز کو ان تمام ایکسپلوریشن کمپنیوں اور وزارت پٹرولیم کے مابین کسی بھی معاہدے کا حصہ بنایا جائے جنہیں ملک کے کسی بھی حصے میں تیل یا گیس کی تلاش کا کام سونپا جائے۔

- ڈسٹری بیوشن کمپنیوں کو پابند کیا جائے کہ وہ اسی ضلع / ایجنسی کے قصبوں اور دیہاتوں کو ترجیحی بنیادوں پر گیس فراہم کریں گی جہاں سے گیس نکالی جارہی ہے۔ ایسے علاقوں میں جہاں گیس لائنیں گزرتی ہیں، گھریلو مقاصد کے لیے غریب اور کم آمدنی والے نجی صارفین کو، اس علاقے کی خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے، حکومت کے مشورے سے، کمپنی کے مقررہ کردہ معیار کی بنیاد پر گیس کی فراہمی بلا معاوضہ ہوگی۔

- کمیٹی نے سینیٹر سیّد دلاور عباس کے پیش کردہ رائلٹی اور گیس ڈویلپمنٹ سرچارج سے متعلق ایک فارمولے کی منظوری دی جس پر عمل درآمد کیا جانا چاہیے۔ اس فارمولے کے نفاذ کے لیے ٹائم فریم این ایف سی / سی سی آئی کی منظوری سے اور بلوچستان اسمبلی کے اطمینان کے مطابق ہونا چاہیے۔

- جیسا کہ کچھ سینیٹرز کی طرف سے اشارہ کیا گیا ہے کمیٹی یہ بھی تجویز کرتی ہے کہ رائلٹی کے بقایاجات کا تعین اور تصدیق، ۳۰جون ۲۰۰۵ءتک کی جانی چاہیے اور ان بقایاجات کی ادائیگی کو ۳۱دسمبر ۲۰۰۵ءتک مکمل کیا جانا چاہیے۔ بلوچستان میں کام کرنے والی پٹرولیم کمپنیوں اور علاقے کے مقامی لوگوں کے مابین تمام معاہدوں پر فوری عمل کیا جائے۔

## ۲۔ وفاقی حکومت کی ملازمتوں میں بلوچستان کے لیے نمائندگی

- آئین کے تحت بلوچستان کے ملازمتوں کے ۵ء۴ فیصد کوٹہ کو تمام وفاقی وزارتوں، ڈویژنوں، کارپوریشن اور محکموں میں سختی سے نافذ کیا جائے اور اگر ان محکموں میں سے کسی میں کوٹہ پورا کرنے میں کمی ہے تو اس کا اعلان اور تشہیر کی جائے تاکہ کوٹہ کے تحت خالی آسامیوں کو مقامی میڈیا میں اشتہار کے ذریعے ۹۰ دن کے اندر اندر پُر کیا جائے۔ مسلح افواج اور سول آرمڈ فورسز سمیت وفاقی ملازمتوں میں بلوچستان کے

لیے وفاقی کوٹے پر عمل درآمد نہ ہونے کی تلافی کے لیے دیگر خصوصی اقدامات پر بھی غور کیا جانا چاہیے۔ یہ بھی سفارش کی جاتی ہے کہ اگر بلوچستان سے مطلوبہ اہلیت اور تجربہ رکھنے والے افراد دستیاب نہ ہوں تو تاوقتیکہ بلوچستان کے رہائشی افراد دستیاب ہو جائیں۔ دوسرے صوبوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو اس مدت کے لیے معاہدہ کی بنیاد پر رکھا جاسکتا ہے۔

۳۔ گوادر

- گوادر پورٹ اتھارٹی کے ہیڈ آفس کو فوری طور پر کراچی سے گوادر منتقل کیا جائے اور اس اتھارٹی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں بلوچستان کے عوام کی نمائندگی ۵۰ فیصد سے زیادہ ہونی چاہیے۔ مزید یہ کہ چیئرمین کا تعلق بھی بلوچستان سے ہونا چاہیے تاہم اتھارٹی کے روزانہ کے معاملات چلانے کے ذمہ دار ایک پیشہ ور فرد کے لیے ایم ڈی کی آسامی پیدا کی جائے۔
- گوادر پورٹ اتھارٹی کی مجموعی آمدنی کا ۷ فیصد، وفاقی محصولات کے علاوہ، صوبہ بلوچستان کی ترقی کے لیے مختص کیا جائے۔
- گوادر پورٹ پر ملازمت کے لیے گوادر کے عوام کو پہلی ترجیح دی جانی چاہیے اور دوسری ترجیح جہاں تک ممکن ہو مکران کے عوام اور پھر اہل بلوچستان کو ہونا چاہیے۔ بنیادی اسکیل ۱-۱۶ میں تمام تقرریوں کو مکران اور صوبہ بلوچستان کے لوگوں کے لیے مختص کیا جانا چاہیے، اور گوادر میں مقامی لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ملازمت فراہم کرنے کو یقینی بنانے کے لیے اہلیت کی شرائط میں نرمی ہونی چاہیے۔
- مکران اور بلوچستان کے مقامی نوجوانوں کو تربیت دینے کے لیے، فشریز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ، ایک پیشہ ور تکنیکی تربیتی انسٹی ٹیوٹ (اسکول کی سطح سے)، ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے ڈگری کالج قائم کیے جائیں۔

- پاکستان کے میڈیکل، انجینئرنگ اور مینجمنٹ سائنسز اداروں میں مکران اور صوبہ بلوچستان کے مقامی نوجوانوں کی خصوصی نشستیں مختص کی جائیں تاکہ وہ علاقے کے مستقبل کی ترقی میں حصہ لے سکیں۔
- ضلع گوادر کے سوشل سیکٹر ڈویلپمنٹ کے لیے ۳ارب روپے کے خصوصی ترقیاتی پیکج کا اعلان کیا جائے، جس میں اس علاقے کے لیے صحت، رہائش، تعلیم، سڑکوں اور پانی کی فراہمی کو شامل کیا جائے۔
- گوادر کے جن ماہی گیروں کو گوادر بندرگاہ کی ترقی کے لیے بے گھر کیا جارہا ہے انھیں مشرقی یا مغربی خلیج یا اس کے قریب منتقل کیا جائے اور مکمل معاوضہ دیا جائے۔ گہرے سمندری ٹرالروں کے ساحل سے ۳۵ سمندری میل کے اندر علاقے میں فشنگ کے لیے داخل ہونے پر پابندی عائد کی جائے۔
- گوادر ضلع میں سرکاری اراضی کی آبادکاری اور الاٹمنٹ کی تحقیقات اور موجودہ نجی رہائشی سکیموں میں کسی بھی بے ضابطگی یا غیر قانونی کارروائی کی جانچ پڑتال کے لیے ایک اعلیٰ اختیاراتی جوڈیشل کمیشن جو چیف جسٹس آف بلوچستان ہائی کورٹ کا تقرر کردہ ہو، کے ذریعہ جوڈیشل انکوائری کی جاسکتی ہے۔ تاہم، قانونی خریداروں کو جنہوں نے جائز رہائشی سکیموں میں اراضی خریدی ہے، ان کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

## ۴۔ بلوچستان میں قومی شاہراہوں کی تعمیر اور بحالی

- بلوچستان کی تمام سیاسی جماعتوں نے مطالبہ کیا ہے کہ ہائی ویز کی تعمیر اور شاہراہوں کی لمبائی کے مطابق فنڈز مختص کیے جائیں۔ وفاقی حکومت کے اعلانات کے مطابق صوبے میں شاہراہوں کے لیے فنڈز کی فراہمی کی جائے۔ اس سلسلے میں نیشنل ہائی وے اتھارٹی اور وزارت خزانہ ضابطے کی رکاوٹیں دور کریں۔ مزید یہ کہ تمام

منظور شدہ شاہراہوں کے منصوبوں، جن میں دو خصوصی شاہراہیں شامل ہیں، جن کا پاکستان اور صوبہ بلوچستان کی اقتصادی ترقی کے ساتھ بہت مضبوط رشتہ ہے، خصوصاً کوئٹہ، ژوب، ڈی آئی خان (N-50 ۳۸۸ کلو میٹر) اور قلعہ سیف اللہ، لورالائی، ڈیرہ غازی خان (N-70 ۲۸۵ کلو میٹر) شاہراہوں کو ترجیحی بنیادوں پر تعمیر کیا جانا چاہیے کیونکہ پہلے ہی بے حد تاخیر ہو چکی ہے۔ مزید یہ کہ دوسرے صوبوں اور ایران اور افغانستان کو ملانے والی تمام شاہراہوں کی تعمیر کو ترجیحی بنیادوں پر شروع کیا جائے۔ اس سلسلے میں، حکومت بلوچستان کو اسمال انڈسٹریز کارپوریشن، پی آئی اے کارگو یا کسی اور نجی چارٹر کمپنی اور وزارت تجارت کے ساتھ مل کر پھلوں اور سبزیوں جیسی برآمدی اشیاء کی پیکجنگ، پروسیسنگ اور اسٹوریج اور مشرق وسطی میں برآمد کے لیے مہارت اور برآمدی امدادی رقم کی فراہمی کے لیے خصوصی پیکج تیار کرنا چاہیے۔ پاکستانی شہریوں سے بلوچستان میں فوکر کی پروازوں پر سینٹرل ایکسائز ڈیوٹی نہیں لی جانی چاہیے۔

## ۵۔ صاف پانی اور خشک سالی

- صوبے میں پانی کی قلت اور خشک سالی کے خاتمے کی ایک مؤثر حکمت عملی تیار کی جائے کیونکہ پچھلے سات، آٹھ سالوں کی خشک سالی نے صوبے کی تقریباً ۶۰ فیصد آبادی کے معاش کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ صوبائی حکومت نے ایسی متعدد جگہوں کی نشاندہی کی ہے جہاں ڈیم تعمیر کیے جا سکتے ہیں۔ ڈیم کی تعمیر سے متعلق تجاویز گورنمنٹ کی منظوری کے مختلف مراحل میں ہیں۔ یہ ڈیم بنائے جانے چاہییں۔ کمیٹی خشک سالی سے متاثرہ لوگوں کی سنگین حالت کی بہتری کے لیے دو طرح کے اقدامات تجویز کرتی ہے: ایک فوری، مختصر مدت کی حکمت عملی اور طویل مدتی حکمت عملی۔ طویل المیعاد حکمت عملی میں نئے ڈیموں اور آبی ذخائر کی تعمیر کو ترجیح دینا شامل ہے جبکہ قلیل مدتی حکمت عملی میں فوری طور پر کئے جانے والے اقدامات

شامل ہیں، جیسے قحط والے عرصے کے لیے خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کے کسانوں کے زرعی قرضوں اور بجلی کے واجبات کی معافی شامل ہے۔

## ۶۔ وفاق اور وفاقی اکائیوں کے درمیان فنڈز کی تقسیم (این ایف سی ایوارڈ)

- این ایف سی ایوارڈ، جو غیر ضروری طور پر تاخیر کا شکار ہوا ہے، اس کا اعلان کرتے ہوئے بلوچستان کے عوام کے نقطہ نظر کو مناسب اہمیت دی جانی چاہیے۔
- این ایف سی ایوارڈ پر بلا تاخیر حق کی بنیاد پر اور بغیر کسی سیاسی تعصب کے عوام کی فلاح و بہبود پر مبنی اتفاق رائے حاصل کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے۔
- فنڈز کی تقسیم کا معیار مقرر کرتے ہوئے دیگر امور کے علاوہ عوام کی ترقی کی سطح اور پسماندگی کو اولیت دی جائے۔

## ۷۔ پالیسی اور انتظامی اقدامات جو بلوچستان میں اعتماد سازی میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں

- صوبہ کی سڑکوں پر ایف سی کی غیر ضروری موجودگی اور کوسٹ گارڈز کو بلوچستان کے عوام ناپسند کرتے ہیں اس سے نفرتیں بھی پیدا ہو رہی ہیں کیونکہ چیک پوسٹس پر خواتین اور بچوں کی توہین کی جاتی ہے اور بعض اوقات عجیب و غریب واقعات پیش آتے ہیں جس کے نتیجے میں امن وامان کی صورتحال پیدا ہوتی ہے۔ سفارش کی جاتی ہے کہ یہ دونوں ایجنسیاں اپنے دائرہ اختیار میں کام کریں اور سرحدوں پر گشت کرنے اور اسلحہ اور منشیات کی اسمگلنگ کی روک تھام کے اپنے بنیادی فرائض سرانجام دیں۔ یہ بھی سفارش کی جاتی ہے کہ حکومت کی انسداد اسمگلنگ پالیسی پر بھی نظر ثانی کی جانی چاہیے کہ عام طور پر لوگوں کو تھوڑی تعداد میں لے جانے والی ضروری اشیاء یا گھریلو سامان (جن پر ایف سی اور کوسٹ گارڈز کی نظر ہوتی ہے) پر توجہ دینے کے بجائے منشیات اور اسلحہ پر توجہ دی جائے جو ان کے آپریشنل دائرہ

اختیار میں شامل ہے، جس کی پہلے ہی قانون میں وضاحت کی جاچکی ہے، اس کی مزید وضاحت کی ضرورت ہے تاکہ قانون کی خلاف ورزی سے بچا جاسکے۔

- بلوچستان میں سیاسی جماعتیں صوبے میں لیویز فورس برقرار رکھنے کا مطالبہ کر رہی ہیں کیونکہ کمیٹی کو فراہم کردہ اعداد و شمار کے مطابق پولیس کے مقابلے میں نہ صرف لیویز پر ہونے والے اخراجات بہت کم ہیں بلکہ لیویز کی جرائم کا پتہ لگانے اور ان پر قابو پانے کی کارکردگی بھی پولیس کے مقابلے میں بہتر ہے۔ فی الحال 'بی' علاقے جو لیویز کے زیر کنٹرول ہیں صوبے کی ۹۵ فیصد علاقے پر مشتمل ہیں جبکہ 'اے' علاقوں کی نگرانی پولیس کرتی ہے۔ لہٰذا یہ سفارش کی جاتی ہے کہ لیویز کو پولیس کی طرز پر تربیت دی جائے اور مطلوبہ سہولیات نقل و حمل مہیا کی جائے۔ اس سلسلے میں ۱۵ جنوری ۲۰۰۵ء کو بلوچستان کی صوبائی اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی گئی تھی جو سینئر صوبائی وزیر کی اس یقین دہانی پر موخر کر دی گئی تھی کہ وفاقی حکومت سے اس معاملے پر تبادلہ خیال کیا جارہا ہے۔

- دو چیک پوسٹس، ایک سندھ کی سرحد سے تقریباً ۱۳۰ کلومیٹر دور ضلع لسبیلا کے اتھل میں (کوسٹ گارڈز کے زیر انتظام) اور دوسری شالاباغ، چمن کے قریب ضلع قلعہ عبد اللہ، (ایف سی کے زیر انتظام کردہ) خاص پریشانی، ایذا رسانی اور بدعنوانی کا باعث ہیں۔ وفاقی وزراء سمیت پارلیمنٹرینز کی بڑی تعداد اور بلوچستان سے تعلق رکھنے والے کمیٹی کے تمام ممبران اور عام آدمی شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ ان دو چیک پوسٹوں کے خاتمے سے بلوچستان میں عام ماحول کو بہتر بنانے میں بہت مدد ملے گی۔

- کوئٹہ ہوائی اڈے میں رات کو جہاز اترنے کی کوئی سہولت نہیں ہے۔ جس کے سبب بالخصوص کوئٹہ اور بلوچستان کے عوام کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مختلف مواقع پر اس مسئلے کو اجاگر کیا گیا اور اس سہولت کی فراہمی کے اعلانات بھی کیے گئے۔ اس

منصوبے کو اولین ترجیحی بنیادوں پر شروع کرنے کے لیے سول ایوی ایشن اتھارٹی (سی اے اے) کو فوری طور پر ہدایت جاری کی جائے۔

- کمیٹی نے بلوچستان کے اندر وفاقی حکومت کے مالی تعاون سے فراہم کردہ مختلف ترقیاتی منصوبوں کے سلسلے میں موثر رابطوں کی ضرورت کو محسوس کیا اور وفاقی حکومت اور صوبائی حکومت کے مابین جاری اور نئے منصوبوں پر ہم آہنگی کے لیے دفتر برائے ڈی.جی (پروجیکٹس) کے قیام کی سفارش کی جو ان منصوبوں کی تکمیل کے لیے ٹائم فریم کو یقینی بنائے۔

- بلوچستان میں گرفتار سیاسی کارکنوں کے کیسوں کا جائزہ لیا جائے اور معمولی جرائم میں ملوث افراد کو رہا کیا جائے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی زیادتیوں کو روکنے کے لیے فول پروف نظام بھی قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

- حکومت کو مالی سال ۲۰۰۶-۲۰۰۵ء کے لیے ایک ارب روپے کی یکبارگی گرانٹ کا اعلان کرنا چاہیے تاکہ [ہسپتالوں کے ]ایمرجنسی وارڈوں کو بہتر بنایا جاسکے اور بلوچستان کے تمام ڈویژنل ہیڈ کوارٹر ہسپتالوں میں جان بچانے والی ادویات کی مناسب مقدار کی فراہمی کو یقینی بنایا جاسکے۔

- اس حقیقت کے پیش نظر کہ سوئی کے علاقے نے پچھلے ۵۰ سالوں سے ملک کو ضرورت کی گیس مہیا کی ہے۔ سوئی کے علاقے اور عوام کے لیے ترقیاتی پیکج پر غور کیا جانا چاہیے۔ صوبائی حکومت بلدیاتی حکومت / ضلعی ناظم کی مشاورت سے سماجی شعبے کے منصوبوں پر عملدرآمد کے لیے ۲۔ ارب روپے کے پیکج کا اعلان کر سکتی ہے۔

- کوئٹہ شہر کے بنیادی ڈھانچے کو بہتر بنانے، شہر کو آلودگی سے پاک کرنے اور اس کے سماجی شعبے کو مستحکم کرنے کے لیے ایک خصوصی پیکج شروع کیا جائے۔ اس منصوبے میں کوئٹہ سٹی گورنمنٹ کی صلاحیت کار بڑھانے کے لیے فنڈز رکھے جائیں تاکہ اس

منصوبے پر مؤثر انداز میں عمل ہو سکے۔ لہٰذا کوئٹہ شہر کی ترقی اور بحالی کے لیے ۴ ارب روپے کے ترقیاتی پیکج کی تجویز کی گئی ہے، جسے اسی طرح کے مسائل کا شکار بلوچستان کے دیگر شہری مراکز کے لیے بطور ماڈل منصوبہ سمجھا جاسکتا ہے۔

- ہائر ایجوکیشن کمیشن کے ذریعہ بلوچستان کو تعلیمی وظائف کا خصوصی کوٹہ دیا جائے تاکہ صوبے کے طلباء مقامی یا غیر ملکی جامعات میں ماسٹرز اور پی ایچ ڈی کی تعلیم حاصل کر سکیں۔

- پی پی ایل کے سرکاری حصص کی فروخت جو نجکاری کمیشن کے ایجنڈے پر ہے، بلوچستان کے عوام کے لیے بڑی پریشانی کا باعث ہے۔ سفارش کی جاتی ہے کہ یہ معاملہ مشترکہ مفادات کونسل کے سامنے رکھا جائے کیونکہ قدرتی گیس سی سی آئی کے دائرہ کار میں آتی ہے۔ اگر پی پی ایل کی نجکاری ہونی ہی ہے تو، پہلی پیش کش حکومت بلوچستان کو کی جانی چاہیے۔

- کمیٹی کی رائے ہے کہ روایتی لیوی فورس کی موجودگی میں کوہلو ایجنسی میں اسپیشل لیوی جسے کچھ سال قبل بھرتی کیا گیا تھا، لگانے کا کوئی جواز نہیں، کمیٹی سفارش کرتی ہے کہ یہ فورس فوری طور پر ڈائریکٹر جنرل لیویز، بلوچستان کے کنٹرول میں دیا جائے تاکہ اسے ایک سال کے عرصے میں بلوچستان حکومت کے مختلف محکموں میں ضم کر دیا جائے۔ گوادر، ڈیرہ بگٹی اور کوہلو میں حکومت کی جانب سے چھاؤنی بنانے کے منصوبے، بلوچستان کی سیاسی قوتوں کے اشتعال کا ذریعہ ہیں۔ کمیٹی کی تجویز ہے کہ بلوچستان کے موجودہ مسائل کے حل کے لیے بات چیت کے اختتام تک چھاؤنیوں کی تعمیر کو روکا جائے تاکہ اس وقت خوشگوار ماحول کو برقرار رکھا جاسکے۔

- مسلح افواج کی حقیقی حفاظتی ضروریات کو جانتے ہوئے، کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ رہائش اور تجارتی مقاصد کے لیے وسیع اراضی کا حصول غیر منصفانہ ہے اور اس سے مسلح افواج کی کی بدنامی ہو رہی ہے۔

- صوبہ بلوچستان کی تمام قومیتوں میں ہم آہنگی، استحکام اور بقائے باہمی کے لیے تجویز کیا جاتا ہے کہ بلوچوں اور پختونوں کے درمیان زندگی کے تمام شعبوں میں مساوات کو قائم رکھا جائے تا آنکہ باہمی مذاکرات کے ذریعے مسائل حل ہو جائیں۔

ذیلی کمیٹی شدت سے محسوس کرتی ہے کہ صوبے کے مختلف حصوں میں علاقائی مساوات اور توازن اتنا ہی اہم ہے جتنا بین الصوبائی مساوات اور توازن۔ اسی طرح یہ سفارش کی جاتی ہے کہ پانی، توانائی اور دیگر وسائل کی ترقی کے لیے میگا پروجیکٹس کی یکساں طور پر تقسیم کی جائے اور کوئٹہ سمیت شمالی علاقہ کی ترقی کو ترجیح دی جائے۔ سفارش کی جاتی ہے کہ صوبائی حکومت مندرجہ ذیل مقاصد کے حصول کے لیے دیگر کے علاوہ تجویز کردہ اقدامات فوری طور پر کرے۔

- شمالی علاقے کے پانی کے وسائل کو ہر ممکن طریقے پر بروئے کار لانے کے لیے صوبے کے اس حصے میں تمام ممکنہ ڈیم ترجیحی بنیادوں پر تعمیر کئے جائیں۔

- اس علاقے میں سماجی شعبے بالخصوص صحت، رہائشی سہولیات اور تعلیمی خدمات کے معیار اور مقدار میں اضافے کے لیے خصوصی ترقیاتی پروگرام تیار کر کے ان پر عملدرآمد کیا جائے۔

- دونوں خطوں کی مساوی نمائندگی کا خیال رکھتے ہوئے سرکاری ملازمتوں میں کوٹہ پر سختی سے عمل کیا جائے تا کہ اضلاع کے بے روزگار نوجوان جو پیچھے رہ گئے ہیں وہ ملازمتوں کے مواقع میں اپنا واجب حصہ پا سکیں۔

- شمالی علاقوں سے تعلق رکھنے والے سرکاری افسران کو صوبائی حکومت میں فیصلہ سازی کی سطح پر مساویانہ بنیادوں پر تعینات کیا جائے اور انہیں صوبائی حکومت کے مختلف بورڈز، کمیٹیوں اور کمیشنوں میں مناسب نمائندگی دی جائے۔
- بلوچستان کے خطے کو ترقی، تعامل اور انضمام کے لیے کھولا جائے۔ کمیٹی بلوچستان میں پرامن اور خوشگوار ماحول کے قیام پر زور دیتی ہے۔
- وفاقی حکومت پارلیمانی کمیٹی کی مشاورت سے ایک خصوصی ٹاسک فورس تشکیل دے جو ان سفارشات پر ۹۰ دن کے اندر عمل درآمد کرائے۔

---

## اراکین پارلیمانی کمیٹی برائے بلوچستان

سابق وزیراعظم چوہدری شجاعت حسین کی سربراہی میں دونوں ایوانوں کے منتخب اراکین پر مشتمل بلوچستان پارلیمانی کمیٹی کے اراکین کی فہرست:

(۱) چوہدری شجاعت حسین، ایم این اے، پی ایم ایل (ق)، چیئرمین (۲) وسیم سجاد، سینیٹر، لیڈر آف دی ہاؤس پی ایم ایل (ق)، وائس چیئرمین (۳) مشاہد حسین سیّد، سینیٹر، پی ایم ایل (ق)، چیئرمین ذیلی کمیٹی (۴) مخدوم محمد امین فہیم، ایم این اے، پی پی پی (۵) محمود خان اچکزئی، ایم این اے، پی کے ایم اے پی (۶) اسفندیار ولی، سینیٹر، اے این پی (۷) میاں رضا ربانی، سینیٹر، پی پی پی (۸) پروفیسر خورشید احمد، سینیٹر، ایم ایم اے (۹) محمد اسحاق ڈار، سینیٹر، پی ایم ایل (ن) (۱۰) بابر خان غوری، سینیٹر، ایم کیو ایم (۱۱) مولانا سمیع الحق، سینیٹر، ایم ایم اے۔ جے یو آئی (س) (۱۲) مولانا محمد خان شیرانی، ایم این اے، ایم ایم اے پی (۱۳) ثناء اللہ بلوچ، سینیٹر، بلوچستان نیشنل پارٹی (۱۴) زبیدہ جلال، ایم این اے، پی ایم ایل (ق) (۱۵) آغا پری گل، سینیٹر، پی ایم ایل (ق) (۱۶) ڈاکٹر نور جہاں پانیزئی، ایم این اے، پی ایم ایل (ق) (۱۷) سیّد دلاور عباس، سینیٹر، پی ایم ایل (ق) (۱۸) مہیم خان بلوچ، سینیٹر، بی این پی (عوامی) (۱۹) سعید احمد ہاشمی، سینیٹر، پی ایم ایل (ق) (۲۰) رؤف مینگل،

ایم این اے، بی این پی ایم (۲۱) رضا محمد رضا، سینیٹر، پی کے ایم اے پی (۲۲) السیّد عبد القادر جمال الدین الگیلانی، ایم این اے، پی ایم ایل (ق) (۲۳) میر ولی محمد بادینی، سینیٹر، پی ایم ایل (ق) (۲۴) سردار یار محمد رند، ایم این اے، پی ایم ایل (ق) (۲۵) ڈاکٹر محمد اسماعیل بُلیدی، سینیٹر، جے یو آئی (ف) (۲۶) امان اللہ کنرانی، سینیٹر، جمہوری وطن پارٹی (جے ڈبلیو پی) (۲۷) ایاز خان مندوخیل، سینیٹر، پی ایم ایل (ق) (۲۸) محمد سرور خان کاکڑ، سینیٹر، پی ایم ایل (ق) (۲۹) محمد اسلم بُلیدی، سینیٹر، نیشنل پارٹی (این-پی) (۳۰) غلام حیدر سمیجو، ایم این اے، پی ایم ایل (ق) (۳۱) محمد علی بروہی، سینیٹر، ایم کیو ایم (۳۲) میر محمد نصیر مینگل، سینیٹر، پی ایم ایل (ق) (۳۳) سردار محمد یعقوب خان ناصر، ایم این اے، پی ایم ایل (ن) (۳۴) کلثوم پروین، سینیٹر، پی ایم ایل (ق) (۳۵) رحمت اللہ کاکڑ، سینیٹر، ایم ایم اے (۳۶) محمد علی درانی، سینیٹر، پی ایم ایل (ق) (۳۷) خلیل الرحمٰن، سینیٹر، آزاد (۳۸) مولانا رحمت اللہ، ایم این اے، ایم ایم اے پی

---

## اراکین پارلیمانی ذیلی کمیٹی برائے بلوچستان کے سیاسی، سماجی و معاشی مسائل

پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کے اراکین پر مشتمل سینیٹر مشاہد حسین سیّد کی سربراہی میں "پارلیمانی ذیلی کمیٹی برائے بلوچستان کے سیاسی، سماجی و معاشی مسائل" کے اراکین کی فہرست:

(۱) مشاہد حسین سیّد، سینیٹر، چیئرمین (۲) سردار یار محمد رند، ایم این اے (۳) بابر خان غوری، سینیٹر (۴) مسز زبیدہ جلال، ایم این اے (۵) محمد نصیر مینگل، سینیٹر (۶) سعید احمد ہاشمی، سینیٹر (۷) ایاز خان مندوخیل، سینیٹر (۸) میر ولی محمد بادینی سینیٹر (۹) السیّد عبد القدیر جمال الدین الگیلانی، ایم این اے (۱۰) مہیم خان بلوچ، سینیٹر (۱۱) ڈاکٹر نور جہاں پانیزئی، ایم این اے (۱۲) محمد اسحاق ڈار، سینیٹر (۱۳) رضا محمد رضا، سینیٹر (۱۴) محمد اسلم بُلیدی، سینیٹر (۱۵) ڈاکٹر محمد اسماعیل بُلیدی، سینیٹر (۱۶) سیّد دلاور عباس، سینیٹر (۱۷) ثناء اللہ بلوچ، سینیٹر (۱۸) مولانا محمد خان شیرانی، ایم این اے (۱۹) پروفیسر خورشید احمد، سینیٹر

# دہشت گردی کے مسلسل واقعات
# پریشان کن سوالات

۲۴ اکتوبر ۲۰۱۶ء پاکستانی قوم کے لیے ایک سیاہ دن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس روز کوئٹہ شہر سے ۱۷ کلومیٹر دُور سبّی روڈ پر واقع پولیس ٹریننگ سنٹر میں تین دہشت گردوں نے یورش کی۔ ۵۰۰ کے قریب زیرتربیت نوجوان اہلکاروں (عمر ۱۶ سے ۲۵ سال) کو یرغمال بنالیا۔ دہشت گردوں نے چار گھنٹے کے خونیں معرکے میں ۶۱ معصوم انسانوں کو شہید اور تقریباً ۱۵۰ کو زخمی کیا، جن میں سے ایک درجن سے زیادہ جوان زندگی اور موت کی کش مکش سے دوچار ہیں۔

یہ دل خراش واقعہ، کوئٹہ ہی میں دہشت گردی کے ایک اور دل دہلا دینے والے واقعے کے صرف اڑھائی ماہ بعد رُونما ہوا ہے۔ تب دہشت گردوں نے دن کی روشنی میں پہلے ایک نام وَر وکیل کو نشانہ بنایا اور پھر جب شہر کے چوٹی کے وکلا غم سے نڈھال ہسپتال پہنچے، تو دہشت گردوں نے ہسپتال میں ۷۰ افراد کو بے دردی سے بھون ڈالا۔ ان شہدا میں سے تقریباً ۵۰ کا تعلق وکالت کے پیشے سے تھا اور یہ بلوچستان کی وکیل برادری کے گل ہائے سرسبد کی حیثیت رکھتے تھے۔ 'ضربِ عضب' کی تمام قابلِ قدر کوششوں کے باوجود، صرف صوبہ بلوچستان میں اس آپریشن کے شروع ہونے کے بعد، اس اندوہناک واقعے سے پہلے بھی،

دہشت گردی کے آٹھ بڑے واقعات رُونما ہو چکے ہیں[1]، جن میں مجموعی طور پر ۲۰۰ سے زائد افراد شہید ہوئے ہیں، جن میں ایک نمایاں تعداد خود قانون نافذ کرنے والوں کی ہے، جن کا تعلق فوج، ایف سی اور پولیس سے تھا۔ واضح رہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں میں پولیس خصوصیت سے دہشت گردوں کا نشانہ رہی ہے۔

'ضربِ عضب' پشاور کے آرمی پبلک اسکول پر سفاکانہ حملے[2] کے بعد وقت کی اہم ضرورت تھی اور بہ حیثیت مجموعی اس کے مثبت اثرات بھی رُونما ہوئے، جس کا ہر حلقے نے اعتراف کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ 'دہشت گردی کا قلع قمع کرنے' کا جو دعویٰ کیا گیا تھا، وہ ابھی پوری طرح شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا ہے۔ بار بار دعویٰ کیا جاتا ہے کہ 'دہشت گردوں کی کمر توڑ دی گئی ہے' لیکن یہ کمر معلوم نہیں کتنی مضبوط ہے کہ ساری کوشش کے باوجود ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہی۔ ایسے ہر اندوہناک واقعے کے بعد جس ردعمل کا اظہار کیا جاتا ہے، وہ اب اپنی معنویت کھوتا نظر آتا ہے۔ وہی گھسی پٹی مذمت! وہی

---

[1] بلوچستان میں ۲۰۱۶ میں دہشت گردی چند اہم واقعات:

کوئٹہ کے قریب ایک ٹاؤن میں پولیو سنٹر پر خودکش بمبار کے حملے میں ۱۵ افراد بشمول ۱۳ پولیس اہلکار شہید ہوئے (جنوری ۲۰۱۶)

ژوب بلوچستان میں کینٹ ایریا میں خودکش بمبار کے حملے میں پاک فوج کے ۶ جوان اور ایک بچہ زخمی ہوئے (جنوری ۲۰۱۶ء)

ضلعی عدالت کوئٹہ کے احاطے میں ایک خودکش بمبار کے حملے میں کم از کم آٹھ افراد جن میں ایف سی کے دو جوان شامل تھے ہلاک اور دیگر ۳۵ افراد زخمی ہوئے۔ (فروری ۲۰۱۶ء)

پولیس ٹریننگ کالج کوئٹہ پر مسلح دہشت گردوں کے حملے میں ۶۱ زیر تربیت جوان اور ۶۵۰ دیگر زخمی ہوئے (اکتوبر ۲۰۱۶ء)

خضدار میں شاہ نورانی کی زیارت کے مقام پر دہشت گردوں کے حملے کے نتیجے میں ۵۵ افراد ہلاک اور ۱۰۰ زخمی ہوئے (نومبر ۲۰۱۶)

گوادر میں تیل تلاش کرنے والی کمپنی کی گاڑی پر انتہاپسندوں کے حملے کے نتیجے میں دو سیکورٹی گارڈ ہلاک ہوئے۔ (نومبر ۲۰۱۶)

[2] ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء پشاور میں آرمی پبلک اسکول پر صبح سویرے سات مسلح دہشت گردوں نے حملہ کر کے ۱۵۰ افراد کو شہید کر دیا جن میں ۱۳۴ طالب علم تھے علاوہ ازیں ایک سو افراد زخمی بھی ہوئے اس وقت اسکول میں ایک ہزار سے زائد طلبہ اور اساتذہ موجود تھے بعض تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ یہ حملہ شمالی وزیرستان میں جاری فوجی آپریشن ضربِ عضب کا ردعمل تھا۔ اس واقعہ کی ذمہ داری تحریک طالبان نے قبول کی جبکہ اسکول کے ان معصوم طلبہ کی شہادت پر دہشت گردوں کے حملے کی ہر طرف سے مذمت کی گئی۔

وحشیانہ کارروائیاں کرنے کی اجازت نہ دینے کے دعوے، وہی مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے عزائم، وہی آہنی ہاتھوں کے حرکت میں آنے کی نوید، پھر دہشت گردوں کے بارے میں معلومات فراہم کرنے پر انعامات کا اعلان! اور ان سب پر مستزاد حالیہ چند واقعات بشمول حالیہ کوئٹہ کے سانحے کی یہ توجیہہ کہ: ''اگر بروقت دہشت گردوں کو زیر نہ کرتے تو بڑی تباہی ہوتی''۔ گویا ۶۱ نوجوانوں کی شہادت اور ۱۵۰ کا زخمی ہونا تو کم تباہی ہے۔

بلاشبہ آج ہر آنکھ اَشک بار ہے، ہر دل افسردہ اور مغموم ہے اور ہر زبان شہیدوں اور مظلوموں کے ساتھ دُکھ اور یک جہتی کا اظہار کر رہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہر صاحب ضمیر فرد، شرم سار ہے کہ ۱۹۸۰ء سے دہشت گردی کے جس عفریت نے پاکستان میں سر اُٹھایا ہے اور جسے قابو کرنے اور تہ تیغ کرنے کی ہر سطح پر کوششیں کی جارہی ہیں، حتّٰی کہ شخصی آزادیوں اور قانون کے باقاعدہ عمل (Due process) تک کی بھی قربانی دی گئی ہے اور سویلین معاملات میں فیصلے کا دستوری اختیار بھی فوجی عدالتوں کو سونپ دیا گیا ہے، اس کے باوجود یہ عفریت بدستور اپنی تباہ کاریوں میں مشغول ہے۔

'ضربِ عضب' کو بھی اب دو سال ہو رہے ہیں۔ شروع میں اس کے اثرات زیادہ نمایاں تھے۔ مگر اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روایتی عسکری آپریشن اپنے مثبت نتائج کے باوجود اس عفریت کو نیست و نابود کرنے میں کامیاب نہیں ہو رہا۔ سرکاری اعداد و شمار سے جو تصویر سامنے آتی ہے، وہ بہت خوش آئند نہیں ہے۔ ۲۰۱۴ء میں ملک بھر میں ۲۷۵ افراد دہشت گردی کے نتیجے میں جاں بحق ہوئے تھے، وہ ۲۰۱۵ء میں کم ہو کر ۲۰۲ کی سطح پر آگئے تھے لیکن ۲۰۱۶ء کے ۱۰ ماہ میں بدقسمتی سے یہ تعداد ۳۲۰ ہو گئی ہے۔ لہٰذا، اس امر کی فوری ضرورت ہے کہ دہشت گردی کے خلاف جو حکمت عملی اپنائی گئی ہے، اور جسے قوم کی تائید حاصل رہی ہے، نتائج کی روشنی میں اس پر نظرثانی کی جائے اور تمام حالات کے بے لاگ تجزیے کے بعد پالیسی کی از سرِنو شیرازہ بندی کی جائے۔

چند بنیادی سوال جن پر فوری غور و فکر ضروری ہے، انھیں ہم ملک کے تمام پالیسی

سازوں اور متاثر اداروں اور افراد کے غور و فکر کے لیے پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں:

۱) سب سے پہلا اور پریشان کن سوال یہ ہے کہ انٹیلی جنس کے ذرائع کی جانب سے جب واضح اور متعین معلومات، انتظامیہ اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کو مہیا کی جاتی ہیں، تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس کی روشنی میں موثر اقدامات نہیں کیے جاتے اور دہشت گرد قانون نافذ کرنے والوں کو چکما دے کر اپنا کام کر جاتے ہیں اور خود قانون نافذ کرنے والوں ہی کو ہدف بنا لیتے ہیں۔ اخباری نہیں، سرکاری اطلاعات اور اعترافات کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کوئٹہ کے حالیہ واقعے اور اس سے پہلے رُونما ہونے والے ایک ہولناک واقعے سے قبل بھی متوقع دہشت گردی کے حملے کی واضح اطلاعات موجود تھیں اور متعلقہ اداروں کو ان سے باخبر کیا جاچکا تھا۔

اسی طرح کراچی میں بحریہ کے بیس پر حملے کا واقعہ ہو یا ایئر فورس بیس کا، جی ایچ کیو کا واقعہ ہو یا کراچی ایئرپورٹ پر حملے کا، پشاور آرمی پبلک اسکول کا واقعہ ہو یا ولی خان یونیورسٹی کا واقعہ، ہر موقعے پر متوقع حملے کے بارے میں ہوشیار رہنے کے لیے 'الرٹ سگنل' جاری کیے گئے، مگر ان پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی، اور سانحے پر سانحہ نمودار ہوتا رہا۔ حالیہ واقعے کے بارے میں تو بلوچستان کے وزیراعلیٰ نے ٹی وی پر اعتراف کیا ہے کہ: ''ہمیں پولیس پر حملے کی اطلاع تھی'' مگر وزیراعظم اور اپیکس کمیٹی کے ایک سال سے زیادہ پرانے فیصلے کے باوجود کہ کوئٹہ کو 'محفوظ شہر' بنایا جائے گا اور ہر اہم مقام پر چوکیاں قائم کی جائیں گی، کیمرے لگائے جائیں گے، عملاً کچھ نہ ہوا۔ حالیہ وارننگ کے باوجود پولیس ٹریننگ کالج جہاں ۵۰۰ سے زیادہ اہلکار تھے، اس کے احاطے کی نہ دیوار درست تھی اور نہ حفاظت کا کوئی معقول انتظام تھا۔ صرف ایک سپاہی واچ ٹاور پر تھا، جس نے مزاحمت کے دوران شہادت دے دی اور حملہ آور دندناتے ہوئے کمپاؤنڈ میں داخل ہوگئے اور بے باکی سے خون کی ہولی کھیلتے رہے۔ ایک تربیت کار نوجوان جو زخمی ہوا، اس کے یہ الفاظ دل کو دہلا دینے والے

اور آنکھوں کو شرم سار کرنے والے ہیں کہ ''حملہ آوروں کے ہاتھوں میں کلاشنکوف تھی، اور ہمارے پاس ہتھیار نہیں تھے''۔

واضح رہے کہ پشاور آرمی پبلک اسکول اور ولی خاں یونی ورسٹی کے واقعات کے بعد کہا گیا تھا کہ ہر اسکول اور کالج میں دفاع کے لیے اسلحہ فراہم کیا جائے گا۔ ان تمام اعلانات کا کیا بنا؟ بلاشبہ انٹیلی جنس اداروں کی ناکامی بھی بار بار سامنے آئی ہے، لیکن انٹیلی جنس کی فراہم کردہ اطلاعات کے بعد انتظامی اور سیکورٹی کے اداروں کی غفلت بھی ایک حقیقت ہے۔ جب تک یہ کیفیت رہتی ہے محض فوج کی 'ضربِ عضب' کے باب میں سرگرمی نتائج نہیں نکال سکتی۔

۲) بات صرف انٹیلی جنس کی معلومات، انتظامی اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کی غفلت اور کوتاہی تک محدود نہیں، ہماری نگاہ میں فوج اور پولیس کی بیش قیمت قربانیوں کے باوجود دہشت گردی پر نہ قابو پانے میں درج ذیل پہلو غیر معمولی اہمیت کے حامل ہیں:

- دہشت گردی کے خلاف ۲۰ نکاتی حکمت عملی[1] کے بیش تر نکات پر عمل درآمد نہ کیا جانا اور اس سلسلے میں جن بنیادی اداراتی اور پالیسیوں کی تبدیلیوں کی ضرورت تھی اور حکومت کے تمام متعلقہ اداروں کے درمیان جس ہم آہنگی کی ضرورت تھی، ان کی طرف قرارِ واقعی توجہ نہیں دی گئی۔ نیز اس پوری حکمت عملی پر عمل کرنے کے لیے جن مالی اور انسانی وسائل کی حاجت تھی، اس کی بھی کوئی فکر نہ کی گئی۔ ایسی صورتِ حال میں بہتر نتائج کی توقع کیسے کی جاسکتی تھی۔
- بات نازک ہے لیکن اس کا اظہار اور ادراک بھی ضروری ہے کہ ملک کی سیاسی

[1] دہشت گردی کے خلاف پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں ۲۲ اکتوبر ۲۰۰۸ء کو ایک قرارداد کے ذریعے حکمت عملی طے کی گئی تھی۔ قرارداد کا متن صفحہ نمبر ۷۲ پر ملاحظہ فرمائیں۔

قیادت اور عسکری قیادت میں جس فکری ہم آہنگی، باہمی اعتماد اور حقیقی تعاون کی ضرورت تھی، نیز وفاق اور صوبوں کے درمیان فوج، ایف سی اور صوبائی اسمبلیوں کے درمیان جس قسم کی ہم آہنگی ناگزیر تھی، بدقسمتی سے وہ بڑی کمزور رہی۔

- ملک میں بحیثیت مجموعی اور تقریباً ہر سطح پر اور ہر ادارے میں جس ناقص طرزِ حکمرانی کا رواج ہے، انتظامی بدنظمی جس سطح تک پہنچ چکی ہے، کرپشن نے جس طرح پورے ملک کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے، اہلیت و قابلیت کا خون کر کے نااہل افراد کو اہم ترین مناصب پر فائز کرنے کا جو چلن عام ہو گیا ہے، پھر ایک ہی حکومت کے مختلف وزیروں اور مشیروں، مختلف محکموں میں باہمی ربط اور تعاون کا جو فقدان دکھائی دیتا ہے، ان سب نے حکمرانی کے پورے نظام کو اتنا تباہ کر دیا ہے کہ ایک اچھی پالیسی بھی مطلوبہ نتائج دینے میں بُری طرح ناکام ہو جاتی ہے۔
- کوئی قانونی اور کوئی انتظامی پالیسی اس وقت تک بارآور نہیں ہو سکتی، جب تک اس کے نفاذ کا معقول انتظام نہ ہو۔ اس سلسلے میں جہاں عمل درآمد کا نظام (Delivery system) بنیادی اہمیت رکھتا ہے، وہیں قانون کی خلاف ورزی اور پالیسی کے بارے میں انحراف اور عدم تعمیل پر احتساب اور سزا کا نظام ضروری ہے۔ جس معاشرے میں قانون کا نفاذ نہ ہو، جہاں انصاف کے تقاضوں کو پورا نہ کیا جائے، جہاں قانون توڑنے اور ذمہ داریاں ادا نہ کرنے یا بدعنوانی کا ارتکاب کرنے پر سزا کا نظام مفقود ہو، وہاں اچھی سے اچھی پالیسی اور بہتر سے بہتر قانون بھی بے کار ہوں گے..... اور آج ہمارا مسئلہ بھی یہی ہے۔

۳) دہشت گردی کے سدباب کے لیے جہاں عسکری کارروائیاں ضروری ہیں اور قانون اور قانون نافذ کرنے والوں کا بڑا کلیدی کردار ہے، وہیں سیاسی، فکری، سماجی، معاشی اور اخلاقی پہلوؤں سے بھی بڑی اہم اصلاحات اور پالیسیاں درکار ہیں۔ فوجی کارروائی سے جن علاقوں کو دہشت گردی سے پاک کرا لیا جاتا ہے ان کی دوبارہ آبادکاری،

تباہ شدہ انفراسٹرکچر کی بحالی، پُرامن شہری زندگی کی صورت گری بھی اتنی بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہوتی ہے۔ اسی طرح پوری سول انتظامی مشینری کا موثر وجود اور متحرک کردار تاکہ لوگ اعتماد سے نئی زندگی کا آغاز کرسکیں۔ دوسری جانب دہشت گردی کے خلاف جنگ کے بھی اپنے سیاسی، سماجی، اخلاقی، علمی اور معاشی پہلو ہیں، جن کی طرف ۲۰ نکاتی پالیسی میں اشارے موجود ہیں لیکن ان کے لیے موثر پالیسیاں، انتظامی اور اداراتی سہولتیں اور صحیح مردانِ کار کا وجود مفقود ہے۔ ایسے ٹوٹے پھوٹے اور بے ربط (Disjointed) انداز میں اگر دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی جائے، تو کامیابی کیسے حاصل کی جاسکتی ہے۔ دوسری طرف دہشت گرد منظم ہیں، تربیت یافتہ ہیں، ان کا اپنا انٹیلی جنس کا نظام ہے اور وہ مسلح بھی ہیں بلکہ کچھ حالات میں عام قانون نافذ کرنے والوں سے کہیں بہتر اسلحہ اور ٹیکنالوجی کے حامل ہیں۔

کوئٹہ کا خونیں حادثہ خون کے آنسو رُلانے والا واقعہ ہے۔ لیکن کیا یہ ہماری اور ہماری قیادت کی آنکھیں کھولنے کا تازیانہ ثابت ہوسکتا ہے؟ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ!

(عالمی ترجمان القرآن نومبر ۲۰۱۶ء)

دوسرا حصہ

# سیمینار

# بلوچستان: صورت حال اور اقدامات
# بلوچ قیادت کی نظر میں

زیرِ اہتمام

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد
بلوچستان بار کونسل

بمقام: کوئٹہ

۱۳ اپریل ۲۰۱۷ء

# فہرست شرکاء سیمینار

| | |
|---|---|
| محمد اسلم بھوتانی | سابق اسپیکر، بلوچستان اسمبلی |
| عبدالحکیم بلوچ | سابق چیف سیکرٹری بلوچستان |
| امان اللہ کنرانی ایڈووکیٹ | سابق سینیٹر، ایڈووکیٹ جنرل بلوچستان |
| منیر احمد بادینی | سابق چیف سیکرٹری حکومت پاکستان، سیکرٹری تعلیم حکومت بلوچستان |
| ڈاکٹر اسحاق بلوچ | سیاسی رہنماور کن مرکزی کمیٹی نیشنل پارٹی |
| قاضی عبدالحمید شیرزاد | ایڈووکیٹ ہائی کورٹ |
| شام کمار | دانشور اور مصنف |
| یار جان بادینی | دانشور اور صحافی |
| صدیق بلوچ | ایڈیٹر، روزنامہ آزادی وڈیلی بلوچستان ایکسپریس |
| امین اللہ فطرت | اسٹاف رپورٹر روزنامہ جنگ کوئٹہ |
| عبدالروف مینگل | رہنما نیشنل پارٹی بلوچستان[مینگل]سابق رکن قومی اسمبلی |
| ہدایت الرحمٰن بلوچ | سیکرٹری جنرل، جماعت اسلامی بلوچستان |
| منظور بلوچ | لیکچرار، بلوچستان یونیورسٹی |
| فاروق سرور | ایڈووکیٹ، لکھاری |
| امان اللہ شادیزئی | دانشور وصحافی، صدر بلوچستان یونین آف جرنلسٹ |
| سلیم شاہد | صحافی، ڈان نیوز |
| صابرہ اسلام ایڈووکیٹ | نیشنل پارٹی |
| ڈاکٹر عبدالحئی بلوچ | سابق صدر نیشنل پارٹی، سابق رکن قومی اسمبلی وسابق سینیٹر |
| جمعہ خان گاجانی | سابق ناظم |
| راحب خان بلیدی ایڈووکیٹ | چیئرمین، ایگزیکٹو کمیٹی بلوچستان بار کونسل |
| حاجی عطاء اللہ لانگو ایڈووکیٹ | وائس چیئرمین، بلوچستان بار کونسل |
| نصیر احمد سنگلزئی ایڈووکیٹ | ہائی کورٹ بلوچستان |
| ساجد ترین ایڈووکیٹ | ہائی کورٹ بلوچستان |
| سلیم لاشاری ایڈووکیٹ | ہائی کورٹ بلوچستان |
| اصغر پانیزئی ایڈووکیٹ | ہائی کورٹ بلوچستان |
| جمیل آغا ایڈووکیٹ | ہائی کورٹ بلوچستان |

# بلوچستان: صورت حال اور اقدامات-بلوچ قیادت کی نظر میں

## تعارف[1]

بلوچستان کا رقبہ ۳۴۷۱۹۰ مربع کلومیٹر ہے جو پاکستان کے کل رقبے کا ۴۴ فیصد ہے۔ ۲۰۱۷ء کی مردم شماری کے مطابق اس کی کل آبادی ایک کروڑ ۲۳ لاکھ ۴۴ ہزار ۴۰۸ افراد پر مشتمل ہے اور یہ پاکستان کی کل آبادی کا تقریباً ۶ فیصد ہے۔ صوبہ بلوچستان کی سرحدیں شمال میں افغانستان، مغرب میں ایران، مشرق میں پاکستان کے تینوں صوبوں اور جنوب میں بحیرہ عرب سے ملتی ہیں۔ بلوچستان کا ساحل ۷۷۰ کلومیٹر طویل ہے اور اس پر گوادر، پسنی اور سونمیانی کی بندرگاہیں بھی واقع ہیں۔ منفرد محل وقوع اور ساحل کی بنا پر یہ دنیا کے مغرب کو مشرق سے ملانے کے لیے ایک مختصر راستہ فراہم کرتا ہے۔ بلوچستان کی سرزمین معدنیات سے مالامال ہے یہاں پر تیل و گیس، سونا، تانبا، کوئلہ، کرومائیٹ، لوہا، سلفر سمیت دیگر معدنیات کے وسیع ذخائر موجود ہیں۔

مقامی لوگوں کے لیے تو یہاں کا باسی ہونے کی بناء پر علاقہ کے ساتھ وابستگی کی فطری اہمیت ہے۔ مگر اپنے جغرافیائی محل وقوع، اسٹریٹجک اہمیت اور معدنیات کے وسیع ذخائر کی بدولت یہ دنیا کی بڑی قوتوں کے لیے بھی غیر معمولی دلچسپی کا باعث ہے۔ بالخصوص گوادر کی تجارتی و تزویراتی (Strategic) اہمیت نے بحیرہ عرب میں بالادستی کے حوالے سے مختلف عالمی اور علاقائی قوتوں کے لیے امکانات اور خطرات پیدا کیے ہیں۔ گوادر بندرگاہ کی تعمیر اور

---

[1] سیمینار کے آغاز میں ایگزیکٹو پریزیڈنٹ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز خالد رحمٰن کی گفتگو سے ماخوذ

اس سے متعلقہ پاک چین اقتصادی راہداری کے معاہدے (CPEC) کو جہاں بعض قوتیں اپنی بالادستی کے لیے خطرہ سمجھتی ہیں وہیں کئی دیگر اس کے تجارتی امکانات کے باعث خطے کے معاشی مرکز کے یہاں منتقل ہونے سے خوش نہیں ہیں۔

دوسری جانب قیام پاکستان سے لے کر اب تک صوبہ بلوچستان اور مرکز کے تعلقات مشکلات کا شکار رہے ہیں۔ اس صورت حال نے صوبہ کو مسلسل عدم استحکام کا شکار رکھا ہے۔ ان مشکلات سے صرفِ نظر اور کسی حقیقی پائیدار حل کی جانب بڑھنے کے بجائے وقت گزاری پر مبنی رویہ، سرد مہری اور بداعتمادی کا نتیجہ ۱۹۴۸، ۱۹۵۸، ۱۹۶۳، ۱۹۷۳ء اور اب ۲۰۰۵ء سے جاری پانچ مزاحمتوں اور فوجی آپریشنز کی صورت میں نکلا۔ اس تمام عرصے میں طاقت کے بار بار کے استعمال، مؤثر مذاکرات نہ ہونے، عہد شکنیوں اور حقِ حکمرانی کی کشمکش نے ایک جانب صوبہ اور مرکز کو آمنے سامنے لا کھڑا کیا اور دوسری جانب خود بلوچوں کو بھی فیڈریشن کے حامی اور مخالف گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ اس دوران مرکز مخالف گروہوں کے مطالبات بھی حق حاکمیت، وسائل پر اختیار اور وسیع تر صوبائی خود مختاری سے آزادی کے مطالبے تک جا پہنچے۔ اب بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صوبے کے سیاسی منظر نامے میں بداعتمادی، احساس محکومی و محرومی، غیر یقینی اور شکوک و شبہات کے عناصر نمایاں ہیں۔ دونوں جانب دوریاں اور غلط فہمیاں بڑھتے بڑھتے شدید تلخیوں کی صورت اختیار کر چکی ہیں۔

اس تمام تر بحران کے مختلف پہلوؤں کا اگر جائزہ لیا جائے تو اس میں تہہ در تہہ کئی عوامل کارفرما ہیں۔ بلوچ قیادت شروع دن سے مقامی سطح پر حق حکمرانی اور مرکز کی سطح پر مؤثر شراکت داری کا مطالبہ کرتی آ رہی ہے۔ مگر قیام پاکستان کے بعد ایک مختصر عرصے میں ہی ہمارے بانی قائدین کے بچھڑ جانے سے معاملات روایتی سیاست دانوں، سول و فوجی بیوروکریسی پر مشتمل ایک ایسے طبقے کے ہاتھ میں آ گئے جن میں سے بیشتر کی ترجیحات قومی مفاد اور بہبود کے بجائے محض ذاتی اقتدار اور طاقت رہی ہیں۔ انہوں نے بلوچ قبائل کی باہم تقسیم کو بالعموم اپنے مفادات کے لیے استعمال کیا اور دوسری جانب مقامی و مرکزی، ہر دو سطح

پر اس حکمران طبقے میں عام بلوچوں کی نمائندگی محدود رہی۔ اس سے بلوچستان سے متعلق معاملات جن کے ہاتھ میں آئے وہ اپنے مخصوص انفرادی اور گروہی مفادات کے تحت سرگرم رہے اور یا ایسے لوگوں کے ہاتھ میں رہے جن کو نہ تو بلوچ معاشرے و نفسیات کا علم تھا اور نہ ہی بلوچستان سے دلچسپی۔ آئینی طور پر اعلیٰ ترین عہدہ یعنی گورنر کے لیے بعض اوقات غیر بلوچستانی افراد تعینات کیے جاتے رہے۔ یہی صورت صوبے کے اعلیٰ انتظامی عہدے مثلاً آئی جی پولیس، ڈی آئی جی، آئی جی ایف سی، چیف سیکرٹری وغیرہ کی رہی ہے۔

سیاسی نمائندگی اور احساس شرکت بذات خود بہت اہم ہے لیکن صورت حال کے بگاڑ میں اس حقیقت نے بھی ایک بڑا کردار ادا کیا کہ پسماندگی کے اعتبار سے بلوچستان ملک بھر میں سب سے آگے ہے۔ تعلیم، صحت، پینے کے صاف پانی اور نکاسی آب کی سہولتیں ہوں یا بجلی اور گیس[1] کی فراہمی یا مواصلات کی سہولتیں، بلوچستان پر بالعموم کم ہی توجہ دی گئی ہے۔

اس تمام تر صورتحال میں بلوچستان کی سیاسی قیادت اور دانشوروں میں عمومی طور پر یہ احساس پیدا ہوا کہ ان کو بدستور ایک 'نو آبادی' کے طور پر چلایا جارہا ہے اور یہ احساس محکومی و محرومی بڑھتے بڑھتے مرکز گریز رویوں کی صورت اختیار کرتا گیا۔ اس دوران ہر دو طرف سے فاصلے اتنے بڑھتے گئے کہ ایک دوسرے کے ہر اقدام و مطالبے کو شک کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔ اس بداعتمادی کی فضا میں بلوچستان سے اٹھنے والی آوازوں کو 'بغاوت' سے تعبیر کیا گیا۔ مسائل کے حل کی بجائے طاقت کے استعمال نے معاملات کو مزید گھمبیر شکل دی اور اس کے نتیجے میں بحران در بحران جنم لیتے گئے۔

آج بلوچستان میں پانچویں مزاحمت جاری ہے۔ اور اگر ہم حالیہ اور گزشتہ تمام

---

[1] گیس کا معاملہ بالخصوص اس اعتبار سے بہت حساس ہے کہ گیس ۱۹۵۲ میں بلوچستان کے علاقہ سوئی سے دریافت ہوئی۔ چند ہی برسوں میں یہ ملک کے دوسرے صوبوں میں کراچی، لاہور، اسلام آباد یا پشاور تک پہنچادی گئی لیکن کوئٹہ تک اسے فراہم ہونے کے لیے ۱۹۸۵ تک انتظار کرنا پڑا جبکہ بلوچستان کا بہت سا علاقہ آج بھی اس سے محروم ہے۔

مزاحمتوں کی وجوہات کا جائزہ لیں تو ان کے پیچھے صوبے اور مرکز کے درمیان پیدا ہونے والی بدگمانیوں نے اہم کردار ادا کیا۔ ناراض بلوچ قیادت کا مؤقف ہے کہ ۱۹۴۸ء میں جب کچھ بلوچ حلقوں میں غیر مشروط الحاق سے متعلق تحفظات پائے جاتے تھے اور وہ کچھ باضابطہ ضمانتیں چاہتے تھے تو بجائے ان تحفظات کو دُور کرنے کے جلد بازی کی گئی۔ اس کشیدہ ماحول نے خان قلات کے چھوٹے بھائی اور مکران کے گورنر شہزادہ عبدالکریم کی سرکردگی میں پہلی مزاحمت کی راہ ہموار کی۔ اس موقف کے تسلسل میں ہی یہ بات کہی جاتی ہے کہ خان قلات میر احمد یار خان کی ۱۹۵۰ء کی دہائی میں اپنی ریاست کی بحالی کی کوششیں کوئی غداری نہیں بلکہ ریاست قلات کے پاکستان سے الحاق کے معاہدے کے عین مطابق تھیں مگر بجائے اس کے کہ معاملات کو مذاکرات سے حل کیا جاتا ملک میں مارشل لاء نافذ کر کے قیام پاکستان میں اہم کردار ادا کرنے والے رہنما میر احمد یار خان کے محل پر حملہ ہوا اور ان پر بغاوت کے الزامات لگا کر ان کو نظر بند کر دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۵۸ء میں نواب نوروز خان زہری نے مزاحمت شروع کی۔ اس مزاحمت کو ختم کرنے کے لیے ان سے مذاکرات کے بعد جس طرح عہد شکنی کی گئی اس نے بلوچ نفسیات پر ایک ایسا نقش چھوڑا جس سے آج تک ناراض حلقے وفاق پر اعتبار کو تیار نہیں۔ اسی طرح ۱۹۶۰ کی دہائی میں بھی قبائلی نفسیات اور بلوچ روایات کو جانے بغیر اپنی پسند کی پالیسیاں نافذ کرنے کی جو سعی کی گئی اس کے نتیجے میں بلوچستان میں شورش بڑھتی رہی اور اس کا دائرہ بھی بڑھتا گیا۔

۱۹۷۰ میں بلوچستان کو صوبے کا درجہ ملنا ایک مثبت فیصلہ تھا۔ لیکن جب وہاں کی قیادت انتخابات کے نتیجے میں ایک حکومتی شراکت دار کے طور پر ابھری اور صوبے میں نیشنل عوامی پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو بجائے اس کے کہ اس موقع سے تعمیر و شراکت کے حوالے سے فائدہ اٹھایا جاتا ایک بار پھر غداری اور بغاوت کے الزامات پر منتخب صوبائی حکومت کو برطرف کیا گیا۔ اس عمل اور اس کے نتیجے میں شروع ہونے والی مزاحمت نے نہ صرف بعض اہم بلوچ رہنماؤں کو ہمیشہ کے لیے پارلیمانی سیاست سے دور کر دیا بلکہ ۱۹۷۳ء کا

متفقہ آئین بھی قومی اسمبلی کے بلوچستان سے تعلق رکھنے والے پانچ میں سے تین ارکان کی توثیق سے محروم رہا۔ حالیہ شورش نے نواب اکبر خان بگٹی کی شہادت [۲۰۰۶ء] کے بعد زور پکڑا۔ اکبر بگٹی بلاشبہ بلوچ قیادت میں اہم مقام کے حامل تھے۔ اپنے وقت میں بلوچستان کی اس بڑی قد آور شخصیت کو جن حالات کا شکار بنا کر ہلاک کیا گیا اس سانحہ کے اثرات سے بلوچستان آج تک نہیں نکل پایا۔ بلاشبہ اس کے نتیجے میں اندرونی اور بیرونی شورش پسند قوتوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا جس کی وجہ سے بحران کا حل نہیں نکل پا رہا ہے۔

دوسری جانب بلوچستان کے اندرونی عوامل سے بھی صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ مختلف ادوار میں جن ناانصافیوں کا ذکر کیا جاتا ہے ان تمام معاملات میں ہر دور میں کوئی نہ کوئی بلوچ رہنما بھی مرکز کا معاون کار رہا ہے۔ یعنی جن لوگوں کو وفاق کی قربت نصیب بھی ہوئی تو بجائے اس کو اپنے عوام کی فلاح اور صوبے اور مرکز کے درمیان پل بننے کے لیے استعمال کرنے کے، انہوں نے اپنے ذاتی و گروہی مفادات کو ترجیح دی۔ اور حکومت کو اپنے سیاسی و قبائلی مخالفین کے خلاف شہ دے کر دوریوں اور غلط فہمیوں کو تصادم کی نہج تک لے گئے۔ قیام پاکستان سے لے کر آج تک ہمیں ایک ایسا طبقہ بھی نظر آتا ہے جو نسل در نسل برسر اقتدار ہے مگر ان کے علاقوں کا حال بھی باقی بلوچستان سے شاید کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ صوبہ کی پسماندگی اور مقامی آبادی کی بدحالی میں خود بلوچستان کے بعض سرداروں اور ان کی زیر قیادت قائم حکومتوں کی نااہلی اور بدعنوانی کا بھی بڑا حصہ ہے۔ ایسے میں آج کی صورت حال کے ذمہ داروں کے درست تعین میں بلوچستان کے اندر ایک جائزے اور جواب دہی کی ضرورت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ گزشتہ دہائی میں سیاسی اور فوجی قیادت کی طرف سے بلوچستان کے خصوصی حالات کو دیکھتے ہوئے محرومیوں کے خاتمے، ترقی کے مواقع فراہم کرنے اور ناراض بلوچ قیادت کو قومی دھارے میں لانے کے متعدد اقدامات اٹھائے گئے ہیں۔ اس حوالے سے حکومتی و وفاقی سطح پر اٹھارویں ترمیم کے ذریعے صوبائی خود مختاری،

آغاز حقوق بلوچستان پیکج، این ایف سی ایوارڈ کا از سر نو تعین اور فوج کی جانب سے بلوچستان کے نوجوانوں کے لیے فوج میں خصوصی بھرتی جیسے اقدامات اٹھائے گئے جن کی نظیر ماضی میں نہیں ملتی۔ یہ اقدامات اگرچہ کافی نہ ہوں مگر انتہائی اہم اور بنیادی نوعیت کے ضرور ہیں جن سے مستقبل کا لائحہ عمل طے ہونا ہے۔ تاہم بداعتمادی، ذہنی فاصلوں اور ایک دوسرے کی نیتوں پر شک کی وجہ سے ان مثبت اقدامات کے نتائج اور اثرات بھی اس طرح سے سامنے نہیں آئے جس طرح سے امید کی جارہی تھی۔ اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ ان فاصلوں اور بداعتمادیوں کو رابطوں اور بات چیت کے ذریعے دور کیا جائے تاکہ مستقبل میں تعاون کی نئی راہیں تلاش کی جاسکیں۔

اس پس منظر کے ساتھ اگر ہم آج کی صورتحال پر غور کریں تو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اندرونی شورش کے ساتھ ساتھ بیرونی قوتوں کی سرایت سے اب بلوچستان میں جاری کشمکش ایک بین الاقوامی عنوان کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ۲۰۱۳ء میں CPEC کے اعلان اور پھر اس حوالہ سے اقدامات نے نئے امکانات اور خدشات کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی عناصر کی دلچسپی کو بھی اور زیادہ بڑھادیا ہے۔ خطہ میں موجود اور خطہ سے باہر پاکستان دشمن عناصر اس صورت حال سے ہر ممکن فائدہ اٹھانے کے لیے جارحانہ انداز میں سرگرم ہیں۔

ایسے میں چیلنجوں کا سامنا کرنے اور بلوچستان میں جاری کشمکش کے پائیدار حل کے لیے ضروری ہے کہ ملکی پالیسی ساز حلقوں اور بلوچستان کی قیادت کے درمیان مؤثر رابطہ کاری اور مکالمے کی راہ ہموار کی جائے تاکہ دوریوں، بداعتمادیوں اور غلط فہمیوں کا سدباب ہوسکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک وعوام کے مفاد میں تمام سٹیک ہولڈرز کو ایک دوسرے کو سننا ہوگا۔ سیاسی مسائل کو طاقت کے ذریعے حل کرنے کی کوششوں کے بجائے بلوچ قوم پرست عناصر ہوں یا قومی وصوبائی سطح پر پالیسی ساز حلقے، سب کو یہ تسلیم کرنا ضروری ہے کہ سننے اور سنانے اور بات چیت کے عمل سے ہی مستقبل کا لائحہ عمل طے ہوسکتا ہے۔

اسی سلسلے میں ایک قدم اٹھاتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کی جانب سے بلوچستان بار کونسل کے اشتراک سے کوئٹہ میں ایک خصوصی سیمینار کا انعقاد کیا گیا۔ پیش نظر یہ تھا کہ بلوچستان کے حوالے سے غیر حکومتی نقطہ نظر کو وہاں کی متنوع سیاسی قیادت اور متحرک اہل علم کی زبانی سنا اور سمجھا جائے اور ارباب اختیار اور پالیسی سازوں کے سامنے اسے پیش کیا جائے تاکہ اس سے مستقبل میں مؤثر مکالمے کی راہ ہموار ہو۔ زیر نظر دستاویز اسی سیمینار کے مباحث پر مشتمل ہے۔

بلوچستان کے بارے میں شائع ہونے والی رپورٹوں اور تجزیوں کی کوئی کمی نہیں ہے یوں دیکھا جائے تو اس سیمینار میں زیر بحث آنے والے بہت سے نکات بھی نئے نہیں ہیں اور بعض اوقات ایک ہی نکتہ کی تکرار بھی محسوس ہو سکتی ہے۔ چنانچہ یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہ کوئی نئی تحقیقی دستاویز نہیں ہے۔ سیمینار کا مقصد صورتحال سے آگہی اور دیوار کی دوسری جانب کا نقطۂ نظر جاننا اور پیش کرنا تھا۔ اس دستاویز کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اس سے مختلف اہم ایشوز کے ساتھ ساتھ بلوچستان کی موجودہ کیفیت، جذبات اور لب ولہجہ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ زبان وبیان میں ضروری ادارتی تبدیلیاں تو ناگزیر ہوتی ہیں لیکن اسی نقطۂ نظر سے ہم نے کوشش کی ہے کہ سیمینار میں شرکاء کی جانب سے جو کچھ کہا گیا ہے اس کے بنیادی متن کو جوں کا توں اور اسی ترتیب میں کاغذ پر منتقل کر دیا جائے جس میں وہ اصل میں پیش ہوا ہے۔

خالد رحمٰن
ایگزیکٹو پریزیڈنٹ
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

# ابتدائی کلمات

**راحب خان بلیدی** ایڈووکیٹ
چیئرمین ایگزیکٹو کمیٹی بلوچستان بار کونسل

میں سب سے پہلے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کے ایگزیکٹو پریزیڈنٹ اور ڈائریکٹر جنرل خالد رحمٰن کا شکر گزار ہوں جنہوں نے بلوچستان بار کونسل کو یہ اعزاز بخشا اور ان کی مہربانیوں کی بدولت آج ہم نے بلوچستان بھر کے تمام ادیبوں، دانش وروں، سیاسی کارکنوں، سیاسی مفکروں اور وکلاء کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا کہ وہ بلوچستان کے بنیادی مسائل کے بارے میں اظہار خیال کریں۔

میرے بلوچستان کے بنیادی مسائل وہ مسائل ہیں جن پر ابھی تک ارباب اختیار واقتدار نے کبھی سنجیدگی سے بات کرنے کی اجازت نہیں دی ہے۔ بلوچستان جو کہ معدنی وسائل سے مالا مال صوبہ ہے آج بھی بنیادی ضروریات زندگی سے محروم ہے۔ سی پیک دنیا میں رابطوں کا ایک بہت بڑا منصوبہ ہے جو کہ گوادر کے مقام پر بننے جارہا ہے لیکن گوادر کے عوام آج بھی پینے کے صاف پانی سے محروم ہیں۔ چاغی میں واقع سینڈک کے مقام پر سونا نکلتا ہے لیکن چاغی آج بھی بنیادی سہولیات سے محروم ہے۔

بلوچستان کے عوام احساس محرومی کا شکار ہیں۔ ملک کے اندر بدامنی کی بڑھتی ہوئی لہر سے جہاں پورا ملک متاثر ہوا ہے وہاں سانحہ ۸ر اگست [۲۰۱۶ء] یعنی وکلاء پر ہونے والا حملہ تاریخ کا ایک بھیانک عمل ہے۔ آج کی کانفرنس میں پورے بلوچستان کے اہل قلم ودانش کی موجود ہیں، ہم توقع کرسکتے ہیں کہ یہاں مسائل کی بے لاگ نشان دہی ہوگی۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کی جانب سے اپنے دائرہ میں ان مسائل کی نشان دہی کے لیے اقدامات قابل ستائش ہیں۔ امید رکھتا ہوں کہ آج کی اس کانفرنس کے نتائج آنے والے دنوں کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے اہمیت کے حامل ہوں گے۔

# اہم نکات: سیمینار میں اٹھائے جانے والے نکات کی تلخیص

سیمینار میں سینئر سیاست دانوں، سابق اراکین پارلیمنٹ و صوبائی اسمبلی، سابق سول سرونٹس، سینئر وکلاء، دانش وروں اور میڈیا ماہرین نے شرکت کی۔ سیمینار میں زیر بحث آنے والے درج ذیل نکات ان مختلف پس منظر رکھنے والے بلوچ ماہرین پر مشتمل چنیدہ گروہوں کی جانب سے اٹھائے جانے والے مسائل اور شکایات کا خلاصہ ہیں۔ قابل ذکر طور پر جہاں تمام شرکاء کی جانب سے مایوسی اور ناراضگی کا اظہار کیا گیا وہیں نقطہ ہائے نظر میں انتہا اور اعتدال کے حوالے سے تنوع بھی موجود تھا۔ دوسری جانب بلوچستان کی صورتحال کے حوالہ سے اس اظہار خیال میں مقامی سطح پر داخلی محرکات، قومی سیاست اور علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر جاری کشمکش کے حوالہ سے بہت سے عوامل زیر بحث آتے رہے۔ درحقیقت بحث میں شریک ہر فرد کی گفتگو اس حوالہ سے بے حد مفید ہے اور اس لائق ہے کہ اسے پوری توجہ سے پڑھا جائے۔ اس پس منظر میں زیر نظر رپورٹ میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ خیالات، احساسات اور جذبات کو سمجھنے کے لیے باتوں کو اسی شکل میں تحریر کیا جائے جس میں ان کا اظہار ہوا اور مکالمہ کی کسی بھی کوشش میں اس ماحول کو پیش نظر رکھا جاسکے۔ اسی تسلسل میں ذیل میں محض ان نکات کا احاطہ کیا جارہا ہے جو بلوچستان کی موجودہ صورتحال میں بلوچستان کی قیادت کی جانب سے پیش کردہ مقدمہ کو سمجھنے میں مدد دے سکے۔

- ہمیں اپنی ثقافت سے محروم کیا جارہا ہے۔ ریاست کو بلوچستان کے لوگوں میں نہیں بلکہ یہاں کی زمین اور وسائل میں دلچسپی ہے۔ ہم اپنی زمین پر اپنا نظام چاہتے ہیں۔ ہمارے ساتھ مفتوحوں والا سلوک کیا جارہا ہے اور اسی حیثیت میں ہم سے اپنی ثقافت، شناخت، اقدار اور حتّٰی کہ معیشت بھی ترک کرنے کا مطالبہ کیا جارہا ہے۔

ہمارے ساتھ ایک قوم جیسا سلوک نہیں کیا جاتا۔

- بلوچستان بلوچوں کی سرزمین ہے۔ ہمیں یہاں اقلیت میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ مردم شماری سمیت گوادر میں انتقال آبادی اور پراپرٹی کے کاروبار میں ماورائے قانون سرمایہ کاری کے مسائل ہیں۔ خدشہ ہے کہ گوادر منصوبے کی وجہ سے بلوچ اپنی ہی زمین پر اقلیت میں بدل جائیں گے۔
- ہمیں ان زمینوں پر آزادانہ نقل و حرکت کی اجازت نہیں جو صدیوں سے ہماری ملکیت ہیں۔ غیر مقامی افراد ہماری نقل و حرکت کو دیکھتے ہیں۔ ہر جگہ تلاشی کے لیے چوکیاں قائم ہیں۔ ان غیر مقامی افراد کے لیے ہم نہیں، ہمارے شناختی کارڈ زیادہ اہم ہیں۔ یہ ہماری تضحیک کرتے ہیں۔
- ہمارے لوگ، نوجوان اور حتی کہ خواتین تک برسوں سے لاپتہ ہیں، جن میں بہت سے اپنا جرم جانے بغیر مارے جاچکے ہیں۔ ہم میں سے ہر کوئی یا تو اس سے متاثر ہوا ہے یا کم از کم ایسے کئی واقعات کی معلومات رکھتا ہے۔
- انگریزوں نے قبائلی نظام کو قبول کیا۔ وہ قبائلی معتبرین کے ساتھ شائستگی اور احترام کے ساتھ معاملات طے کرتے تھے اور ان کی رسوم و ثقافت کو مدنظر رکھتے ہوئے گنجائش پیدا کرکے اپنے مفادات خوشگوار ماحول میں طے کرتے تھے۔ آج سب کچھ زور اور طاقت کے بل پر مسلط کیا جارہا ہے۔ نواب اکبر بگٹی کے ساتھ سوئی کا مسئلہ باآسانی بات چیت کے ذریعے حل کیا جاسکتا تھا مگر ان کو موقع دینے کی بجائے مار دیا گیا۔ یہ ہمارے لیے ایک سبق ہے کہ قیمتی قدرتی وسائل زمین کے نیچے دفن رہیں تو بہتر ہے وگرنہ یہ دریافت ہوئے اور نکالنے کا عمل شروع ہوا تو ہم جان سے جائیں گے۔ اکبر بگٹی اور خیر بخش مری وہ دور ہنماء تھے جنہوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا، اس کے باوجود ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا وہ ہمارے لیے ایک مثال ہے۔

- بلوچستان کو مرکز نے ہمیشہ ڈویلپمنٹ پیراڈائم کے بجائے سیکورٹی پیراڈائم سے چلایا ہے۔
- پارلیمانی نظام میں جب تک پنجاب کی بالادستی قائم ہے، چیزیں کبھی تبدیل نہیں ہوں گی۔ حتّٰی کہ سینیٹ میں جہاں سب کی برابر نمائندگی ہونی چاہیے، اسلام آباد کی تین نشستیں ان کی [پنجاب] تعداد بڑھا دیتی ہیں۔ اسی طرح فاٹا کی آٹھ نشستوں کو ملا کر خیبر پختونخوا کی نشستیں بھی بڑھ جاتی ہیں۔
- پاکستان جیسے وفاق میں قدرتی وسائل پر اختیار صوبوں کے پاس ہونا چاہیے۔ بلوچستان کے معاملے میں یہ مزید ضروری ہے کیونکہ یہاں زراعت کم ہے۔ ۱۸ویں ترمیم سے صورت حال میں کچھ بہتری ضرور آئی ہے مگر اس کے باوجود کسی تنازعے کی صورت میں معاملات کو طے کرنے کا میکنزم نہیں۔ مشترکہ مفادات کی کونسل (CCI) اگرچہ ایسی صورت میں تنازعات حل کرنے والا ادارہ ہے مگر وہ بھی فعال نہیں۔ اس کے اجلاس نہیں بلائے جارہے اور اس کا کوئی مستقل سیکرٹریٹ نہیں جو کہ آئینی طور پر ہونا چاہیے۔ صوبوں کی آبادی کو وفاقی محصولات کی تقسیم کا معیار بنانا بھی زیادتی ہے۔
- چین کے اپنے مفادات ہیں۔ ان کی ضرورت خود کو تیل کی بغیر کسی رکاوٹ کے ترسیل اور ہمارے علاقوں سے معدنی وسائل نکالنا ہے۔ سینڈک ایک مثال ہے کہ جب کچھ عرصہ کے لیے مقامی طور پر چلایا جارہا تھا [یعنی ملازمین میں سے تقریباً ستر فیصد مقامی تھے] تو یہ پیسہ بھی کمارہا تھا۔ اب مرکز کی جانب سے کیے گئے معاہدے کے تحت سب کچھ جو سینڈک میں ہے ان کے [چینیوں] حوالے کر دیا گیا ہے۔ اس کی عملاً کوئی نگرانی نہیں۔ جہاں تک ہمارے استعمال کا تعلق ہے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ [آسٹریلیا میں رجسٹر] ٹیتھیان کارپوریشن ہو یا کوئی چینی کمپنی۔

- سی پیک کے تحت بلوچستان میں توانائی کے جو منصوبے لگائے جارہے ہیں ان کے ماحولیاتی اثرات ہمارے لیے ہوں گے جبکہ فائدہ پنجاب اور دیگر علاقوں کو جائے گا۔ بلوچستان کی توانائی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے تو شاید صرف حبکو پاور کی پیداوار کافی ہو مگر کاغذات کے مطابق اب حبکو کول پاور کے تحت یہاں پیدا ہونے والی بجلی لاہور گرڈ منتقل ہو گی۔

- ہمیں نہیں معلوم کہ سی پیک سے ہمیں کیا ملے گا؟ اس میں کوئی شفافیت نہیں ہے۔ آیا ہم نے گوادر بیچ دیا ہے یا پھر تحفتاً دے دیا ہے۔ ہماری زمین غیر مقامی ہم سے چھین رہے ہیں اور ہمیں وہاں اقلیت میں تبدیل کیا جارہا ہے۔ بہترین ملازمتوں پر غیر مقامی افراد کو تعینات کیا جاتا ہے اور بلوچوں کے لیے معمولی ملازمتیں ہی رہ جاتی ہیں۔

- عصر حاضر میں طاقت کا توازن بدل رہا ہے۔ چین ایک نئے سامراج کے طور پر ابھر رہا ہے اور پرانی طاقتیں اسے محدود کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گی۔ یہ ایک موقع بھی ثابت ہو سکتا ہے مگر لگتا ہے کہ حسب سابق ہم ایک بار پھر اس گریٹ گیم کا شکار ہوں گے جہاں ہمیں معلوم بھی نہیں کہ ہم نے کن شرائط پر ان کو [چین] مدعو کیا ہے۔

- ان مصیبتوں کی ذمہ دار بلوچ قیادت خود ہے۔ ۶۵ اراکین صوبائی اسمبلی، ۱۷ اراکین قومی اسمبلی اور ۲۳ سینیٹرز، سب کا تعلق بلوچستان سے ہے۔ صوبائی بیوروکریسی میں بھی کافی تعداد مقامیوں کی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بلوچوں کی طرف سے معاملات طے کرتے ہیں۔ یہ ان کی ناکامی ہے بلکہ استحصال اور اکثر کرپشن ہے جو کہ ہمارے لیے مسائل پر منتج ہوتی ہے۔

# شرکاء سیمینار کا اظہار خیال

**محمد اسلم بھوتانی**
سابق سپیکر بلوچستان اسمبلی

بلوچستان پاکستان کا ایک اہم حصہ اور صوبہ ہے اور تقریباً آدھا پاکستان ہے۔ پاکستان کے مجموعی زمینی رقبہ کا ۴۴ فیصد ہمارے پاس ہے۔ دنیا کے ہر خطے میں اس کے وسائل، بالخصوص اس کی معدنیات اور ان کے ذخائر اس کی ترقی کا ضامن ہیں۔ لیکن ہمارے ساتھ عجیب اتفاق یہ ہوا ہے کہ ہماری مشکلات اور تکلیفیں، حتّٰی کہ ہمارے اوپر ہونے والی فوج کشیاں بھی ہمارے ان ہی ریسورسز کی وجہ سے ہوتی رہی ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ احساس ہوتا ہے کہ اگر ہمارے پاس یہ وسائل نہ ہوتے، ساحل سمندر نہ ہوتا، سوئی سے گیس نہ نکلتی، ریکوڈک نہ ہوتا، یا واقعی ہماری جغرافیائی پوزیشن ایسی اہم نہیں ہوتی تو شاید ہمارا خطہ بہت ہی پر امن ہوتا۔

جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس کے لیے میرے پاس دلائل ہیں۔ مثلاً ۱۹۵۰ء کی دہائی میں جب بلوچستان سے گیس نکلی تو اس وقت عام خیال یہ تھا اور کہا بھی جارہا تھا کہ بلوچستان میں اس کے ساتھ ترقی آئے گی۔ پورا بلوچستان بہت خوش تھا کہ ہمارے سہانے دن آنے والے ہیں لیکن وہ قدرتی گیس جو آج پورے پاکستان میں سوئی گیس کے نام سے پہچانی جاتی ہے چاہے وہ اب سندھ سے بھی نکلتی ہے لیکن اس کا نام سوئی ناردرن اور سوئی سدرن ہی ہے، اسی سوئی کے نام سے وہ بنائی جاتی ہیں۔ کئی عشروں سے نکلنے والی بلوچستان کی اس گیس نے پورے پاکستان کو ترقی دی لیکن بلوچستان کے لوگ اسی بدحالی میں رہے۔

اس ناانصافی پر یہاں کی قیادت نے بات کرنے اور اپنا حق مانگنے کی کوشش کی تو بجائے حق دینے کے ان کو یہ کہا گیا کہ آپ ملک کے غدار ہیں، آپ ملک کے دشمن ہیں۔

آپ پاکستان کی ترقی نہیں چاہتے۔ حالانکہ یہ کسی نے نہیں کہا تھا کہ پاکستان کی ترقی نہیں چاہتے۔ بلکہ سب کا کہنا یہ تھا کہ بلوچستان کو اس کا حق دیا جائے۔ اس کے وسائل ہیں۔ ہماری بھی خواہش ہے کہ پورا ملک ترقی کرے لیکن ساتھ ہی ہم یہ چاہتے ہیں کہ اگر ہمارے یہاں سے گیس یا کوئی اور ریسورسز نکلتے ہیں تو اس کا پہلا فائدہ ہمیں پہنچنا چاہیے۔ ہماری تگ و دو یہی رہی کہ حقوق کو غداری سے تعبیر نہ کیا جائے تاہم اس کے رد عمل میں جو آپریشنز ہوئے سب کے سامنے ہیں۔ اگر نواب اکبر بگٹی کی شہادت کو ہی لیا جائے تو اس کا تعلق بھی گیس اور اسی حوالہ سے حقوق بلوچستان سے ہے۔

اسی طرح پاور پراجیکٹس ہیں۔ مثلاً حبکو پاور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے بلوچستان میں بڑی سرمایہ کاری ہوگی۔ کول پاور کو تو نظر انداز کر دیں کہ وہ بہت الگ تنازعہ ہے لیکن اس وقت اُوچ، حبیب اللہ کوسٹل پاور اور موجودہ حبکو سے ۲۰۰۰ میگاواٹ سے زیادہ بجلی پیدا ہو رہی ہے۔ اب اگر یہ بجلی بلوچستان کو مل جائے تو ہمارے صوبے میں ایک منٹ کی بھی لوڈشیڈنگ نہ ہو۔ کیونکہ صوبہ کی مجموعی کھپت ۱۱/۱۲ سو میگاواٹ ہے۔ لیکن صورت یہ ہے کہ پراجیکٹ کا نام بلوچستان کا ہے اور ہمیں ان سے محض ۳ سے ۴ سو میگاواٹ بجلی مل رہی ہے۔ درحقیقت اگر ایک پاور ہاؤس کی پیداوار بھی کلی طور پر بلوچستان کے حوالے کر دی جائے تو ہمارے اندھیرے ختم ہو جائیں گے۔

حبکو کول پاور سے متعلق یہ ایک رپورٹ میرے سامنے ہے۔ رپورٹ کے مطابق سی پیک میں یہ سب سے بڑا انرجی پروجیکٹ ہے جو بلوچستان میں لگ رہا ہے۔ لیکن رپورٹ میں دی گئی اس پراجیکٹ کی تفصیل میں واضح طور پر تحریر ہے کہ "Power Evacuation from Gadani to National Grid Lahore" بریکٹ میں لکھا ہے (CPEC)۔ "Power Evacuation from Gadani to National Grid Faisalabad" بریکٹ میں ہے (CPEC)۔ اس کی تفصیلات میں کہیں بھی بلوچستان کا ذکر نہیں آیا کہ مثلاً Power Evacuation from Gadani to Khuzdar, Turbat, Panjgoor, Qillah Saifullah یا یہ معلوم ہو کہ بلوچستان کے کسی اور حصہ میں وہ گرڈ جائے گا۔

یہ وہ چیزیں ہیں جن پر یقیناً احتجاج ہو گا کہ نام ہمارا ہے، دھواں، تکلیفیں، بیماریاں یہ سب بھی بلوچستان کے کھاتے میں ہیں لیکن روشنی کہیں اور ہو رہی ہے۔ ہمیں اس سے بھی کوئی اختلاف نہیں کہ کہیں اور بھی روشنی ہو رہی ہے۔ ہمیں صرف اس پر اعتراض ہے کہ ہمارے گھر میں اندھیرا نہیں ہونا چاہیے اور اگر ہم کہتے ہیں کہ ہمارے گھر میں اندھیرا نہیں ہونا چاہیے تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ہم کسی اور کے خلاف ہیں۔

میں اسی حوالہ سے بلوچستان کے وسائل کو دیکھ رہا ہوں کہ یہ ہماری ترقی کے بجائے ہماری تباہی کا باعث بن رہے ہیں۔ یہ بات واضح ہے کہ اگر گوادر اور اس کے ساتھ سمندر نہ ہوتا تو CPEC کے لیے سرے سے کوئی بنیاد ہی نہ ہوتی۔

اللہ کرے کہ اب CPEC ہماری خوشحالی کا سبب بنے لیکن ہم جو کچھ ۶۰ء۷۰ سال سے دیکھتے چلے آرہے ہیں اس کی بناء پر تو مجھے بہت خوف اور ڈر لگتا ہے کہ یہ CPEC بھی کہیں ہماری اور زیادہ تباہی اور بربادی کا باعث نہ بن جائے۔ یہ میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ سوئی گیس میں تو بین الاقوامی قوتوں کا اثر اور Involvement نہیں تھی لیکن سی پیک میں چین کی موجودگی بین الاقوامی قوتوں اور ہمارے اڑوس پڑوس کے ممالک کو اپنی ترجیحات کے حوالے سے اچھی نہیں لگ رہی ہے۔ چنانچہ مجھے ڈر اور خوف ہے کہ ہمارے ہاں محدود قسم کی جو عسکریت چل رہی ہے اس میں کہیں تیزی نہ آجائے اور بین الاقوامی طاقتیں اپنی سیاست اور اپنے مفادات کے لیے اس مزاحمت کی کھل کر حمایت نہ شروع کر دیں۔

اگرچہ سب ہی جانتے ہیں کہ CPEC ایک اکنامک پراجیکٹ ہے اور اکنامک سرگرمیاں وہاں ہوتی ہیں جہاں امن ہوتا ہے۔ تو شاید چین کی دلچسپی تو امن میں ہی ہو گی لیکن کیا چین کی مخالف قوتیں بھی اس امن کو برقرار رکھنا چاہیں گی؟ آپ دیکھیں کہ گوادر میں ایک دھماکہ ہوتا ہے تو وہاں کی زمینوں کی قیمتیں دھڑام سے گر کر نیچے آجاتی ہیں۔ اس طرح کی اگر مارا ماری رہی تو CPEC کا اقتصادی پہلو تو از خود ہی پس منظر میں چلا جائے گا۔ کیونکہ سرمایہ کار وہاں جائے گا جہاں اس کو تحفظ ملے گا۔ جیسے ریکوڈک کی مثال لے لیں کہ

اگر یہ منصوبہ ہم پر چھوڑ دیا جائے تو شاید ہم اسے بہتر انداز میں چلا سکیں۔ لیکن اس حوالہ سے بھی اسلام آباد سے کسی نہ کسی طرح کی مداخلت ہوتی رہی ہے۔ نتیجہ آپ نے دیکھ لیا ہے کہ بجائے ریکوڈک سے کچھ لینے کے اب شاید ہمیں اسے دینا پڑے۔ شاید آپ کو معلوم ہو کہ کچھ عرصے میں International Court of Arbitration کا فیصلہ آنے والا ہے اور خدشہ یہی ہے کہ اس میں ہمیں اس سے لینے کے بجائے دینے پڑ رہے ہوں گے۔ پھر جب حکومت پاکستان پر معاہدے کی خلاف ورزی کی ذمہ داری آئے گی تو وہ بلوچستان کو ہی پاس آن کر دی جائے گی کہ دیکھیں آپ نے اس معاہدے پر سپریم کورٹ میں مخالفت کی بات کی تھی اس لیے یہ آپ بھگتیں۔ کوئی فائدہ ہوتا ہے تو کوئی اور مستفید ہو گا اور اگر جرمانہ آئے تو شاید ہمارے گلے میں پڑ جائے۔

اس پس منظر میں لگتا یہی ہے کہ ہماری معدنیات اور ہمارے وسائل ہی ہماری تباہی کا باعث بن رہے ہیں۔ مجلس میں بہت سے شرکاء ہیں جو مجھ سے بہت زیادہ باخبر ہیں اور بہت تجربہ رکھتے ہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے موقع دیا کہ ان بڑی شخصیات اور بہت معتبر ناموں کے سامنے اپنی کچھ گزارشات پیش کر سکوں۔

## عبدالحکیم بلوچ

سابق چیف سیکرٹری حکومتِ بلوچستان

اس وقت کوئی لمبی چوڑی تقریر پیشِ نظر نہیں ہے صرف دو چار باتیں عرض کروں گا۔ پہلی بات یہ ہے کہ ہمارے دستور کے مطابق پاکستان ایک وفاقی ریاست ہے۔ فیڈرل اسٹیٹ میں آبادی سے قطع نظر تمام اکائیوں کی نمائندگی سینیٹ یا ایوان بالا میں برابر ہوتی ہے۔ اور پاور سینیٹ Exercise کرتی ہے۔ چاہے یہ اختیار جنریشن آف ویلتھ کا ہو یا ڈسٹری بیوشن کا ہو یا ذرائع آمدنی کا ہو لیکن ہمارے یہاں عملاً ایسا نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پنجاب کا ذریعہ آمدنی بنیادی طور پر زراعت ہے جسے انہوں

نے آئینی طور پر صوبائی عمل داری میں رکھ دیا ہے۔ جبکہ ہمارے وسائل، ہمارا ساحل، ہماری معدنیات بشمول کوئلے کی کانیں وغیرہ جو بلوچستان کے لیے ذریعہ آمدنی ہوسکتے تھے انہیں صوبائی کے بجائے وفاقی Subject رکھا گیا۔ مثلاً سینڈک سے چین کافی گولڈ نکال کر لے جاچکا ہے لیکن اس کا ہمیں کوئی اتا پتہ نہیں ہے، اور نہ ہی اس کا کوئی حصہ ہمیں مل رہا ہے۔ یہ طرز عمل بالکل غلط ہے۔ ہم نے اس کو کسی صورت میں نہ پہلے تسلیم کیا ہے اور نہ اب کریں گے۔ ہم چاہیں گے کہ اگر یہ فیڈریشن ہے تو ہر صوبے کی آمدنی کے جو بڑے ذرائع ہیں وہ اسی صوبہ کے حوالے کیے جائیں۔

معدنیات کے بارے میں بطور دلیل یہ کہتے ہیں کہ یہ زمین کے نیچے سے نکلتا ہے اس لیے فیڈرل کا یا مرکز کا ہے۔ اسی طرح سوئی گیس ہو یا کوئی دوسرے ذرائع ان کا سارا فائدہ فیڈریشن کے نام پر سنٹرل گورنمنٹ لے جاتی ہے جبکہ ہمارے بڑے ذرائع یہی ہیں۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ جو (اصل دولت) Main wealth ہے یہ ہمیں دے دیں۔ لیکن اب تو جو زمین کے اوپر ہے اس پر بھی فیڈریشن کے نام پر مرکز نے دعویٰ کر دیا ہے۔ چنانچہ کے پی میں تمباکو کو بھی اپنے کھاتے میں ڈال لیا، کے پی کو نہیں دیا۔ یہ جو زور زبردستی ہے فیڈریشن میں نہیں چلنی چاہیے۔ چنانچہ ہم صرف مرکز سے یا پنجاب سے، کیونکہ مرکز میں پنجاب ہی Dominated ہے، اپنا یہ حق مانگتے ہیں کہ وہ ہمیں ایک مساوی شہری جیسے کہ پنجاب ہے اس کا حق دیں۔ ہمارے جو مساوی شہری حقوق ہیں ان کو انہوں نے چھینا ہے وہ ہمیں واپس دیے جائیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہمیں سینیٹ میں پوری نمائندگی دی جائے۔ اب سینیٹ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں تمام صوبوں کی نمائندگی برابر ہے لیکن برابر کیسے ہے؟ ۱۰۰ میں سے ہمارے حصے میں ۲۲ ہیں۔ آپ کے پی کا کیس لے لیں۔ جو ۸ سیٹیں فاٹا کو دی ہوئی ہیں انہیں ساتھ ملایا جائے تو پختونخوا کے عملاً ۳۰ ارکان بن جاتے ہیں۔ پنجاب کو لے لیں، اسلام آباد کی ۳ سیٹیں ملا کر ان کے ۲۵ ارکان بن جاتے ہیں۔ صرف سندھ اور بلوچستان کے ۲۲ ممبران ہیں۔ اسلام آباد Capital territory ہے۔ امریکہ میں واشنگٹن Capital

territory ہے تو اس کی سینیٹ میں کوئی نمائندگی نہیں ہے۔ ان کی نمائندگی کچھ میری لینڈ اور کچھ ورجینیا کے ساتھ ہے۔ اس طرح ہمیں سینیٹ میں برابر نمائندگی نہیں مل رہی۔

اب کہتے ہیں بل پہلے ایوان زیریں میں پیش ہو گا اور ایوان بالا کو اس میں کوئی بات کرنے یا ترمیم کرنے کا حق یا ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح تو یہ ایوان بالا نہیں ایک مذاق ہو گیا۔ فیڈریشن میں تو ایوان بالا ہی اہم تر ہوتا ہے جبکہ وہاں ہاؤس آف ریپریزنٹیٹو بھی ہوتا ہے۔ لیکن یہ بھی نہیں ہو رہا ہے، وہاں بھی ایک صوبے کی بالادستی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب ایسٹ بنگال یا مشرقی پاکستان بن گیا تو اس وقت تو آپ Parity کے فارمولے کو تسلیم کرتے تھے یعنی یہ کہ ۵۰ فیصد تو تم لے لو اور ۵۰ فیصد ہم لیں گے۔ اس وقت بھی یہاں پر پنجاب کا ۴۰ فیصد حصہ تھا۔ باقی تین صوبوں کو ۲۰ فیصد بھی نہیں ملا کرتا تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد وہ بھی Right off کر دیا۔ اب جب ہم بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ جی آپ کا تو ۵ فیصد آئین میں ہے۔ جب بنگال کی بات تھی تو Parity تھی اور اب جب بنگال چلا گیا تو اب آبادی کے فارمولے کی بات کر رہے ہیں۔

فیڈریشن میں کبھی ایسا نہیں ہوتا ہے۔ وہاں پر برابر کی سطح پر Distribution ہوتی ہے۔ مثلاً امریکہ میں ایک ریاست Wyoming ہے اس کا ہاؤس آف ری پریزنٹیٹو میں ایک نمائندہ ہے۔ جبکہ سینیٹ میں اس کے دو نمائندے ہیں۔ اس طرح آپ جب تک سینیٹ کو پاور فل/ بااختیار نہیں بنائیں گے جس طرح کہ امریکہ میں ہے اور چاروں صوبائی اکائیوں کو برابر کی نمائندگی نہیں دیں گے تو توازن قائم نہیں ہو گا۔ اور اس وقت تک ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہمارا حق نہیں ملا ہے۔

### امان اللہ کنرانی ایڈووکیٹ

سابق سینیٹر، ایڈووکیٹ جنرل حکومتِ بلوچستان

معدنی وسائل کے حوالے سے میرا تھوڑا بہت تعلق رہا ہے اور دوسری جانب سیاسی

و قانونی دائرہ میں بھی سرگرم رہا ہوں۔ اس حوالہ سے تاریخی پس منظر کے طور پر اور آپ کی دلچسپی کے لیے دو مثالوں کی بنیاد پر صورت حال کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ ہم اپنے حقیقی مسائل کو سمجھ سکیں۔

پہلی مثال بلوچستان سے گیس کی دریافت کی ہے کہ یہ کس طرح کی گئی اور آج بلوچستان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں جو بات کر رہا ہوں وہ نواب اکبر خان بگٹی نے اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنیاد پر بیان کی۔ انہوں نے بتایا کہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء کے درمیان بلوچستان کا AGG (Agent to the Governor General) ان کے والد کے پاس دو دن ٹھہرا۔ یہ کوئی سرکاری دورہ نہیں تھا اس نے خیر سگالی کی بنا پر کہا کہ میں آپ کا مہمان بننا چاہتا ہوں۔ دو دن کے لیے وہ یہاں ٹھہرا اور اس وقت کے سکے کے مطابق مہمان خانے کے خرچ کے لیے اس نے تقریباً ۳ لاکھ کی رقم بطور تحفہ دی۔ اس وقت یہ رواج تھا کہ کسی سردار، نواب یا قبائلی معتبر کے پاس لوگ جاتے تو مہمان خانے کے خرچ کے لیے اپنی بھیڑ بکریاں لے جاتے یا کسی اور حوالے سے کچھ تحفتاً پیش کرتے تھے۔ AGG چونکہ انگریز تھا اور اس اعتبار سے اس کا اس رسم و رواج سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا لیکن یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ یہاں کا رسم و رواج ہے اس نے اس کا اہتمام کیا۔ نواب صاحب کے بقول آگے بھی وہ جن جن سردار یا نواب کی طرف گیا اس نے اس طرح ہی تحفے کے طور پر رقم دینے کا اہتمام کیا۔ نواب صاحب کے خیال میں اس کا یہ اہتمام صرف Goodwill کے طور پر تھا۔ وہ یہ حصہ اس لیے دینا چاہتا تھا تاکہ علاقے کے لوگوں سے کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

نوٹ کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ گیس تو ۱۹۵۲ء میں دریافت ہوئی لیکن انگریز AGG نے جب یہ کام کیا تو یہ اس سے بہت پہلے یعنی ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کا دور تھا۔ درحقیقت یہ برٹش پٹرولیم کے لیے ایک بنیاد تھی جو اس وقت سے ڈال دی گئی۔ اس کے بدلے انہوں نے لیویز کا نظام دیا کہ یہ جو مقامی حکومت ہے یہ آپ کے حوالے ہے۔ گورنمنٹ کی صرف ایک سرویلنس یا نگرانی ہوگی، باقی جرگہ سسٹم ہوگا۔

آج ہم یہ نہیں کہتے کہ یہ قبائلی سسٹم روایتی انداز میں قائم رہے، میں یہ مثال دے کر اس کی پروموشن کی بات نہیں کر رہا۔ میرے خیال میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ انہوں نے لوگوں کو ایک اختیار دینے کا تصور دیا۔ انگریز نے بے شک جبر بھی کیا ہو گا، اسی لیے ہم نے اس سے آزادی بھی حاصل کی اور آج ہم یقیناً بہتر زندگی گزار رہے ہیں۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں۔ وسائل پر اس وقت ان کا قبضہ تھا، سیاسی طور پر خود مختاری بھی نہیں تھی مگر ایک سکول آف تھاٹ کی حیثیت سے میں نے یہ سمجھا ہے کہ انہوں نے لوگوں کے اندر اپنی حاکمیت کا ایک مثبت تصور دیا ہے۔ اور اسی لیے ان کے خلاف کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔

PPL والے خود وسائل نکال کر لے گئے، کوئی باقاعدہ معاہدہ نہیں، بس بھائی بندی کی بنیاد پر تعاون بن گیا۔ نواب صاحب نے یہ بھی بتایا کہ انگریز افسر بالعموم اپنی بیگم کے ساتھ تشریف لاتے تھے۔ غمی کے موقع پر اور شادی میں ہماری طرح پگڑی پہن کر گھوڑے پر سوار ہو کر آتے تھے اور مقامی لوگوں میں اپنے آپ کو اس طرح شمار کرتے تھے کہ ہم آپ میں سے ہیں۔ نواب بگٹی کہتے ہیں کہ اس کے برعکس میں ایوب خان کے دور میں جیل میں تھا تو جیل سے باہر آنے کے بعد بڑی مشکل سے حکومت سے ہم نے جو بات چیت کی تو معاملات نوکری کی حد سے آگے نہ بڑھ سکے۔

نواب صاحب کا آخری جو مسئلہ ہوا، اس کا پس منظر بھی قابل ذکر ہے۔ نواب بگٹی نے ۲۰ نوکریوں کا کہا۔ جس کا میں (امان اللہ کنرانی) ذاتی طور پر گواہ ہوں اور ہم لوگوں نے باقاعدہ لسٹ دی کیونکہ یونین والوں کا ایشو یہ تھا کہ گیس کے ہر کنویں پر ایک چوکیدار ہوتا تھا۔ نواب بگٹی نے کہا کہ اب لیبر لاز آ گئے ہیں، Awareness آ گئی ہے، حالات خراب ہو گئے ہیں اور لوگوں کی ضرورتیں بڑھ گئی ہیں۔ اب ایک آدمی چوبیس گھنٹے ڈیوٹی نہیں کر سکتا۔ دوسری جانب اب سیکورٹی کے مسائل بڑھ گئے ہیں۔ لوگ اب بم پھاڑتے ہیں، جس سے غیر معمولی تباہی ہوتی ہے۔ اس کو روکنے کے لیے ہر کنویں پر ۳ بندے لگائیں۔ تین بندوں سے مراد ۸ گھنٹے ڈیوٹی کے لیے ایک فرد جو سرکاری لیبر لاز کی شرائط کا حصہ ہے۔ بنیادی

طور پر اس مطالبہ پر اختلاف تھا کہ اگر تین بندے رکھتے ہیں تو اس کے بدلے میں ان کو (۱۰۲) اضافی نوکریاں دینی پڑتیں۔ یہ نوکریاں نہیں ملیں اور اس کے بعد پھر ڈاکٹر شازیہ والا کیس ہو گیا جس نے تنازعہ کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوتا رہا وہ آپ کے سامنے ہے۔

انگریزوں کے اس برادرانہ طرزِ عمل کے مقابلہ میں آج یہ تصور ہے کہ ہم نے زبردستی سب کچھ کرنا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آپ لاء اینڈ آرڈر پر خرچ کر رہے ہیں اور ایف سی، پولیس یا لیویز کی طاقت کے ذریعے کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چار گیس فیلڈز ہیں۔ اوچ، لوٹی، پیر کوہ، اور سوئی۔ جتنا سوئی نرمی سے ہینڈل ہوا، بقیہ ہینڈل نہیں ہو سکے۔ آج بھی کبھی گیس لائن پھٹ جاتی ہے یا اور کوئی 'حادثات' ہو جاتے ہیں۔ یہی حال مری کے علاقے کا ہے کہ آج تک وہاں عملاً کوئی رسائی ہی نہیں مل سکی اور یوں وہاں کوئی معدنی دریافت بھی نہیں ہوئی۔

ظاہر ہے کہ اب ہمیں مرنے کا شوق نہیں ہے۔ جیسے کہ بھوتانی صاحب نے کہا کہ نواب بگٹی کے ساتھ جو سلوک ہوا ہے وہ ہم اپنے ساتھ نہیں دیکھنا چاہتے۔ بے شک معدنی وسائل زمین کے نیچے پڑے رہیں امن وامان اور سلامتی تو باقی رہے۔ کیونکہ جب ریسورسز آتے ہیں اور لوگوں کا انٹرسٹ بڑھتا ہے تو پھر لوگوں کو لڑایا اور مروایا جاتا ہے۔ ہم مرنا نہیں چاہتے۔ آخر تک بھی خیر بخش مری نے اپنے علاقے میں رسمی اجازت دی یا نہیں دی لیکن انہوں نے کسی شوق اور گرمجوشی کا اظہار بھی نہیں کیا۔

نواب بگٹی آخر تک یہ کہتے تھے کہ یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم لوگوں نے معاہدات کیے، اگر یہ نہ ہوتا تو ہم کم از کم زندہ تو ہوتے۔ ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ بگٹی قبائل میں بھی آپس کی دشمنیاں ہو گئیں۔ درحقیقت مری علاقے میں اتنی قبائلی دشمنی نہیں ہے جتنی کہ بگٹی علاقے میں ہے۔ سرکار کے ہاتھوں بھی مری کے اتنے لوگ نہیں مرے، کیونکہ مری نے ایک سسٹم کے تحت اپنے آپ کو چلایا، مری نے کبھی ان ایشوز کو زیادہ Highlight نہیں کیا۔ انہوں نے آرام سے اور خاموشی کے ساتھ کام کیا۔ لیکن بگٹی اور اس کی فیملی نے آج سے پہلے

ہر چیز اور اپنے آپ کو ریاست کے حوالے کیا۔ لیکن پھر ریاست نے جو سلوک کیا وہ سب کے سامنے ہے۔ میں اس پر تبصرہ نہیں کرنا چاہتا لیکن آپ اگر موازنہ کریں تو ریاست نے مری کو کم جانی نقصان پہنچایا اور بگٹی کو زیادہ۔ بگٹی نے وسائل زیادہ دیے اور نقصان زیادہ اٹھایا۔

دوسری مثال غیر ملکی کمپنیوں کے ساتھ معاہدات کی ہے۔ سینڈک کے حوالہ سے آج بھی حکومت بلوچستان نالاں ہے کہ ہمارے ساتھ چین جو کچھ کر رہا ہے ہم اس کو روک نہیں پا رہے۔ اس کی وجہ ہے کہ سینڈک کا ایگریمنٹ مرکز نے کیا ہوا ہے اور آج بھی مرکز ہی اس کو فالو کر رہا ہے۔ بنیادی فیصلے اسی کے اختیار میں ہیں۔ بلوچستان کی حکومت نے صرف افتتاحی تقریب منعقد کر دی ہے لیکن کچھ پتہ نہیں کہ حکومت بلوچستان کو کتنا کچھ ملا ہے۔

یہی حال ریکوڈک کا ہے، اس کے بارے میں جتنی تحقیق کریں کم ہے۔ دستاویزات کے مطابق اس کی تین سو سال لائف ہے۔ اور ۶۰۰ مربع کلو میٹر اس کی لمبائی ہے۔ اس کے اندر تانبا اور سونا ہی نہیں جو نسبتاً کم تناسب میں ہے اس سے کہیں زیادہ قیمتی مواد بشمول ایٹمی ضروریات میں استعمال ہونے والا مواد موجود ہے۔ ماہرین کے بقول مختلف قسم کی معدنیات ہیں جس کی کل قیمت کا دنیا کی مارکیٹ میں اندازہ ہی نہیں ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر مختلف لوگوں کی دلچسپی بہت زیادہ ہے۔ سب سے پہلے امریکہ کا پولیٹیکل انٹرسٹ ہے، برطانیہ کی انوسٹمنٹ ہے، کینیڈا کی کمپنیاں ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ چلی کے ماہرین بھی ہیں۔

آسٹریلیا کو انہوں نے ایک پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا ہے۔ کیونکہ پاکستان اور آسٹریلیا کا ۱۹۹۷ء میں نواز شریف گورنمنٹ کے ساتھ معاہدہ ہوا تھا۔ معاہدہ یہ تھا کہ ہم ایک دوسرے کے انوسٹمنٹ کو تحفظ دیں گے۔ اس معاہدہ کو سامنے رکھ کر انہوں نے چالاکی یہ کی کہ رجسٹریشن آسٹریلیا جا کر کرائی۔ یعنی پیسہ لے رہے ہیں برطانوی بینک سے، پولیٹیکلی امریکہ بیک کر رہا ہے، کمپنی کا وجود کینیڈا میں اور ماہرین اور انجینئرز چلی کے ہیں، جبکہ رجسٹریشن آسٹریلیا میں جا کر کراتے ہیں تاکہ اس ٹریٹی کا فائدہ اٹھا سکیں۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ آپ حکومت سے لائسنس لیتے ہیں کہ اگر کچھ دریافت ہوا تو ہم آپ کو بتائیں گے، اتنا آپ کو ٹیکس ملے گا اور آپ کی جو قانونی شرائط ہیں ہم وہ بھی پوری کریں گے اور اگر کچھ نہیں ملا تو یہ ہمارا اپنا نقصان ہے۔ اس میں لینے دینے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ انہوں نے بھی اسی طرح ۱۹۹۳ء میں لائسنس لیے۔ BDA کے ساتھ ایگریمنٹ ہوا۔ ۱۹۹۴ء میں ان کو ۱۳۰۰۰ مربع کلومیٹر کے لیے ۱۹۷۰ء کے رولز کے تحت ۱۰ لائسنس ملے۔ فضائی اور زمینی سروے کرتے ہوئے آہستہ آہستہ وہ اس مجموعی رقبہ سے Withdraw کرتے گئے۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۹ء تک انہوں نے اس کو Narrow down کر کے ۱۰۰۰ مربع کلومیٹر تک محدود کرا دیا۔

قانون یہ تھا کہ کمپنی نے ہر دو سال میں ہمیں ایک رپورٹ دینی ہے کہ ان کی پراگریس (Progress) کیا ہے؟ ۲۰ جنوری ۱۹۹۴ء کو جو پہلا PL (Prospective License) جاری ہوا، اس وقت اس کمپنی کا نام BHP تھا۔ تو BHP کمپنی کو چاہیے تھا کہ ۱۹۹۶ء یعنی پہلے دو سال میں رپورٹ دیتی۔ اس نے رپورٹ ہی نہیں دی۔ رپورٹ نہ دینے کی وجہ یہ تھی کہ اتنا چھوڑو، بعد میں رپورٹ دیں گے۔ لیکن وہ ۲۰۰۰ء تک ایکسٹنشن لیتے رہے رپورٹ کوئی نہ دی اور دوسری جانب ایریا Withdraw کرتے رہے۔ ۲۰۰۰ء کے بعد اس نے اپنی کمپنی کا نام BHP سے تبدیل کر کے چلی کی ایک کمپنی مینکور (Mincor) کو دے دیا۔ رپورٹ طلب کیے جانے پر اب ان کا جواب ملا کہ ہم نے تو اب مینکور کو دے دیا ہے، وہ جانیں اور آپ جانیں۔ اب اس وقت کے ہمارے جو آفیشلز تھے یا تو ان کو پتہ نہیں تھا یا سادگی تھی اور یا چشم پوشی (Connivance) تھی۔ بعد ازاں سارا انٹرسٹ مینکور کو دے دیا گیا۔ BHP سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی گئی کہ تم تو ڈیفالٹر ہو گئے ہو۔ پاکستانی قوانین کے مطابق اصولاً تین بار لائسنس دیا جا سکتا ہے پھر وہ کمپنی ڈیفالٹر بن جاتی ہے۔ جس کے بعد اسے نکالا جا سکتا ہے۔ BHP نے نکلنے سے بچنے کی خاطر اپنے آپ کو سرنڈر کر دیا کہ اب ہم ختم ہیں ہم سے پوچھا نہ جائے تاکہ یہ ایریا بھی ہمارے قبضے میں رہے اور ہم ڈیفالٹرز بھی نہ ہوں۔

مینکور (Mincor) نے ۲۰۰۰ء میں جاکر آسٹریلیا میں TTC بنائی، یعنی اب وہ ٹیتھیان کاپر کمپنی بن گئی۔ ٹیتھیان کاپر کمپنی نے آتے ہی یہ کیا کہ سب سے پہلے تو اس وقت چونکہ عملاً مارشل لاء تھا اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ۱۹۷۰ء کے رولز کا اطلاق ختم کرایا۔ کیونکہ اس کے تحت تو یہ ۶ سال میں ڈیفالٹر ہو چکے تھے۔ نئے رولز کے لیے انہوں نے یہ فیصلہ کرالیا کہ ایک این جی او کمپنی ہو اور اس وقت کے سیکرٹری (یا ڈی جی مائنز) کو کہا گیا کہ آپ ان کی کمپنی کے ساتھ بیٹھیں اور ان کی مرضی سے رولز بنائیں۔ یعنی کمپنی کے اپنی مرضی کے رولز بنائے گئے جبکہ پیسے بھی حکومت پاکستان نے دیے۔ یوں رولز ان کی مرضی کے بنائے گئے جن میں انہوں نے ۲ سال کی کنڈیشن کو ختم کر کے ۳ سال کرالیا۔ نیز یہ طے کر دیا گیا کہ اب یہ پراسپیکٹو لائسنس (PL) نہیں ہو گی بلکہ EL یعنی ایکسپلوریشن لائسنس ہو گا، مدت تین سال ہو گی۔ تین ٹرم کے بعد وہ فزیبلٹی دیں گے تو تقریباً ۹ سال کا یہ عرصہ ہو جائے گا۔ ایریا کے بارے میں بھی یہ طے تھا کہ کسی کو بھی ۱۰۰ ایکڑ سے زیادہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس ایریا کو انہوں نے لامحدود کرا دیا یعنی جس کو جتنا مرضی ہے دے دیا جائے تاکہ ۱۳۰۰۰ کلومیٹر کا ایشو ہی ختم ہو جائے۔ پھر اس کا ریٹ اس وقت مائنز ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے ۵ روپے ایکڑ تھا۔ ۳۳ لاکھ ایکڑ اس وقت تھے۔ وہ بھی حکومت نے بجائے اس کے ان سے لیں انہیں اس طرح معاف کر دیا کہ ۵ روپے کو پہلے ایک روپیہ کیا اور پھر ایک روپے کو بھی Waive-off کر دیا۔ آگے چل کر پھر یہ بھی طے کرایا کہ آپ کا اور ہمارا تنازعہ ہو گا تو بین الاقوامی طور پر طے ہو گا ہماری کورٹ طے نہیں کرے گی۔ پیسوں کا کوئی ایشو نہیں ہو گا، جگہ کا کوئی ایشو نہیں ہو گا مطلب یہ کہ پاکستانی قانون کو ہمارے سامنے معطل کر دو۔ یعنی قانون خود بنایا اور پھر یہ Relaxation بھی مانگتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے ادارے اور ہماری حکومتیں سب کچھ ان کے آگے سرنڈر کرتے رہے ہیں۔

اس دوران میں سابق رکن قومی اسمبلی مولانا عبدالحق بلوچ صاحب اور احسان اللہ وقاص (دونوں جماعت اسلامی کے لوگ تھے) نے اس پورے معاملہ کو بلوچستان ہائی کورٹ میں چیلنج کیا۔ پٹیشن یہ تھی کہ یہ کمپنیاں بہت سی سہولتیں لے رہی ہیں اور کوئی فیس اور ٹیکس

بھی نہیں دے رہیں۔ دوسری جانب قانون کے مطابق ان کو جو کچھ دریافت کرنا چاہیے اس میں بھی پیش رفت نہیں ہے۔ اگر کنٹریکٹ کسی اور کو دے دیا جائے تو امکان ہے کہ پیش رفت ہو گی اور کچھ نہ کچھ فیس تو ملے گی۔ اس تناظر میں مطالبہ یہ کیا گیا کہ معاہدہ بدنیتی پر مبنی ہے اور اس کو ختم کیا جائے۔ تاہم بلوچستان ہائی کورٹ نے پٹیشن مسترد کر دی۔ حکومت نے بھی کہا کہ سب ٹھیک ہو رہا ہے۔ یوں نہ ہائی کورٹ نے مداخلت کی اور نہ ہی حکومتِ وقت نے مخالفت کی۔

مولانا عبدالحق بلوچ ۲۰۰۷ء میں سپریم کورٹ چلے گئے جہاں معاملہ ۲۰۱۰ء تک التواء میں ہی رہا۔ کسی نے اس کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کیونکہ چوہدری افتخار صاحب بھی اس سے پہلے پی سی او کے جج تھے۔ تاہم جب معاملہ میڈیا میں زیر بحث آنے لگا اور دوسری جانب اعظم سواتی صاحب نے ۲۵ سینیٹرز کے ساتھ طارق اسد ایڈووکیٹ اور پھر ظفر اللہ خان کے ذریعے ایک درخواست دی تو کافی لوگ اس جانب متوجہ ہو گئے۔ اس وقت کے چیف جسٹس چوہدری افتخار نے مسئلہ کو سنا اور اس وقت کی بلوچستان حکومت نے خصوصاً نواب اسلم رئیسانی صاحب کے دور حکومت میں اس میں خصوصی دلچسپی لی گئی۔ درحقیقت نواب رئیسانی صاحب پر اثرانداز ہونے کے لیے ان کمپنیوں نے کروڑوں نہیں اربوں روپے کی آفر کی کہ ہماری اس کیس میں مدد کریں۔ لیکن نواب رئیسانی نے ایسی ہر پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ یہ کریڈٹ انہیں دیا جانا چاہیے۔ وجہ کوئی بھی ہو لیکن خوش قسمتی سے ہمارے قومی سلامتی کے ادارے بھی اس معاملہ میں ہم آہنگ تھے۔ اس طرح حکومت کے تمام اہم عناصر ایک پیج پر آ گئے اور یوں ہم ان کمپنیوں کے چنگل سے بچ گئے۔ سپریم کورٹ آف پاکستان نے ۷ جنوری ۲۰۱۳ء کو پٹیشن کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

ہمیں اس وقت بھی امید نہیں تھی کہ بین الاقوامی اداروں میں ہمارے حق میں کوئی فیصلہ ہو گا۔ ہم جانتے ہیں کہ دنیا میں عدل وانصاف اور انسانی حقوق کی باتیں تو بہت ہوتی ہیں لیکن ان پر عمل درآمد اس وقت تک نہیں کیا جاتا جب تک اس میں بڑی طاقتوں کا مفاد نہ ہو۔

یوں ہمیں کوئی توقع نہیں تھی کہ بین الاقوامی اداروں سے ہمیں انصاف ملے گا۔ درحقیقت ایسے حوالوں سے بننے والے ٹریبونل اکثر ان ساہوکاروں کے اپنے ہوتے ہیں اوران کو ادائیگیاں بھی یہی ساہوکار کمپنیاں کرتی ہیں۔ان کاروزگار ان کمپنیوں کے ساتھ وابستہ ہوتاہے اور یہی کمپنیاں ان کی نامزدگی کرتی ہیں۔ انہوں نے فیصلہ بھی پھر انہی کے حق میں کرناہوتاہے۔

اس کے باوجود بین الاقوامی ٹریبونل کا جو فیصلہ آیاہے وہ کوئی جرمانہ بھی نہیں اور Compensation بھی نہیں ہے۔ صرف یہ کہتے ہیں کہ ہم نے جتناکام کیاہے وہ ہمیں پیسے دے دیں۔ تاہم دوسری جانب ٹریبونل کہتا ہے کہ آپ نے آسٹریلیا والے ٹریٹی کی خلاف ورزی کی ہے کیونکہ آپ نے انوسٹمنٹ کو پروٹیکٹ نہیں کیاہے لہٰذا آپ ان کے ساتھ اس میں بیٹھیں۔ یہ نہیں کہا کہ پیسے دیں بلکہ بیٹھ کر طے کریں کہ کتنا نقصان ہوا ہے۔ اب یہ ہے کہ مائننگ کے ایکسپرٹس بیٹھے ہوئے ہیں وہ موقع پر دیکھیں گے ایک دوسرے کے ساتھ دستاویزات شیئر کریں گے اور جتناخرچ اصل ہوا ہے اگر یہ لوگ آپس میں مان گئے توٹھیک ہے ورنہ یہ معاملہ پھر دوبارہ ٹریبونل میں جائے گا۔یوں ابھی تنازعہ باقی ہے۔ ابھی تک صرف تنازعہ کی حدتک ان کے موقف کو تسلیم کیاگیاہے۔

اگلی بات یہ ہے کہ اب آئندہ بھی اگر تنازعہ حل نہ ہواتوبیرونی دنیاکے ساتھ معاہدہ کے حوالہ سے ہمارا ۲۰۱۱ء کا ایک قانون ہے کہ عدالتی فرمان پر (Decree) کس طرح پاکستان میں عمل ہوتا ہے۔ ۲۰۱۱ء کے قانون کے مطابق فارن ایوارڈ کا ایگزی کیوشن ہائی کورٹ کے تصفیے سے مشروط ہے۔یوں جب انہوں نے پیسہ لینا ہواتو وہ بلوچستان ہائی کورٹ میں اپیل کریں گے۔ فطری طورپر جب کیس بلوچستان ہائی کورٹ میں آئے گا تو ان کے سامنے اپنی سپریم کورٹ کا فیصلہ ہوگا جس میں کمپنیوں کے بارے میں جو کچھ بھی کہاگیاہے وہ واضح طور پر ہمارے حق میں ہے۔ اس صورت میں ہم سمجھتے ہیں کہ حال ہی میں آنے والے ٹریبونل کے فیصلے پر کوئی پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔

اصل پریشانی کچھ اور ہے۔ بلوچستان بہت بڑی معدنی دولت ہے۔ یہاں بہت زیادہ امکانات ہیں مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے اندر اس وقت ان امکانات سے فائدہ اٹھانے کی استعداد نہیں ہے۔ نواب بگٹی اور نواب مری بھی یہی کہتے تھے کہ ہمارے اندر ابھی تک معدنی وسائل کو نکالنے کا استعداد نہیں ہے جس کے لیے ہم جلدی کریں۔ اس لیے جو کچھ بھی کرنا ہو اس کے لیے لوگوں کے اعتماد کے ساتھ اور ان کے تحفظات کو دور کرتے ہوئے مل جل کر کام کرنے کی حکمت عملی بنانا ہوگی۔ دنیا میں مغربی جرمنی اور مشرقی جرمنی لڑائی کے بعد بھی اکٹھے ہوگئے، امریکہ کے ساتھ طویل اور مسلسل جاری لڑائی کے باوجود طالبان کا ہیڈ کوارٹر قطر میں بھی بن سکتا ہے تو ہم پاکستانی تو جو کچھ بھی ہیں، بھائی ہیں مسلمان ہیں۔ ہم باہم مل کر فیصلے کیوں نہیں کر سکتے۔

حکیم بلوچ صاحب زیادہ بہتر بتائیں گے کہ دوسرے بہت سے علاقوں کے مقابلہ میں پاکستان اور بلوچستان کے اشتراک کا معاملہ ذرا الگ ہے۔ باقی جگہوں پر تو کہیں ریفرنڈم بھی کرانے کی ضرورت پیش آئی لیکن بلوچستان کے لوگوں نے اپنی سرزمین پاکستان کو دی کہ ہم پاکستان بنا رہے ہیں۔ بلوچستان کی صورتحال اس اعتبار سے باقی پاکستان سے مختلف ہے۔ یہی میری گزارش ہے۔

**منیر احمد بادینی**

سابق سیکرٹری حکومتِ بلوچستان

I would like to start by quoting some great thinkers who rendered "geography is destiny". What they meant by this was that the birth at a certain place, in a certain time is not determined by the individual but by the forces of nature. So, for us, Baloch people, this land Balochistan is our destiny as we have inhabited this place since centuries and we love it. Long ago, one of the nationalist poets of Balochistan, wrote about the minerals of Balochistan in one of his great poems. I don't want to narrate that couplet but it

categorically asked to whom these minerals, gases and gold belong to? These belong to me. So, we think that being destined and blessed to be born on this piece of land which is called Balochistan, everything being found here belongs to us. And that sense of belonging is something which is distinct, a distinct cultural trait of Baloch people. They love their land, they love their language, and they love their environment. They have some sort of inherent feelings about their nationality. Sometimes when we talk about Balochistan with the people of other provinces of Pakistan, they get surprised and comment that we describe or express Baloch as a religious feeling. So, this religiosity is also attached with Balochistan and is being carried from generation to generation as a conferred and emotional attachment.

I don't want to dilate much upon this subject but as my respectable colleagues have talked in the context of the minerals of Balochistan, I feel it imperative to highlight a few things even though I might not be able to talk in quantifiable terms.

No. 1. Considering that geography is destiny, I think the policymakers of Balochistan or Pakistan, whenever they want to coin a policy or whenever they want to figure out something about Balochistan, they must take into consideration that these people of Pakistan have got a special love for their land. And this feeling of belonging cannot be separated from their hearts.

My second point is that to me, today's Pakistan is a modern nation state by all means and nobody can deny this fact. But this modern nation state is also a blend (immingling) and is trying to find its legitimacy as all other modern nation states that are facing the problem of ethnicity. The problem of ethnicity and the nationalistic feeling among their units is a bare fact. Pakistani policymakers, in one way or other have to take into consideration this fact that this is a multinational state. So, if Pakistan wants to be a modern nation state in the real sense of the word, it has to take into consideration its four or five parts, one we have lost, the

bigger part is lost unfortunately and that was Bengal. I was a college student when Bangladesh came into being and today when I read or write about the incident, my heart aches. I don't intend to praise myself but I have written a hundred novels and a few of them depict this ethos of Pakistan. How East Pakistan was being disintegrated? How the majority part of Pakistan got separated from the minority when otherwise there are minorities who separate themselves from a majority. In case of Bangladesh it was the other way around and that is a tragic point. At least I can say that we can live in Pakistan but we want our rights being protected within the constitutional limits of this country and it is our birth right that we must fight for our rights. So, for us the important things are that 1. We said geography is destiny and 2. Pakistan nation state must realize its responsibility.

My third point is that culture is a determining factor. Now what is culture? You know that the separation of Bangladesh was not based on the distribution of cotton, it was the language. Bengali nationalism arose on the issue of language when you said that from now on Urdu shall be the national language of Pakistan. So, for me the way I mutualize this core issue of Balochistan and Pakistan is that our language is important. We want to express ourselves and every Punjabi, Sindhi, Baloch and Pushtun want to express themselves effectively. Mother tongues must be taught at the primary level. We have fought for it and we have run certain studies in the area as well that were funded by the UNICEF and the UNESCO. And from the results of those studies, it was revealed that when you are fluent in your mother tongue the learning of a foreign language becomes easy for you. Urdu is a foreign language for me as a Baloch but if I am fluent in Balochi, I could learn Urdu, French or German easily. So, as secretary education we fought for this that we should make mother tongue part of our curriculum. And then comes our literature, our customs and traditions. Yes, we do possess certain bad cultural traits and customs and we want to modernize ourselves according to the requirements of 21st

century. We want to see Baloch in pace with the 21st century and for that we will have to do away with certain old customs and traditions to benefit from the light of the modern education and technology.

Change is my next topic. Change from within and change from outside. Whatever we are feeling in present, the change is coming not from within but it's coming from outside elements. How can you cope with change, if that change is not coming from your own heart? I talked about this before with the President of Pakistan as well and told him that the youth of Balochistan is very important. Till now, it has been ignored but they must get due importance as they form the bulk of the population. They want change, they want the benefits of the modern technology, they want to be part of CPEC, and they want to be part of the rest of the developments going on. If you could involve them in the real sense, only then you can do away with this sense of alienation that prevails amongst the youth of Balochistan.

For brevity I move on to the next point - Development of infrastructure or evolution of ideas? I don't know - I might be wrong but I always think that nations are made not by roads or by infrastructure but they are made by constructive ideas. This country is a product of an idea but now what is the idea governing this country? What is the idea that could synthesize Pakistan into ONE? What is Pakistaniyat? Where is Pakistan? Who is sacrificing for Pakistan? We are fighting for our own vested self-interests. Basically, the leadership of Pakistan in the beginning were very wise and selfless people. The early leadership of Muslim League did not possess any material assets like cars and bungalows but they were an educated lot being groomed by Oxford and Harvard. But today you can very well see the state of affairs and can relate to all the political animals we live with. It's the race of money, race of power and selfish gains.

To me ideology is important, I mean loving the ideas. We are ideology-based people. We idealize everything and

love our ideas; we love the symbols, what is the symbol of Pakistan? So, try to promote the symbol of Pakistan in the real sense of the word. Don't mix it up with the religion. Religion is one factor to bind it together. Apart from religion there are many other important factors that are being ignored and need to be taken into account. Saying that we are Muslims does not account for that we are Pakistanis. This is the very limited definition of Pakistani nationalism and I think we must transcend this.

Now I come towards my next point "federalism". Yes, 1973 Constitution reflects the federalism of this country. We have four units. Implement the 1973 Constitution in letter and spirit. This is the legitimate constitution. We believe in the constitution. If it is implemented, I believe the rights of the Baloch people will be served within the constitutional limits of Pakistan. As a pro-Pakistani and a constitutionalist, I believe in that.

We are living in very uneasy peace. Something is lagging behind, we are living in a constant state of fear. And then there is aggression. As a student of psychology, I have studied human aggression as a product of fears and if it goes to extremes, it becomes paranoid. A paranoid person cheers just for the sake of his own security. He attracts, he kicks this aggression. Today we are facing this aggression amongst the youth of Balochistan and this aggression is expanding. This is when you do not find ways and means to satisfy yourself and be happy. Why don't you allow people to enjoy themselves? Why don't you allow people to dance? Why don't you allow them literature? Why don't you allow them music? You are trying to define this country by the definition of Islam given by certain mullahs, who want to make this country a theocratic state forgetting that Islam is all about balance. The founder of Pakistan was a liberal, democratic, secular man. I have read Quaid-i-Azam Muhammad Ali Jinnah's speeches and his biographies; Quaid-i-Azam was an enlightened and balanced man. Why you are making him a conservative mullah.

The last point is future. Better future. Somebody has written a book about Balochistan, the title of the book is "Back to the Future". What do you mean by back to the future? It means that whenever you discuss the future of this province or this land, consider how it came into being? What were those factors, those historical factors? Nothing happens by chance in history. Everything happens for a reason and has a cause behind it. Don't interpret things in a wrong way, look at the history to clear your perspectives. If we want history to do justice to us, we must first of all start doing justice to ourselves. CPEC is advancing – see what you can offer. I always ask youth about their ideas, about the thoughts running at the back of their mind. What are your symbols? It dawned upon me that we still are not agreed on mutual symbols; first we have to make our symbols the same and then the effort can be put in to make them strong. Thank you very much.

## ڈاکٹر اسحٰق بلوچ

رکن مرکزی کمیٹی نیشنل پارٹی

بلوچستان کے بارے میں کوئی دورائے نہیں کہ اس کے پاس ڈیویلپمنٹ کے لیے درکار تمام اہم عناصر موجود ہیں۔ بلوچستان میں جتنی بھی قومی وحدتیں ہیں اپنی اپنی جگہ ہماری Situation اور ہماری حالت بہت آئیڈیل ہے۔ دوسری جانب رقبہ کے مقابلہ میں ہماری آبادی بہت کم ہے۔ دنیامیں عام طور پر آبادی کوBurden سمجھاجاتاہے جبکہ بلوچستان کی آبادی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بے پناہ معدنی وسائل کے ساتھ ساتھ طویل ساحل سمندر بھی بذات خود ایک بہت بڑااثاثہ ہے۔ البتہ اگر یہ دیکھاجائے کہ صوبے کاخود اپنے پر اختیار کتناہے تواس حوالہ سے مایوسی ہوتی ہے۔ درحقیقت بلوچستان کو اسلام آباد والوں نے کبھی بھی ڈویلپمنٹ کے پیراڈائم(Paradigm)سے نہیں دیکھابلکہ ان کے سامنے ہمیشہ سیکورٹی پیراڈائم رہاہے۔ جب تک یہ مائنڈسیٹ تبدیل نہیں ہوگابلوچستان کے مسائل اور مشکلات بدستور موجود رہیں گی۔

Environment کی مثال لے لی جائے۔ اس وقت کوئلہ اور دوسرے ذرائع سے بجلی پیدا کرنے کے منصوبے شروع کیے گئے ہیں۔ ان منصوبوں کے جتنے بھی ماحولیاتی اثرات ہیں وہ بلوچستان میں ہوں گے اور یہاں کی مقامی آبادی اور لوگوں کو ہی برداشت کرنا پڑیں گے۔ لیکن ان منصوبوں کے ماحولیاتی جائزہ (Assessment) کے حوالہ سے صوبوں کو کوئی اختیارات نہیں دیے گئے کہ آپ اپنی سفارشات دیں ہم اس پر عمل درآمد کریں گے۔ دوسری جانب ان منصوبوں کے فوائد زیادہ تر دوسرے صوبوں کے لیے ہیں۔

اسی طرح قدرتی وسائل کا معاملہ ہے۔ اٹھارویں ترمیم کے بعد ایک آرٹیکل ۱۷۲ متعارف کرایا گیا ہے۔ اس آرٹیکل کی ذیلی دفعہ اے-۳ ہے۔ اس میں صاف طور پر لکھا ہوا ہے کہ آئل اینڈ گیس فیڈرل گورنمنٹ اور صوبے کا مشترکہ سبجیکٹ ہے۔ درحقیقت جب کوئی بھی چیز مشترک ہوتی ہے تو عمل درآمد بھی مشترک ہونا چاہیے۔ اگر آپ کی نیت صحیح ہے تو قدرتی وسائل سے متعلق فیصلے کرنے اور ان پر عمل درآمد کے لیے، خواہ ان کا تعلق لائسنس دینے سے ہو یا ایکسپلور کرنے سے، کوئی مشترکہ کمیشن ہونا چاہیے۔ یہی صورت حال اثاثوں اور آمدنی کی ہونی چاہیے۔ لیکن اس حوالے سے قومی اداروں کے ساتھ جو بھی معاہدات ہوئے ہیں ان کے بارے میں سوالات موجود ہیں۔ موجودہ بجٹنگ (Budgeting) میں وہ بالکل برابر ہیں۔ اس آئین کی رو سے پی پی ایل یا گیس کی مد میں جو کچھ کمایا گیا ہے ان کا ۵۰ فیصد بلوچستان اور ۵۰ فیصد وفاق کا ہونا چاہیے۔ لیکن اس کا کبھی حساب کتاب نہیں کیا جاتا کیونکہ اس حوالہ سے کونسل آف کامن انٹرسٹ (CCI) کا فورم عملاً Non existent ہے۔

آئین میں یہ بھی موجود ہے کہ سی سی آئی کا ایک مستقل سیکرٹریٹ ہوگا۔ اگر واقعی سیکرٹریٹ بن جائے اور وہاں پر آپ کی نمائندگی ہوگی تو کوئی بھی مسئلہ وہاں آپ پیش کرسکتے ہیں۔ سیکرٹریٹ نہ بھی ہو تو یہ ایک دستوری ذمہ داری ہے کہ ہر ۹۰ دن بعد CCI کا اجلاس باقاعدگی سے ہو اور ہر چیز کو بروقت چیک کیا جائے گا۔ تاہم میرا خیال ہے کہ سال ہوگیا ہے کہ حکومت نے اس کو دیکھا تک نہیں ہے۔ بہت ساری چیزیں ہوں گی جو وفاق کے دائرہ کار

میں نہیں ہیں جبکہ کئی ایسی چیزیں ہیں جو پارٹ (۱) اور پارٹ (۲) میں بھی نہیں ہیں۔ اس صورت میں سارے معاہدے اور سارے ایگریمنٹ وفاق ہی کرتا ہے اور صوبہ عملاً نظر انداز ہوتا ہے۔ یہ صورت حال میرے خیال میں کسی طرح بھی ٹھیک نہیں ہے۔

اب آتے ہیں بالخصوص سی پیک کی طرف۔ Andrew Small کی حال ہی میں شائع ہونے والی ایک کتاب میں جو پاکستان چین تعلقات پر لکھی گئی ہے مصنف نے شروع میں ہی لکھا ہے کہ پاکستان والے کہتے ہیں کہ پاک چین دوستی ہمالیہ سے بلند، شہد سے میٹھی اور سمندر سے زیادہ گہری ہے۔ لیکن اس کا خیال ہے کہ چینیوں کو پاکستان سے کوئی سروکار نہیں۔ مثال کے طور پر دیکھنا چاہیے کہ سینڈک میں کیا ہو رہا ہے۔ چند سال قبل جب چینیوں کے ساتھ معاہدہ ختم ہو رہا تھا تو وہ ۱۲۰۰۰ ٹن پر اسیس کر رہے تھے۔ پھر ان کو کچھ سالوں کے لیے Extention مل گئی۔ اب وہ ۲۰ ہزار ٹن کے قریب پر اسیس کر رہے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ اس کی کوئی مانیٹرنگ نہیں ہو رہی ہے۔ جو کچھ یہ سینڈک میں پر اسیس کر رہے ہیں وہ سیدھا چین لے جایا جاتا ہے۔

سینڈک کو اس سے قبل ڈیڑھ سال ہمارے لوگوں نے چلایا۔ اس وقت یہاں ۱۲۰۰ ملازمین تھے جن میں ۷۰ فیصد بلوچستان اور بقایا سندھ سے تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے ۴۰/۳۵ کروڑ کا زرمبادلہ کما کر دیا۔ لیکن مرکزی حکومت نے انٹرنیشنل اور فارن فنڈنگ کے نام پر منصوبہ کو اپنے لوگوں سے لے کر چینیوں کو دے دیا۔ درحقیقت اس کی وجہ انٹرنیشنل اور فارن فنڈنگ نہیں بلکہ اس کے پس پردہ بعض دوسرے عوامل ہیں۔ مثلاً میں سمجھتا ہوں ایک وجہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارا ملک ایک طرح کی Isolation میں ہے جس کی وجہ سے چین پر ہمارا بہت زیادہ انحصار ہے اور اسی بنیاد پر ایسے بعض فیصلے ہوتے رہے ہیں۔

ہم سی پیک کی بات کرتے ہیں۔ پتہ نہیں ہم پر سی پیک کے سماجی، معاشی نقطہ نظر سے کیا مثبت اور منفی اثرات ہوں گے۔ لیکن غور کرنا چاہیے کہ سی پیک کی چینیوں کو ضرورت کیوں پڑی۔ بحیثیت ایک سیاسی ورکر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ جو South China Sea ہے وہاں پر

جتنے بھی ملک ہیں ان کا جھگڑا ہے۔ آپ سب کو یاد ہو گا کہ کوئی پانچ چھ ماہ پہلے اس علاقہ میں جزیرہ پر چین نے قبضہ کیا تو امریکی بحری بیڑہ بین الاقوامی سمندر کو کراس کر کے آیا اور چین کی سمندری حدود میں داخل ہو گیا۔ اس پر دونوں ملکوں کے درمیان ٹنشن اس قدر بڑھ گئی کہ ہاٹ لائن پر دونوں صدور کو بات کرنا پڑی۔ امریکہ، تائیوان، جاپان ان سب سے چین کو اس علاقے میں خطرات ہیں۔ دوسری جانب چین کی صنعتوں کا کلی انحصار درآمدی تیل پر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت South China Sea سے گزرنے والے تیل بردار جہاز سات متنازعہ علاقوں کو کراس کر کے جاتے ہیں۔ اس کے بعد چین میں اندرون ملک اسی تیل کی سنکیانگ جیسے علاقوں تک، جس کی اس وقت آبادی کم اور رقبہ زیادہ ہے (آپ یہی سمجھیں کہ چین کا بلوچستان ہے)، سپلائی کے لیے غیر معمولی وقت اور اخراجات ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک ہفتے کے لیے بھی چین کے لیے تیل کی یہ رسد بند ہو جائے تو اس کی معیشت بیٹھ جائے گی۔ گوادر اس حوالہ سے متبادل اور محفوظ روٹ چین کو فراہم کرتا ہے۔

تیسری بات میری نظر میں یہ ہے کہ ہم لوگ سی پیک کے نام پر چینیوں سے سرمایہ لے لیتے ہیں۔ خوش ہوتے ہیں لیکن ابھی تک میری نظر سے کم از کم نہیں گزرا کہ یہ جو ادائیگیاں ہیں ان کی نوعیت کیا ہے۔ یہ گرانٹ ہے، قرضہ ہے، یا کچھ اور ہے۔ کس مد میں ہمیں یہ ۵۰ ارب ڈالر کے قریب امداد دے رہے ہیں۔ اس میں ۸ سے ۱۰ ارب کے قریب وسائل جو بلوچستان میں خرچ ہوں گے وہ گوادر کے قریب ائیر پورٹ کی تعمیر پر صرف ہوں گے یا کوئی اور چیز، جو بھی ضروری ہو۔ غالباً ان سب تعمیرات کو چینی ہی استعمال بھی کر رہے ہوں گے۔ اس صورت میں یہ تو چینیوں کے لیے نقد فصل کی طرح ہے کہ وہ اس سے کما بھی رہے ہوں گے اور اپنی اقساط اور رقوم بھی وصول کر رہے ہوں گے۔ دوسری جانب پوری دنیا کے ساتھ جھگڑے ہمارے بڑھے ہیں۔ انڈیا اور افغانستان تو بہت ہی نمایاں ہیں۔ تو آخر ہمیں حاصل کیا ہوا ہے؟ یہ سب امور CCI سے بھی متعلق ہیں۔ آخر بلوچستان کو کیا ملے گا؟ ریونیو کی حد تک کیا ملے گا، باقی مد میں کیا ملے گا۔ یہ جتنے بھی سوالات ہیں تشنہ ہیں۔ ان کو حل کرنے کی ضرورت ہے۔

میں نے وفاقی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان تعلقات اور اس حوالہ سے آرٹیکل ۱۷۲ کی بات کی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت بلوچستان نے اپنا کیس سی سی آئی میں جمع کیا ہے جس میں ۱۹۴۷ء سے اب تک (۲۰۱۷ء) رولز اور قواعد وضوابط کو اسٹڈی کرنے کے بعد ان میں ترمیم کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔ پہلے جو کردار ڈائریکٹر جنرل اور سیکرٹری پٹرولیم ادا کرتے تھے اب یہ ان کے دائرہ کار میں اس طرح نہیں ہے۔ اگر مشترکہ سبجیکٹ بن چکا ہے تو اس میں نئے قوانین کی ضرورت ہے۔ نئے طریقے سے ان پالیسیوں کو دیکھنے کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ نہیں ہو رہا۔ فرض کریں کہ کسی چیز کو سی سی آئی میں لے جانے کے لیے متعلقہ وزارت سے صوبہ کو جواب چاہیے۔ لیکن وزارت کے لیے اس حوالہ سے کوئی ٹائم ٹیبل نہیں ہے۔ اگر وہ ایک سال تک اس کا جواب نہ دے اور اس کو اپنے ایجنڈے میں بھی نہ شامل کرے تو اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی۔ اسی لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ رولز کو تبدیل ہونا چاہیے اور CCI کا مستقل سیکرٹریٹ ہونا چاہیے۔ یعنی جتنی بھی چیزیں ہیں ہمارے دائرہ اختیار میں ہیں ان سے ہر سطح پر مکمل طور پر آگاہ کرنے کی ضرورت ہے۔ رہی بات معدنیات کی، تو یہ شروع سے ہمارا صوبائی حق تھا۔ یعنی اٹھارویں ترمیم سے پہلے بھی۔ اس حوالے سے میں سمجھتا ہوں کہ جتنی بھی ہماری وحدتیں ہیں وہ اپنی چیزوں کو Initiate کریں۔ جو چیزیں نہ تو دستور میں دی گئی فہرست کے پارٹ (۱) میں ہیں اور نہ پارٹ (۲) میں ہیں، وہ صوبے کی ہیں تو اس حوالے سے قانون سازی کریں۔ اسی طرح پراپرٹی پر ڈیوٹیز ہیں۔ یہ بھی انہیں سمجھ نہیں آئی کہ یہ بھی صوبے کی ہیں۔ ہم نے اس کو CCI میں رکھا ہے اور یہ ان کی ڈومین (Domain) میں ہے۔ صوبے اس کو Initiate کریں جب کوئی اعتراض کرتا ہے تو CCI میں لے جائیں، کورٹس بھی موجود ہیں اور فورم بھی موجود ہیں۔

جہاں تک بات ہے قبائلی تقسیم اور اس سے متعلق مسائل کی تو بلوچستان میں جتنے بھی قبائل جدھر رہتے ہیں سب کی اپنی اپنی زمین ہے۔ صدیوں سے یہ ایک تقسیم ہے کہ یہاں اس قبیلے کی زمین ہے اور وہاں اس کی۔ پھر اسی طرح سے ذیلی قبائل کی اپنی تقسیم ہے۔

میرا تعلق خاران سے ہے اور شہر کو چھوڑ کر باقی خاران کی جتنی بھی زمین ہے اس میں وہاں کا کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہو گا جس کے پاس زمین نہیں ہے۔ اس لیے ہم کہتے ہیں کہ وفاق کی بھی کچھ دستوری ذمہ داریاں بنتی ہیں۔ جہاں ڈیم بننے کے مواقع ہیں وہ بلوچستان ہے۔ ورلڈ بینک نے ایک فزیبلٹی رپورٹ بنائی جس میں انہوں نے ایسے ۳۰۰ مقامات کی نشان دہی کی جہاں ڈیم بن سکتے ہیں۔ اب اگر تربیلہ ڈیم سے دوگنا ہمارا پانی ضائع ہو رہا ہے تو وفاق کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس کو روکنے کے لیے اقدامات کرے۔

بلوچستان کے مسائل آخر کیا ہیں؟ ہماری معیشت، ہمارے قدرتی وسائل پر منحصر ہے مگر ان کے معاملات آپ کے ہاتھ میں ہیں۔ سینڈک سے ہمیں ۲ فیصد سے بھی کم ملتا ہے لیکن ایگریکلچر پر اس طرح کا کوئی ٹیکس نہیں۔ بلوچستان کی ترقی کے لیے اس کے قدرتی وسائل کو تحفظ فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے متعلق ایسے معاہدے ہوں جو بلوچستان اور یہاں کے لوگوں کے حق میں ہوں۔ اگر سینڈک چاغی میں ہے تو کم از کم اس کا ۲۰ فیصد چاغی پر خرچ ہونا چاہیے۔ ۶۰ فیصد بلوچستان اور ۲۰ فیصد وفاق کو ملنا چاہیے۔ ہم اس طرح کی چیزیں طے کر سکتے ہیں۔ وہ فورم اور ادارے موجود ہیں مگر بد قسمتی سے موجودہ [نواز شریف] حکومت اتنی مرکز پسند ہے کہ ہر چیز کو انہوں نے Rename کیا ہے۔ اب ایجوکیشن Devolve ہو گیا ہے مگر کریکولم انہوں نے واپس لے لیا، زراعت کو کسی اور نام سے رکھ لیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اٹھارویں ترمیم کے بعد جو چیزیں صوبوں کو منتقل ہو گئی ہیں ان میں اسلام آباد کے اختیارات اسلام آباد سے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ اب جو محکمے Devolve ہوئے ہیں تو اس سے پہلے وفاق ان پر جتنی رقم خرچ کرتا تھا وہ این ایف سی ایوارڈ کے تحت صوبوں میں تقسیم کر دینی چاہیے۔ مسائل کے حل کے لیے آئین میں جو اختیارات ہیں ان کو صحیح معنوں میں نافذ کریں۔

آخر میں ایک اور بات کروں گا کہ ایک اور مائنڈ سیٹ ہے جو Diversity کو کمزوری سمجھتا ہے۔ حالانکہ یہ ریاست کی طاقت ہوتی ہے۔ اب جتنی بھی اقوام ہیں بلوچ ہے، سندھی ہے، پنجابی ہے یا پشتون ہے یہ Diversity وفاق کی طاقت ہے۔ چنانچہ ان کی تاریخ،

ثقافت اور شناخت کا تحفظ وفاق کی دستوری ذمہ داری بنتی ہے۔ یہ جو مردم شماری ہے اس کے حوالے سے کوئی تیاری نہیں تھی۔ اس لیے میں دیکھ رہا ہوں کہ حالات بہت خراب ہوں گے۔ اگر بلوچ کو اقلیت میں تبدیل کیا گیا تو یہ بہت ہی خطرناک بات ہو گی۔

## قاضی عبدالحمید شیر زاد

ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

بلوچستان کی اہمیت کے اظہار کے لیے عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بلوچستان اگر نہ ہو تو پاکستان کی کوئی حیثیت نہیں رہے گی۔ تاہم میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ محض زبانی باتیں ہیں حقیقت سے ان کا دور کا تعلق نہیں ہے۔

بلوچستان میں رہنے والے پشتون ہوں یا بلوچ ہمارے اپنے اطوار اور روایات ہیں۔ اپنے اپنے علاقوں میں ان میں سے ہر ایک پہاڑوں کی مانند ہے۔ ان سے طاقت کی زبان میں بات کی جائے گی تو پھر اس کے مطابق ہی جواب ملے گا۔ اسی حوالہ سے جب اکبر بگٹی کا قتل ہو رہا تھا تو ہم نے ارباب اختیار سے کہا کہ زندہ اکبر بگٹی سے مردہ اکبر بگٹی آپ کے لیے زیادہ خطرناک ہو گا۔ اور اس کے اثرات آج آپ دیکھ رہے ہیں۔

بلوچستان [کوئٹہ میں واقع] سرینا ہوٹل کا نام نہیں ہے۔ معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ یہ ایک وسیع و عریض علاقہ ہے جہاں لوگ آباد ہیں۔ ان کے حالات کو سمجھنے کے لیے دیکھنا ہو گا کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں خود خضدار سے ہوں اور نقل مکانی کر کے کوئٹہ منتقل ہوا ہوں۔ میں ایک جامع مسجد میں فی سبیل اللہ ۳۰ سال سے خطبہ دیتا تھا۔ اس سے آپ کو علاقہ میں میری حیثیت اور کردار کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ لیکن خود میرے ساتھ کیا ہوا۔ میرے گھر کے دروازے پر شام ۵ بجے کے وقت میرے بیٹے پر دو طرف سے ٹارگٹ کلنگ کی جاتی ہے۔ وہ شدید زخمی ہوا لیکن اس کی قسمت تھی کہ بچ گیا۔ لیکن پھر ۸ اگست ۲۰۱۶ء کے کوئٹہ دھماکہ میں وہ شہید ہو گیا۔ تو تک خضدار شہر سے پیچھے ایک علاقہ ہے وہاں

سے اجتماعی قبریں برآمد ہوئی ہیں[1]۔ سردار علی محمد قلندرانی جو توتک میں ہے اور خود بھی اپنے قبیلہ کا سردار ہے۔ اس کے ۳ بیٹے ۲۰۱۳ء سے بمعہ ۱۱ آدمیوں کے لاپتہ ہیں۔ اس وقت تک ان کا کوئی پتہ نہیں ہے۔ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے بے چارا سیاسی جماعتوں سمیت ہر ایک زید، بکر، عمر غرض سب کے پاس گیا لیکن اس کی کوئی داد رسی نہیں کی گئی۔ ہائی کورٹ نے ایک کمیشن بنایا۔ جس شخص پر الزام تھا بجائے اس کو سیشن کورٹ خضدار بلانے کے جج صاحبان نے ان کے گھر جا کر بیان قلم بند کیا۔ لیکن یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ اب ہمیں عدلیہ سے امید ہے اور نہ ہی انتظامیہ سے کوئی توقع ہے۔

کیا ہماری اس صورت حال کا آپ کو اندازہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جتنا پاکستان آپ کا ہے اتنا ہمارا بھی ہے اور آپ ہی کی طرح ہمارے بھی حقوق ہیں۔ ہم وہی حقوق مانگتے ہیں۔ ہم کسی سے خیرات یا زکوۃ نہیں مانگتے۔ ہمارے حقوق کو آئینی تحفظ دیا جائے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ ہمیں انسان سمجھا جائے۔ ہمارے ساتھ حیوانوں جیسا سلوک نہ کیا جائے۔ زبان کی سختی کے لیے معذرت چاہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں بتایا جائے کہ ہمارا قصور کیا ہے۔

باقی جو CPEC اور اس سے متعلق معاملات ہیں ان پر کچھ لوگوں نے پہلے ہی تفصیلی بات کی ہے۔ میں نے صرف اتنی گزارش کرنی ہے کہ یہ ہمارے وسائل اور سی پیک کی 'برکت' ہے کہ ہمیں اس سب مار دھاڑ کا سامنا ہے۔ میرے بیٹے کے بارے میں ایک سینئر اہلکار کے استفسار پر میں نے جواباً کہا کہ آپ نے اسے مارا ہے۔ کیونکہ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں

---

[1] روزنامہ ایکسپریس ٹریبیون ۲۶ جنوری ۲۰۱۴ء کے مطابق سرکاری حکام نے خضدار کے علاقے 'توتک' میں ایک اجتماعی قبر دریافت کی۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ حکام کے مطابق آٹھ یا نو لاشیں ملی ہیں جو تقریباً ایک ماہ پرانی ہیں۔ اس واقعہ کی تحقیقات کے لیے بلوچستان ہائی کورٹ کے جج جسٹس نور محمد شاہ کی سربراہی میں عدالتی کمیشن بنایا گیا تھا۔ ڈان اخبار کی ۱۹ اگست کی رپورٹ کے مطابق کل ۱۷ لاشیں ملی ہیں جبکہ بلوچ قوم پرست رہنماؤں کے مطابق ملنے والی لاشوں کی تعداد زیادہ ہے۔ بلوچستان کے لاپتہ افراد کی آواز نامی تنظیم نے کمیشن کی رپورٹ کو مسترد کر دیا ہے۔ ایشین ہیومن رائٹس کمیشن کے مطابق توتک کے علاقے میں تین اجتماعی قبروں سے ۱۰۳ لاشیں ملیں۔

کہ بہت سے مارنے والوں کو کسی نہ کسی درجہ میں خود اداروں کی جانب سے تحفظ ملا ہوتا ہے۔ اور یہ بات ہم ہی نہیں کہتے بہت سے لوگ جو اسی نظام میں ذمہ دار ہیں تسلیم کرتے ہیں۔

درحقیقت جب تک تعصب کی عینک کو اتار کر حقائق کی عینک سے نہ دیکھا جائے مسائل حل نہیں ہوں گے۔ آپ تشریف لائے بے شک آپ نے ہمیں ایک اچھا موقع فراہم کیا ہے، آپ ہمارے ساتھ شیئر کر رہے ہیں اور ہم آپ کے ساتھ حالات وواقعات شیئر کر رہے ہیں۔ دل دکھانے کی چیز نہیں ہے، کبھی آپ کو وقت ملے تو کوئٹہ کے بجائے آپ نوشکی جائیں، خضدار جائیں، ڈیرہ مراد جائیں، آپ سبی اور ڈھاڈر جائیں، ژوب جائیں، قلعہ سیف اللہ جائیں، موسیٰ خیل جائیں، میں خضدار سے ہوں اور آپ کو دعوت دیتا ہوں کہ سب سے پہلے وہاں آئیں تو آپ کو زمینی حالات سے حقیقی واقفیت ہو گی۔

انتہائی دکھ سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے ہاں انتخابات میں نشستیں بھی ادارے تقسیم کرتے ہیں کہ ڈھائی سال تم وزیر اعلیٰ اور ڈھائی سال تم، یہ حقائق ہیں۔

## شام کمار

دانشور، مصنف

تیسری دنیا کے ممالک کو جن میں پاکستان بھی شامل ہے اس وقت جو خطرات لاحق ہیں انہیں مختلف زاویے سے دیکھتا ہوں۔ میرے خیال میں اس حوالہ سے جب تک ہم تہذیب، کلچر اور تاریخ کی تہہ میں نہیں جائیں گے تب تک مسائل کی درست طور پر نقاب کشائی نہیں ہو سکے گی۔ بلوچستان کی صورت حال بھی اس میں شامل ہے۔

مجھے اجازت دیں ماضی میں جانے کی۔ اس ضمن میں میں تین سامراجوں کا ذکر کروں گا جو موجودہ ہسٹری کے نمایاں سامراج ہیں۔ ان میں ایک سفید سامراج ہے، ایک کالا سامراج اور اب ایک پیلا سامراج ہے جو طوفان کی طرح ابھی آرہا ہے۔ ماضی میں جانے سے پہلے میں تین چار ملکوں جن میں امریکہ، غیر منقسم ہندوستان اور پاکستان نیز چین کا ذکر کروں گا۔

۱۶۳۴ء میں امریکہ کے ایک علاقے میں یورپ سے ایک جہاز لنگر انداز ہوتا ہے۔ اس میں یورپ، خاص طور پر برطانیہ کے سزایافتہ لوگ تھے۔ ان کے ساتھ پادری تھا، پادری کے ساتھ کتاب تھی اور پادری اور کتاب کے ساتھ ساتھ ان کا خدا بھی تھا۔ جب جہاز لنگر انداز ہوتا ہے تو وہاں کے لوکل لوگ جس میں کئی قبائل سمیت ریڈ انڈینز اور پکرز بھی شامل تھے ان کو پادری نے کتاب کے حوالہ سے کہا کہ ہم تمہیں مذہب دینے اور تہذیب سکھانے آئے ہیں۔ مذہب کو بشارت قرار دیتے ہوئے انہوں نے مقامی آبادی کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا، انہیں زندہ جلایا اور اس طرح مارا پیٹا کہ صفحہ ہستی سے ہی مٹا دیا گیا۔ اب ان لوگوں کو ہم فلموں میں دیکھتے یا پھر کتابوں میں پڑھتے ہیں۔ نہ ریڈ انڈینز کہیں نظر آتے ہیں اور نہ ہی پکرز نظر آتے ہیں۔ بعد میں ایک امریکی دانشور نے تبصرہ کیا کہ وہ لوگ اس وقت جو خدا لائے تھے ان کا وہ خدا ہمارے پاس ہے اور ہماری زمینیں ان کے پاس ہیں۔

دکھ اور درد کی بات یہ ہے کہ بڑے بڑے امریکی دانشوروں نے ان لوگوں کے لیے یہی بیانیہ دیا کہ ان مقامی لوگوں کو ہم تہذیب سکھانے آئے تھے۔ یہ وحشی تھے، ان کو ہم انسان بنانے آئے۔ میکسیکو کے ساتھ بھی انہوں نے یہی عمل کیا۔ یہ جو مذہب، کتاب اور خدا لے کر آئے تھے وہ تین چیزیں انہوں نے مقامی لوگوں کو دے دیں اور ان کی زمین اپنے پاس رکھ لی۔

دوسری جانب ۱۶۱۵ء میں برطانیہ سے ایک شخص وہاں کے بادشاہ کا پروانہ لے کر بطور سفیر ہندوستان کے بادشاہ جہانگیر کے دربار میں آتا ہے۔ یہی خط وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کی بطور ایک کارپوریشن بنیاد رکھنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس بنیاد سے پہلے انہوں نے ساؤتھ میں کوٹھیاں قائم کیں اور پھر آہستہ آہستہ بمبئی اور سورت میں قیام کر گئے۔ بنگال کو بھی انہوں نے مرکز بنایا۔ اسی طرح بتدریج اپنی تجارت کو بڑھانے کے لیے انہوں نے اپنی مختلف آؤٹ پوسٹس قائم کیں۔

Corroborators وہاں پر بھی تھے اور یہاں پر بھی ہیں۔ سنٹر میں ہیں اور یہاں

پر بھی ہیں تو آئینی تحفظ اگر ہمیں مل بھی جاتا ہے تو یہ محض کتاب کی طرح ہے۔ جب تک Corroborators یہاں پر ہیں تو یہ ملک صحیح طور پر کھڑا نہیں ہو سکے گا۔ اور جیسے منیر جان نے کہا کہ خاص طور پر بنگال کی مثال اہم ہے جس کو انہوں نے دھکا دے کر الگ کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ باہر کی زبان ہماری زبان نہیں ہے رابطے کی زبان ہے۔ لیکن نہیں مانے اور نتیجتاً خون ریزی ہوئی۔ ہندوستان کے آئین میں ۱۲/۱۳ قومی زبانیں ہیں۔ سوئٹزرلینڈ میں بھی ایسا ہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہماری زبانوں کو کیوں وہ درجہ نہیں دیتے۔

پھر میں اس جانب آتا ہوں لارڈ کلائیو جب ہندوستان آیا تو ۱۷۵۷ء میں گٹھ جوڑ کر کے سراج الدولہ کو شکست دی۔ اس وقت کے Corroborators میں جعفر تھا اور صادق تھا دکن والا۔ یہاں بھی وہی ہیں نام بدلے ہوئے ہیں، چہرے بدلے ہوئے ہیں، عمل اور کردار وہی ہیں۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آنے والا آہستہ آہستہ اپنی حکمرانی قائم کرتا ہے۔ ہندوستان اس زمانے میں دنیا کی اکانومی کا ۲۷ فیصد تھا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں کم ہو کر یہی ۲۳ فیصد رہ جاتا ہے۔ اندازہ کریں کہ اس دور میں کتنا بزنس تھا۔ اس وقت ان کے جو کارخانے تھے کاٹن کے کپڑے کے اور نفیس قسم کا کپڑا پوری دنیا میں جاتا تھا۔ اس کی مانگ تھی لوگ خوشحال تھے سونے کی چڑیا کہتے تھے ہندوستان کو، لیکن باہر سے تجارت کے نام پر آنے والے لوگوں کی وجہ سے صورت حال الٹ گئی۔ وہ جو کارپوریشن تھی تاجر تھے انہوں نے ملک کو فتح کیا۔ یہ شاہ عالم دوئم کا زمانہ تھا۔ پھر انہوں نے ملک کو نچوڑا۔ اس دوران قحط سالیاں ہوئیں بے شمار لوگ مارے گئے۔ بعد میں یہ لوگ بنگال کو تقسیم کر کے گئے۔ اب جو قبائلی تقسیم کی بات ہوتی ہے یہ اسی وقت سے شروع ہوئی ہے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ مختلف مذاہب کے لوگ صدیوں سے ساتھ رہ رہے تھے تو انہوں نے ان کو تقسیم کرنے کی بات کی۔ یہ تقسیم اور قبائلی تقسیم اسی وقت وجود میں آئی۔ اس میں کاسٹ، ٹرائب یہ سب شامل تھے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تقسیم وہاں سے آئی۔

۱۹۳۹ء میں جب دوسری جنگ عظیم شروع ہوتی ہے تو اس جنگ میں نازیوں نے دو

بڑے ملکوں پر قبضہ کیا۔ ایک یوگوسلاویہ اور دوسرا فرانس۔ دونوں ملکوں میں انہوں نے وہاں کے مقامی Corroborators کی حکومت قائم کی۔ حاکم تو یہ لوگ خود تھے مگر وہاں Corroborators بٹھائے تھے اور وہاں کی باگ ڈور ان کو سونپی تھی۔

ہندوستان میں جب لوگوں کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا تو انہوں نے ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی لڑی جس کو Sepoy rebellion کہا جاتا تھا انگریزوں کے ہاں، جبکہ ہم جنگ آزادی کہتے ہیں۔ اور پھر جو Jewel of India ہے وہ برٹش کے کراؤن میں لگ گیا۔ جس طرح بلوچستان مرکز کے کراؤن میں لگا ہوا ہے۔ ابھی آپ مثال دے رہے تھے سنکیانگ کی کہ وہ چین کا بلوچستان ہے۔ سنکیانگ میں کچھ بھی نہیں ہے اور یہاں سب کچھ ہے۔ دو چیزیں ہیں ایک ہے دریافت شدہ معدنیات و وسائل اور دوسرے ہیں غیر دریافت شدہ جو دریافت شدہ سے بھی زیادہ ہیں۔ تیل ہمارے پاس ہے، گیس ہمارے پاس ہے، قیمتی پتھر ہمارے پاس ہے، سونا ہے، چاندی ہے، تانبا ہے، پتہ نہیں کیا کچھ ہے ہمارے پاس مگر ہم بھوکے ہیں۔ ہمارے کشکول کا سائز بڑھتا جا رہا ہے۔

شرم کی بات ہے کہ جب ہم اسمبلیوں میں پہنچتے ہیں تو اپنے آدرشوں کو بھول جاتے ہیں، بھٹک جاتے ہیں اور بھٹکتے بھی دانستہ ہیں۔ تو جس قوم کا، جس گروہ کا یا جس فرد کا کوئی آدرش ہی نہیں ہو گا وہ کہاں سے ترقی کرے گا۔ کشکول ان کا بڑھتا جائے گا جو کہ بڑھتا جا رہا ہے۔ کیا کچھ نہیں ہے اس ملک میں۔ جاپان میں تو کچھ نہیں ہے اور اکنامی میں امریکہ کا مقابل ہے۔ ہمارے پاس تو سب کچھ ہے مگر یہ سب تو کہنے کی ہی باتیں ہیں۔

اب آتے ہیں کلچر کی طرف۔ چین کی آپ ہسٹری کو دیکھیں، جان لیں کوئی آپ کا دوست نہیں ہے۔ سب مفاد پرست ہیں۔ ان کے لیے ان کے مفادات مقدم و اولین ہیں۔ آپ کی حیثیت تو سیکنڈری بھی نہیں ہے۔ اس کو سمندر چاہیے تو سمندر تک پہنچے گا۔ اس کے لیے آپ کو ۵۰ ارب ڈالر بھی دے گا، سڑک اور راستہ بھی دے گا۔ سب کچھ دے گا۔ مگر کیوں دے گا؟ اس کا اپنا مفاد ہے۔ انگریزوں نے یہاں پر کمیونیکیشنز اور ریلوے کا جال

بچھایا۔ کیا یہ یہاں کی آبادی کے لیے تھا؟ نہیں، اس کا اپنا مقصد تھا۔ سارے ملک کو لوٹ کر لے گیا۔ اور لوگ خودکشیاں کرتے تھے۔ یہ انڈسٹریل ریوولیوشن جو انگلینڈ میں آیا وہ یہاں کے پیسے سے آیا۔ یہاں نہیں آسکتا تھا کیا۔ اس سے زیادہ ہم ترقی یافتہ تھے۔ یہاں کی تہذیبوں کو دیکھو، انڈس سویلائزیشن کو دیکھو، لیکن اب ہم سب کچھ بھولتے جارہے ہیں۔

جب عالمی جنگ ختم ہوجاتی ہے تو سرد جنگ شروع ہوجاتی ہے۔ اور کچھ سیٹلائٹس سوویت یونین جبکہ کچھ امریکہ کے بن جاتے ہیں۔ ہم بھی امریکہ کی سیٹلائٹ تھے۔ ہماری فارن پالیسی اس کے ساتھ نتھی تھی۔ چنانچہ ہم استعمال ہوئے۔ اگر ہم استعمال نہ ہوتے تو کلاشنکوف اور ہیروئن کلچر یہاں کبھی متعارف نہیں ہوتا۔ کلچر بہت بڑی چیز ہے۔ جس میں زبان بھی ہے، لٹریچر بھی ہے، سب کچھ ہے۔ لیکن کلچر تو آپ ختم کرتے جارہے ہیں۔ بنگالیوں نے اپنی زمین کو خون سے سینچا اور تب جاکر اپنی زبان کو قومی زبان کا درجہ دلوایا۔ ہم نے کیا کیا، جب عطاء اللہ مینگل وزیر اعلیٰ تھے، ڈاکٹر عبدالحئ آیا تھا اور ہم بیٹھے ہوئے تھے تو میں نے کہا کہ بھائی تم لوگ بلوچی زبان کو کیوں قومی زبان کا درجہ نہیں دے رہے، اُردو کو کیوں دے رہے ہو؟ تو وہ جواب نہیں دے پایا۔ اب تو اس قسم کے لوگ ہیں ہی نہیں جن سے بات بھی کی جاسکے۔

سرد جنگ کے بعد یونی پولر دنیا قائم ہوجاتی ہے۔ اب ایک سپر پاور رہ جاتی ہے۔ جو کہتا ہے کہ سب سے زیادہ مہذب ہوں اور سب سے زیادہ طاقتور ہوں۔ لیکن یہاں سے ایک اور پاور اٹھتا ہے اور میں اسے یلو پاور کہتا ہوں۔ اس یلو پاور کی بھی اپنے ہمسائیوں کے ساتھ زمین پر اور جزیروں پر جھگڑے ہیں۔ اور جنگیں بھی ہوئی ہیں۔ حتیٰ کہ اپنے ویت نامی کامریڈ ہوچی من کو بھی نہیں بخشا۔ ۱۹۷۹ میں اس کے ساتھ دو جنگیں بھی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ساوتھ چائناسی میں بھی مسائل ہیں۔ اب سرد جنگ کے بعد یہاں چین اور بھارت دو Core states بن رہی ہیں۔ جبکہ دیگر سیٹلائٹس بن رہے ہیں۔

معاشی ترقی جس ملک میں ہوگی، کلچرل ترقی بھی ہوگی۔ یہاں بلوچستان میں معاشی

ترقی نہیں تو پھر کلچرل ترقی کیسے ہو گی۔ پھر وعدہ خلافیاں ہوئی ہیں، فوج کشیاں ہوئی ہیں اور خون ریزی ہوئی ہے۔ یہاں پر کیا کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں ایک دو مثالیں دوں گا۔ یعقوب بزنجو یہاں سینڈک پراجیکٹ کا ایم ڈی تھا۔ ایک دن میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ سینڈک پروجیکٹ یہاں ہے اور اس کا ہیڈ کوارٹر اسلام آباد لے جا رہے ہیں۔ یحییٰ بختیار صاحب کی آپ سے دوستی ہے، آپ مہربانی کریں ان سے کہیں کہ وہ بے نظیر بھٹو سے اس سلسلے میں بات کریں۔ بی بی اس وقت حاکم تھیں۔ میں نے یحییٰ بختیار سے بات کی اور اس نے بی بی سے بات کی۔ کچھ دنوں کے بعد کہا کہ بات نہیں بنی۔ کیونکہ یہاں ڈیموکریٹک حکمران بھی شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ پھر نواب اکبر بگٹی سے میں نے بات کی کیونکہ وہ اس وقت وزیر اعلیٰ تھے۔ نواب بگٹی چونکہ نڈر آدمی تھے، وہ پروا نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرکے ہیڈ کوارٹر یہاں بنوایا۔ پھر جب سینڈک پروجیکٹ آپریشنل فیز میں آتا ہے تو اس وقت نواز شریف حاکم ہوتا ہے۔ انہوں نے اس سے منع کیا اور تنخواہیں بند کر دیں۔ یعقوب بزنجو صاحب نے وہ مال بیچ کر تنخواہیں دیں اور پھر اس کا ٹرانسفر لاکڑہ پروجیکٹ میں کر دیا گیا۔

پھر یہ بات دہرانے کی ضرورت ہے کہ ملائشیا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا، فلپائن اور کوریا وغیرہ بنیادی طور پر چینی آبادیوں کا تسلسل سمجھے جاتے ہیں اور کنفیوشس کلچر کے ساتھ منسلک ہیں۔ یہ بہت بڑی پاور ہے جس سے یہ جان نہیں چھڑا سکتے۔ کنفیوشس کا فلسفہ یہ ہے کہ ڈسپلن، آرڈر، اتھاریٹیرین ازم اور Collectivism جبکہ ہماری فلاسفی Individualism، ڈیموکریسی وغیرہ ہے۔ خیر بخش مری کہا کرتے تھے کہ میں پارلیمانی سسٹم پر یقین نہیں رکھتا۔ ہمیں حیرت ہوتی تھی۔ اچھا نہیں لگتا تھا۔ جبکہ نواب بگٹی پارلیمانی نظام پر یقین رکھتے تھے اور اسی وجہ سے وہ فریقین کے درمیان پل بنے ہوئے تھے۔ لیکن اس پل کو گراتے ہوئے بھی انہوں نے دیر نہیں کی۔ جب ملک کے ایک حصے کو انہوں نے دھکیل دیا تو نواب صاحب کی کیا حیثیت تھی۔

یہ سب سوچنے کی باتیں ہیں۔ آپ سیاسی لوگ بیٹھے ہیں، اپنے لیڈروں کے پاس بھی

جاتے ہیں۔ تھوڑی سی مراعات پر چپ نہ کریں بلکہ ڈٹ جائیں۔ یہ اٹھنے کا وقت ہے۔ ورنہ یہ چیزیں آئین میں لکھ بھی دی جائیں تب بھی ان پر عمل نہیں ہو گا۔

## یار جان بادینی

دانشور، صحافی

میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز کا مشکور و ممنون ہوں کہ وہ یہاں آئے اور یہاں بیٹھی بلوچستان کی کریم سے گفتگو کر کے کچھ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ میں پنجاب کے چند بیوروکریٹس جو یہاں پر مختلف انتظامی عہدوں پر فائز رہے ہیں، کے مشاہدات آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں جن سے زمینی حقائق کی تصویر ان ہی کی زبانی سامنے آجاتی ہے۔ ایک کے علاوہ یہ تمام اقتباسات روزنامہ جنگ کوئٹہ کی اشاعتوں میں شائع ہونے والے ارشاد احمد حقانی کے کالموں سے لیے گئے ہیں۔ [طوالت کے باعث یار جان بادینی صاحب کے پیش کیے گئے اقتباسات کے بعض حصے حذف کر دیئے گئے ہیں۔]

"میری بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ڈھاڈر (ضلع کچھی جو کہ اب ضلع بولان کہلاتا ہے) میں ۱۹۸۹ء میں ہوئی۔ ان دنوں جرگہ سسٹم رائج تھا یعنی پورا سول اور کریمنل لاجرگہ کے ماتحت تھا، صرف قاضی کی عدالتیں تھیں۔ سول جج یا ایڈیشنل سیشن جج کی عدالتیں بھی نہ تھیں۔ اے سی اور ڈی سی ہی ان عدالتوں کے سربراہ تھے۔ میرے تحت علاقہ میں واحد پکی سڑک جو نیشنل ہائی وے تھی، کوئٹہ سے ہوتی ڈھاڈر سے گزرتی جیکب آباد تک جاتی تھی جو کہ اب بھی ہے مگر سارا ڈویژن Interior میں تھا سارے ضلع بولان میں ایک فٹ بھی پکی سڑک نہ تھی۔ ڈھاڈر سے تحصیل شوران، تحصیل کھٹن، تحصیل سنی تمام راستے سو سو کلو میٹر تک کچے تھے۔ پکی یعنی کالی سڑک کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اسی طرح حاجی شہر و تحصیل کا تمام علاقہ کھالوں، کھیتوں سے پگڈنڈیوں کی صورت میں تھا، سڑک مفقود تھی۔ میں نے ڈیڑھ سال کچے راستوں پر سفر کیا بعض اوقات گاڑی کا ٹائر اور سٹپنی بھی بیکار

ہو گئے تو تیس تیس میل پیدل سفر کرنا پڑا، تب جا کر کوئی گاؤں آیا اور ٹائر کا بندوبست ہوا۔

میری دوسری تعیناتی ضلع نصیر آباد کی ایک اور دورہ افتادہ تحصیل اور سب ڈویژن چھتر میں ہوئی۔ پورے سب ڈویژن میں ایک انچ بھی پکی سڑک نہ تھی اور نہ اب ہو گی۔ ڈیرہ مراد جمالی (ضلعی ہیڈ کوارٹر) سے سب ڈویژنل ہیڈ کوارٹر چھتر تک تیس کلو میٹر راستہ کھیتوں اور کچی مٹی کی پگڈنڈیوں پر مشتمل تھا۔ باقی سارا سب ڈویژن اسی طرح دھول سے اُٹے راستوں سے پُر تھا، سڑک نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ بجلی نام کی نعمت میسر نہ تھی۔

تیسری تعیناتی جھل مگسی میں ہوئی۔ جھل مگسی مین نیشنل ہائی وے پر واقع نوتال گاؤں سے ۱۲۰ کلو میٹر مسافت پر تھا اور پورے راستے میں نہ کوئی شہر تھا نہ ہوٹل نہ ٹائر کی دوکان اور سارا فاصلہ کچے راستے پر مشتمل تھا۔ دھول زدہ مٹی کی وجہ سے وائپر چلانے پڑتے تھے تب راستہ نظر آتا تھا۔ بجلی نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ پانی یا واٹر سپلائی کی کوئی نعمت موجود نہ تھی۔ میں ایک کچے کمرے میں رہتا تھا۔ جون جولائی کی گرمی میں میں خود درخت کے نیچے چارپائی بچھا کر ہاتھ والا پنکھا جھلتا تھا۔ باقی سارے سب ڈویژن کے باسی Donkey fan کے ذریعے ہوا کا بندوبست کر کے رات گزارتے تھے۔ تمام گاؤں کے لوگ اور جانور ایک ہی تالاب سے پانی پیتے تھے۔

میری تعیناتی بطور ڈی سی نصیر آباد اور بولان بھی رہی بطور ڈپٹی کمشنر پشین جو کہ پشتون علاقہ تھا وہاں میں سختی اور مشکل موسمی حالات سے بچا رہا اور روز مرہ ضروریات اور بجلی اور سڑک کی نعمتوں سے محروم نہ رہا۔ وہاں کا علاقہ شاداب و آباد کاریزات سے پُر تھا۔ آپ کسی بھی پھل کا نام لیں وہ ضلع پشین میں موجود تھا۔ اللہ کی ساری نعمتیں بدرجہ اتم موجود تھیں۔ بجلی سارے ضلع میں تھی اور سڑکیں بھی تھیں۔

جناب والا! میری ان معروضات کا مقصد صرف یہی ہے کہ بلوچ ایریا میں بڑے پیمانے پر تعمیراتی اور ترقیاتی کام کی ضرورت ہے۔ بجلی، پختہ تارکول کی سڑکیں، اسپتال شفاخانے، کالج اسکول اہم ضرورت ہیں۔ ایک ہنگامی ترقیاتی پروگرام کی ضرورت ہے۔ وہاں کا دیہاتی بلوچ ہم سے نئے زمانے کی ترقی کا حصہ اور حق مانگتا ہے۔ بلوچستان کا سارا علاقہ ہی

دیہاتی غیر ترقی یافتہ ہے۔" [نصر اللہ خان، سابق سیکرٹری پرائیوٹائزیشن بورڈ پنجاب، روزنامہ جنگ کوئٹہ میں ۲۷ فروری ۲۰۰۵ کو شائع ہونے والے مضمون سے اقتباس]

"۹۷-۱۹۹۶ء میں، میں بطور کمشنر سبی ڈویژن جب اختر مینگل اس وقت بلوچستان کے وزیر اعلیٰ تھے تعینات رہا اور اس طرح مجھے بلوچ رہن سہن اور ان کے رویوں کو سمجھے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ حالیہ مباحثے میں ایک سرکاری حلقے نے اس رائلٹی کا بھی ذکر کیا ہے جو سوئی گیس کی وجہ سے نواب محمد اکبر خان بگٹی کو مبینہ طور پر دی جاتی ہے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ رائلٹی کے بارے میں صحیح تصویر پیش کر دیا جائے تاکہ اس ضمن میں موجود غلط تصورات کو رفع کیا جا سکے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ ساڑھے بارہ فیصد کے حساب سے جو رائلٹی، جس میں ایکسائز ڈیوٹی اور ڈویلپمنٹ سرچارج بھی شامل ہے (یہ رقم غالباً ۵ بلین کے قریب ہے) صوبے کو ادا کی جاتی ہے۔ وہ وفاق سے براہِ راست بلوچستان کے Provincial Consolidated Fund میں چلی جاتی ہے۔ اس رقم سے نواب کا یا اس کے قبیلے کا کوئی لین دین نہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو بگٹی قبیلے یا ذیلی قبیلوں کو دی جاتی ہے۔ یاد رہے کہ سوئی گیس کے پلانٹ اور بڑی بڑی پائپ لائنوں نے ڈیرہ بگٹی میں مختلف ذیلی قبیلوں کی سینکڑوں کلومیٹر جگہ گھیری ہوئی ہے۔ سیکورٹی کے پیش نظر ارد گرد بھی وسیع جگہ چھوڑنی پڑتی ہے جس پر بگٹی کا کوئی قبیلہ کسی قسم کی کاشتکاری نہیں کر سکتا۔ یہ رقم اصل میں اسی جگہ کا کرایہ ہے جو پی پی ایل ان قبیلوں کو ادا کرتا ہے۔

اگر سوئی کے قصبے سے PPL Installations جو ان کے اہلکاروں کے وسیع و عریض گھروں، اسپتال، کلب، کیفے ٹیریاز پر مشتمل ہیں نکال دی جائیں تو باقی ٹاؤن اسی حالت میں ہے جو ایک ہزار سال پہلے تھی۔ مٹی کے بنے ہوئے گھر، نہ پانی کا صحیح انتظام نہ جلانے کے لیے گیس، ساری کی ساری آبادی خط افلاس سے نیچے رہ رہی ہے جبکہ SSG کے اہلکاروں کا طمطراق و کروفر دیکھنے کے قابل ہے۔ اگر یہ ٹاؤن یورپ میں ہوتا تو ایک ماڈل ٹاؤن بن چکا ہوتا۔ PPL کی آمدنی اربوں روپے ہے انہیں چاہئے کہ اپنی آمدنی کا ایک یا دو فیصد حصہ ٹاؤن کی ڈویلپمنٹ اور بلوچی کشیدہ کاری کے مراکز قائم کرنے پر، جہاں بلوچ بیوہ عورتیں اپنے ہنر

کو کام میں لا کر اپنے لیے معقول روزگار پیدا کر سکیں، صرف کریں۔

مرکز کی بلوچستان میں دلچسپی یا عدم دلچسپی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ مرکزی وزراء صبح کی فلائٹ سے کوئٹہ آتے تھے وہاں سرینا ہوٹل میں قیام کرتے تھے اور اپنی میٹنگ Attend کرنے کے بعد شام کی فلائٹ سے کراچی چلے جاتے تھے۔ بہت کم وزراء نے کبھی کوئٹہ سے سڑک کے ذریعے اندرونِ بلوچستان جانے کی زحمت کی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ وفاق میں اندرون بلوچستان پائی جانے والی پسماندگی، غربت اور احساسِ محرومی کا پورا شعور کبھی پیدا نہ ہو سکا ہے۔

بطور کمشنر میں نے سبی سے ڈیرہ بگٹی کی پختہ سڑک جو ۱۲۲ کلو میٹر پر پھیلی ہوئی ہے بنانے کی سر توڑ کوشش کی، صوبائی حکومت کے ساتھ ساتھ اس وقت کی مرکزی حکومت کو بھی اس سلسلے میں متحرک کرنے کی مساعی کی لیکن میں کامیاب نہ ہو سکا، کتنے دکھ کی بات ہے کہ پاکستان بنے ۵۸ سال ہو گئے لیکن یہ سڑک ابھی تک Tyre Track پہیوں کے نشان پر ہی مشتمل ہے۔ بارش کی صورت میں کچی سڑک کہیں دو کلو میٹر اور کہیں پانچ کلو میٹر برساتی نالوں کے نیچے آجاتی ہے جس سے ڈیرہ بگٹی سے سبی ہائی وے روڈ کا رابطہ منقطع ہو جاتا ہے۔
[خواجہ محمد طارق سابق کمشنر سبی ڈویژن کے خط سے اقتباس، روزنامہ جنگ کوئٹہ کی ۱۳ فروری ۲۰۰۵ کی اشاعت میں ارشاد احمد حقانی نے اپنے کالم میں شائع کیا]

بلوچستان پاکستان کا ایک بہت ہی پسماندہ صوبہ ہے۔ آزادی کے بعد بھی گزشتہ ستاون برس میں چند پختون علاقوں کے علاوہ اس صوبہ میں بالعموم اور بلوچ علاقوں میں بالخصوص معاشی حالات میں کوئی قابل ذکر بہتری نہیں ہوئی۔

۱۹۷۰ء تک بلوچستان کے عوام میں پنجاب کے خلاف کوئی نمایاں نفرت نہیں تھی۔ بلوچستان کے دور دراز علاقوں میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے اساتذہ مقامی اسکولوں میں بھی تعلیم کی روشنی پھیلاتے رہے اور نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ افواج پاکستان کے متعلق بھی عوام میں منفی جذبات نہ تھے ماسوائے قلات جہاں افواج کے خلاف

غم وغصہ پیدا ہو چکا تھا کیونکہ خان آف قلات کے خلاف فوجی کارروائی کو ناجائز تصور کیا جاتا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو نے ۱۹۷۳ء میں بلوچستان کے وزیر اعلیٰ سردار عطاء اللہ مینگل کی حکومت کو بلا جواز ختم کر کے خرابی کی بنیاد رکھی۔ عراقی سفارتخانہ سے اسلحہ ملنے کا ڈرامہ رچایا گیا۔ آزادی کے بعد پہلی دفعہ بلوچستان کے عوام کو ان کی اپنی حکومت ملی تھی لیکن اسے چلنے نہ دیا گیا۔ سردار عطاء اللہ مینگل کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کر کے سرگودھا میں نظر بند کر دیا گیا۔

شہنشاہ ایران کے ایماء پر بھٹو صاحب نے مینگل اور مری قبائل کے خلاف فوج کشی کی۔ نواب اکبر بگٹی کو بلوچستان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ یہ کارروائی ۱۹۷۷ء میں بھٹو حکومت کے خاتمہ تک جاری رہی۔ اس فوجی کارروائی نے بلوچ عوام کی زندگی اجیرن کر دی معاشی طور پر وہ پس کر رہ گئے۔ بلوچ قوم پرستی شدت اختیار کر گئی اور پاک افواج اور پنجاب کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو گئی۔ جنرل ضیاء الحق نے اقتدار سنبھالنے کے بعد فوجی کارروائی ختم کر دی اور گرفتار بلوچ رہنماؤں کو رہا کر دیا۔ سردار عطاء اللہ مینگل ملک چھوڑ کر انگلینڈ چلے گئے اور بہت طویل عرصہ لندن میں Self-Exiled زندگی گزاری۔

جنرل ضیاء الحق کے دور میں زیادہ عرصہ جنرل رحیم الدین خان بلوچستان کے گورنر رہے۔ ان میں بے پناہ انتظامی صلاحیتیں تھیں۔ ان کے دور میں پہلی بار بڑے پیمانہ پر ترقیاتی کام شروع ہوئے۔ دور دراز علاقوں میں بجلی کی ترسیل اور چھوٹے ڈیموں کی تعمیر پر خصوصی توجہ دی گئی۔ اس سے کئی چھوٹی چھوٹی آبادیوں کو بجلی میسر آئی اور زراعت کو ترقی حاصل ہوئی۔ اس سے قبل بہت سے پختون علاقے مثلاً لورالائی، قلعہ سیف اللہ، کوئٹہ اور پشین بجلی کی ترسیل کے لیے نیشنل گرڈ سے منسلک کر دیے گئے۔

افغانستان پر روسی قبضہ اور جوابی امریکی کارروائی Counter offensive نے بلوچستان پر گہرے اور دوررس اثرات چھوڑے۔ کم و بیش دس لاکھ افغان مہاجرین بلوچستان کے

پختون علاقوں میں قیام پذیر رہے۔ اگرچہ زیادہ تعداد مہاجر کیمپوں میں تھی لیکن بڑی تعداد میں افغان مہاجرین نے کوئٹہ پشین، لورالائی، قلعہ عبداللہ اور دیگر علاقوں میں جائیدادیں خریدیں، کاروبار شروع کیا۔ پاکستان کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ بنوانے اور ووٹرز لسٹ میں اپنے ناموں کا اندراج کیا۔ امریکی حکومت آئی ایس آئی کے ذریعہ بہت بھاری رقوم مجاہدین پر خرچ کر رہی تھی۔ ان رقوم کا ایک بڑا حصہ ناجائز ہاتھوں میں جاتا رہا۔ اس سے پختون علاقوں میں مزید خوشحالی آئی۔ لیکن بلوچ اس سے خوش نہیں تھے۔ اس Demographic تبدیلی کو وہ پختونوں کے لیے فائدہ مند تصور کرتے تھے۔ ان میں احساس محرومی مزید بڑھ گیا۔

نواب اکبر بگٹی ایک سخت گیر شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک بہت اچھے منتظم بھی ہیں۔ انہوں نے بطور گورنر بلوچستان انتظامی امور میں بہترین صلاحیتیں دکھائیں۔

بلوچستان کو معاشی اعتبار سے صوبوں کے برابر لانے کی بھرپور اور سنجیدہ کوشش کبھی نہیں کی گئی۔ وفاقی محاصل کی تقسیم میں آبادی کے تناسب پر رقوم کی فراہمی شروع سے ہی وفاقی حکومت کی پالیسی رہی۔ بلوچستان کی معاشی اور سماجی پس ماندگی، دور دراز کے علاقوں میں پھیلی ہوئی چھوٹی چھوٹی آبادیاں، مخصوص جغرافیائی حالات کی وجہ سے ترقیاتی کاموں پر اٹھنے والے نسبتاً زیادہ اخراجات، روزگار کے محدود مواقع، وفاق کے دائرہ کار میں ملازمتوں میں بلوچستان کی برائے نام نمائندگی، مارشل لاء حکومتوں کے دوران جمہوری نظام میں تعطل، فوجی افسران کا سول معاملات میں عمل دخل، قومی اسمبلی میں بلوچستان کا کم تر وزن، ہر دور کی نمایاں خصوصیات رہی ہیں۔

سوئی گیس پر رائلٹی اور ڈویلپمنٹ سرچارج کا فارمولا از سر نو مرتب کیا جائے کیونکہ موجودہ فارمولا انتہائی غیر منصفانہ ہے۔ سندھ، پنجاب اور بلوچستان کو ایک ہی شرح سے رائلٹی اور سرچارج دیا جائے۔

مثلاً ۱۵ ارب روپے کی کثیر رقم سے بلوچستان کے ایک دورافتادہ مقام سینڈک پر

تانبہ نکالنے کا پروجیکٹ شروع کیا گیا۔ اس پروجیکٹ سے نہ تو مقامی آبادی کے لیے روزگار کے مواقع پیدا ہوئے اور نہ ہی صوبہ کی معاشی ترقی میں مدد ملی۔

گوادر پورٹ پروجیکٹ یقیناً نہ صرف بلوچستان بلکہ پورے پاکستان کے لیے بہت اہمیت کا حامل ہے لیکن اس کی تعمیر سے مقامی آبادی میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ اس اضطراب کو سنجیدگی سے دیکھنا ہوگا چونکہ مقامی آبادی میں ہنر مند لیبر اور مینجرز کی کمی ہے اس لیے ظاہر ہے ملک کے دوسرے حصوں سے بڑی تعداد میں لوگ آئیں گے۔ نیز جس طرح کراچی کے سرمایہ کار بڑے پیمانہ پر اراضی خرید کر ہاؤسنگ کالونیاں شروع کر رہے ہیں اس سے اس علاقہ میں آبادی کا تناسب (Demographic Pattern) تبدیل ہو جائے گا۔

ملک کے دوسرے علاقوں سے آنے والے ایسے افراد کو بلوچستان کے رہائشی حقوق نہیں ملنے چاہئیں۔ ماضی میں ایسا ہوتا رہا ہے۔ پنجاب سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد جو ملازمت یا کاروبار کے لیے بلوچستان آئے انہیں مختصر قیام کے بعد بلوچستان کا ڈومیسائل مل جاتا تھا جس سے وہ بلوچستان میں سرکاری ملازمت کے اہل ہو جاتے تھے بلکہ وفاقی ملازمتوں میں بھی بلوچستان کے کوٹہ پر ملازمتیں حاصل کرتے رہے۔ اس سے بلوچستان کے نوجوانوں کی بہت حق تلفی ہوئی لہٰذا گوادر کے عوام کی بے چینی بلاجواز نہیں۔

اگرچہ زیر زمین معدنی وسائل آئین کی رو سے مملکت پاکستان کی ملکیت ہیں لیکن بلوچستان میں دیگر وسائل کی کمی ہے مثلاً دوسرے صوبوں کے مقابلہ میں قابل کاشت زرعی اراضی بہت کم ہے لہٰذا یہاں کے عوام قدرتی گیس کو اپنا ایک قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ۱۹۸۹ء تک بلوچستان کے عوام کو سوئی گیس فراہم نہیں کی گئی نیز ۱۹۹۰ء سے قبل رائلٹی اور ڈویلپمنٹ سرچارج کی مد سے بلوچستان کو سوئی گیس کے محاصل سے بہت کم رقوم ملتی رہیں۔ [بلوچستان اور پنجاب کے سابق چیف سیکرٹری اے زیڈ کے شیر دل کے خط کے اقتباسات جو روزنامہ جنگ کوئٹہ میں ۹ فروری اور ۱۰ فروری ۲۰۰۵ کو ارشاد احمد حقانی نے اپنے کالم میں شائع کیے]

## صدیق بلوچ

ایڈیٹر روزنامہ آزادی اور ڈیلی بلوچستان ایکسپریس

بھٹو صاحب نے ۷۳ء کا آئین پاس کرایا تو ڈاکٹر عبدالحئ بلوچ صاحب اور ان کے دو ساتھیوں نے اس پر دستخط نہیں کیے تھے۔ نواب خیر بخش مری سمیت جینیفر موسیٰ بھی ان میں شامل تھیں۔ اس کو یہ سمجھا گیا کہ بلوچستان نے ایک طرح سے ۷۳ کے آئین کو ویٹو کر دیا ہے۔ واضح رہے اس وقت بلوچستان سے قومی اسمبلی کے کل ۱۵ ارکان تھے۔ تب لوگ پریشان ہوئے۔ اس کے بعد معاملہ تھوڑا سا اس وقت حل ہوا جب اسمبلی کے فلور پر آکر حفیظ پیرزادہ نے کہا کہ اگلے دس برس میں ہم کنکرنٹ لسٹ صوبوں کو دے دیں گے۔ لیکن آئین پاس ہونے کے بعد میوزیم میں رکھ دیا گیا۔ اور آج تک وہ میوزیم میں پڑا ہوا ہے جہاں جہاں ضرورت ہوتی ہے وہ اس کو استعمال کرتے ہیں ورنہ وہیں پڑا رہتا ہے۔

بنیادی طور پر پاکستان پر اسٹیبلشمنٹ کا قبضہ ہے۔ جبکہ دیگر ادارے اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کر رہے۔ ۱۸ویں ترمیم پاس ہوئی تو اس پر کسی اخبار یا چینل نے تبصرہ نہیں کیا۔ ایک طرح کا بلیک آؤٹ تھا۔ لیکن اسی دن [ہندوستانی ٹینس کھلاڑی] ثانیہ مرزا کی شادی تھی تو پاکستان کے ٹیلی وژن چینلز سارا دن اس کے گھر کے باہر کے مناظر دکھا رہے تھے۔ قائداعظم اور پھر لیاقت علی خان کے بعد جب غلام محمد گورنر جنرل بنا تو اس نے سازش کی اور ناظم الدین کی چھٹی کرادی۔ اس دن کے بعد سے آج تک اقتدار پر اسٹیبلشمنٹ یعنی ملٹری اور سول بیوروکریسی کا قبضہ ہے۔ باقی یہ جتنے بھی لوگ ہیں، وزیراعظم، وزرائے اعلیٰ اور ممبران قومی اسمبلی و سینیٹ میں وہ پبلک ریلیشن آفیسر ہیں اور اسٹیبلشمنٹ کے Behalf پر چیزیں بیچتے رہتے ہیں۔

بلوچستان سیکورٹی صوبہ ہے یہاں صرف سیکورٹی والے حکمرانی کرتے ہیں یہاں اور کوئی رول نہیں کرتا۔ ہمارے سابق اسپیکر صوبائی اسمبلی معاف فرمائیں لیکن حکم نامہ کہیں اور

سے آتا ہے۔ ہم نے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ چیف ایگزیکٹو کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک افسر گندی زبان میں حکم دے رہے تھے کہ یہ کرو اور وہ نہ کرو۔ یہ سیکورٹی صوبہ آج سے نہیں ہے جب سے انگریز آیا ہے اس وقت سے ہے۔ ان کو خطرہ تھا کہ روس [سوویت یونین] برٹش انڈیا پر حملہ کرے گا۔ انہوں نے آکر ادھر قبضہ کیا اور فارورڈ پالیسی چلائی۔ اس دن سے لے کر آج تک یہ سیکورٹی ریجن ہے۔ وہ چونکہ Benevolent aggressor تھا، اس نے بلوچ Mainland کو تقسیم کیا۔ بعض علاقہ ایران کو، بعض افغانستان، پنجاب اور سندھ کو دے دیا۔ اور ساتھ میں جو Annexed ایریا ہے اس کو اپنے ساتھ رکھا۔

اب ساری کی ساری انٹرنیشنل سیاست بلوچستان میں آگئی ہے۔ اس میں چھوٹی موٹی چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اب ساری سیاست آپ کے مکران کوسٹ سے ہوگی۔ مکران کوسٹ ۱۰۰۰ کلومیٹر لمبا ہے۔ اس میں سے صرف ۲۵۰ کلومیٹر ایران کے پاس ہے اور باقی کا تقریباً ۷۵۰ کلومیٹر ہمارے پاس۔ آبنائے ہرمز سے لے کر کراچی تک یہ سارا کا سارا مکران کوسٹ ہے۔ باقی سندھ کا پورشن علیحدہ ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ امریکہ نے گوادر کے آس پاس ۶۰ جنگی جہاز رکھے ہوئے ہیں۔ تین ایئر کرافٹ کیریئر میں ایک امریکہ، ایک فرانس اور ایک برطانیہ کا ہے۔ جب جنگ ہوگی تو ادھر ہوگی۔ کشمیر کی اب کوئی حیثیت نہیں ہے۔

منیر بادینی صاحب تو گلگت بلتستان کے چیف سیکرٹری رہے ہیں۔ آپ سب کچھ جان کر بھی جب کہتے ہیں سی پیک، تو حیرانی ہوتی ہے۔ سی پیک تو ہے ہی نہیں۔ یہ تو گلگت بلتستان اور کشمیر کے علاقے سے گزر رہا ہے۔ چینیوں نے کوئی بھنگ نہیں پیا ہوا کہ کسی 'Disputed territory' سے اس کو گزاریں۔ ہم لوگ جب چھوٹے سیاسی ورکر تھے اس زمانہ میں گلگت سے تعلق رکھنے والے ہمارے دوست شور مچاتے تھے کہ ہم پاکستان میں شامل ہوئے ہیں۔ لیکن ہمارا دانش ور جو یوپی سے آیا ہوا تھا وہ کہتا کہ نہیں تم کشمیر کا حصہ ہو۔ وہ پھر کہتے کہ نہیں بھئی ہم پاکستان میں شامل ہوئے ہیں تو ہمارا دانش ور طبقہ انہیں Disputed

territory بنا دیتا کہ کل ووٹ ہو گا اور ہمارے ووٹ زیادہ ہوں گے تو کشمیر ہم کو ملے گا۔ اب تیس چالیس سال سے ووٹ کا کوئی Concept نہیں ہے۔ تو یہ کم عقلی ہے، نان سینس ہے اور کوئی سی پیک نہیں ہے۔ 'Disputed territory' میں کوئی انوسٹمنٹ نہیں کرے گا۔

دوسری بات یہ ہے کہ سی پیک کے نام پر جتنا بھی انوسٹمنٹ ہے ۴۶ بلین ڈالر کا وہ سارے کا سارا پنجاب میں ہے۔ اس میں ہمارے پاس صرف ایک گوادر کا ہسپتال ہے یا ائیر پورٹ جو بن رہا ہے۔ یہ بھی سی پیک سے پہلے کا تھا۔ پرویز مشرف نے اعلان کیا تھا۔ اس کے بعد پیسہ نہیں ملا تو نہیں بن سکا۔ پھر چینی آئے انہوں نے پیسہ لگایا تو بولے سی پیک ہے۔ ہسپتال کو اب یہ بڑا کر رہے ہیں یہ بھی پہلے کا بنا ہوا ہے۔ لیکن اب اس کو ۵۰۰ بیڈز کر رہے ہیں۔ یہ جو انوسٹمنٹ ہے وہ سی پیک کا حصہ ہے۔

میرا نقطہ نظر یہ ہے کہ گورنمنٹ یعنی ریاست پاکستان بلوچستان کو ڈویلپ نہیں کرنا چاہتی اس کو پسماندہ رکھنا چاہتی ہے۔ جو ڈویلپمنٹ پراسیس ہے اس کو بھی Reverse اور push کر کے بیک کرنا چاہتی ہے۔ میں کئی کئی گھنٹے تک اس پر دلائل دے سکتا ہوں۔

۱۹۶۰ میں برٹش آئے اور کہا کہ ہم آپ کو گوادر پورٹ بنا کر دیں گے لیکن انہوں نے کہا کہ ہمیں نیول بیس بنا کر دو۔ برٹش بھاگ کر چلے گئے۔ اس کے بعد ہمارا پرویز مشرف آیا تھا، وہ چونکہ فوجی تھا اس لیے اس نے بڑے مزے دار انداز میں [بلکہ ادھر تو رواج ہے کہ فوج کا جرنیل جو فیصلہ کرے وہ آخری فیصلہ ہی ہوتا ہے۔ صرف اللہ جہاں بدلے باقی بس اسی پر عمل کرتے ہیں] کہا گوادر پورٹ بنے گا، بن گیا، میرانی ڈیم بنے گا بن گیا، سینڈک چلے گا وہ بھی چل گیا۔ سینڈک کو وزیر اعظم پاکستان اور چوہدری نثار نے آکر خود اپنے ہاتھوں سے بند کیا کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اور یہ سب میں رپورٹ کر چکا تھا۔ جیسے ہمارے دوست نے بھی تذکرہ کیا تھا کہ اس میں ۱۲۰۰ ملازمین تھے انہوں نے اسے چلایا۔ ٹرائل پروڈکشن کامیاب رہا۔ میرے خیال میں کوئی ۵۰ کروڑ کے لگ بھگ آمدنی ہوئی۔ انٹرنیشنل مارکیٹ میں بھی زبردست Goodwill پیدا ہوئی کہ یہ پراڈکٹ اعلیٰ ترین ہے۔ اس کو چلنے دیں۔ انہوں نے یہ کہا کہ آپ

ہمیں بینک گارنٹی دے دیں تاکہ بنک ہمیں پیسے دیں۔ اگر آپ گارنٹی دیں تو ہم یہ سب چلادیں گے۔ اس کے باوجود وزیراعظم پاکستان آیا تو کہا نہیں جی۔ میں اس لیے کہتا ہوں کہ ریاست ترقی کے خلاف ہے۔ اس کے بعد چائنیز کو کہتے ہیں کہ آپ بھی نکل جائیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ ہمارا ۲ ارب کا مال پڑا ہوا ہے ہم کہاں جائیں؟ تاہم ان کو ادھر سے نکال دیا گیا۔ پھر جنرل مشرف آیا اس نے کہا تاریخ میں میرا نام ہوگا۔ نواز شریف نے سینڈک بند کیا تم چلادو، تو وہ چلنے لگا۔ کیا کسی علاقہ کو ترقی دینے کا یہ طریقہ ہوتا ہے؟

گوادر پورٹ کی گراونڈ بریکنگ تقریب کے موقع پر ہم اس وقت کے کور کمانڈر جنرل قادر سے باتیں کر رہے تھے۔ ماہی گیروں کا جلوس آیا۔ آتے ہی انہوں نے Slang language میں باتیں شروع کر دیں۔ کہنے لگے اے تم جھوٹ مت بولو، تم جھوٹ بولنے آیا ہے، تم سڑک کو اورماڑہ تک بنائے گا، گوادر تک نہیں بنائے گا۔ ماہی گیروں نے بلنٹ انداز میں بات کی۔ تو اس کے بعد انہوں نے اعلان کیا کہ نہیں ہم ادھر سے بنائیں گے۔ اس طرح وہ اس کے براہ راست حکم سے شروع ہوا، ورنہ کبھی بھی نہ بنتا۔

بلوچستان کے حوالہ سے اسٹیبلشمنٹ کا ایک مائنڈ سیٹ ہے کہ اس کو پسماندہ رکھو۔ ۵۰ ہزار سپنڈل کی، ایک اوتھل میں اور دوسری یہاں کوئٹہ میں ملیں تھیں جو ایران نے بنائی تھیں۔ ان سے تین شفٹوں میں ۱۸۰۰۰ ملازمتیں پیدا ہوئیں۔ چلنا شروع ہوئی تو جتنا بڑا چور آفیسر تھا اس کو بٹھایا کہ لوٹ مار کرو تاکہ یہ فیل ہو جائے۔ یہ نہیں ہوا تو پھر اس کو بند کر دیا اور آخر اس کو بیچ دیا۔ ڈرامہ یہ کیا کہ فلاں یونیورسٹی کے لیے جگہ، بھئی یونیورسٹی کے لیے نئی بلڈنگ بنادیں جگہ بہت ہے۔ مل والی جگہ ہی ضروری کیوں ہے؟ ہر ایک مل جو ۵ سے ۶ بلین کی تھی ساری بیچ دیں۔ اس کی مشینری ۱۶ کروڑ میں ہمارے گورنر اویس غنی نے خریدی۔ انہوں نے ہی یہ سازش کی تھی۔ بنیادی طور پر سٹیٹ ترقی کے خلاف ہے بلوچستان کی ترقی کے خلاف ہے۔ وجہ سمجھ میں نہیں آتی، میں صحافیوں سے بھی پوچھتا ہوں کیوں خلاف ہے؟

فیڈرل حکومت کا ہر ایک پروجیکٹ ۳۰ سال میں مکمل ہوا ہے کوئی بھی ۳۰ سال سے

پہلے مکمل نہیں ہوا۔ میں چیلنج کرتا ہوں۔ باقی چھوڑیں کچھی کینال ہے اس کو ۲۵ سال ہو گئے ہیں ایک فیز بھی ابھی تک مکمل نہیں ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ۱۰ لاکھ ایکڑ زمین آباد ہو گی اور ۱۰ لاکھ لوگوں کو روزگار ملے گا۔ گوادر ائیر پورٹ سالوں پڑا رہا۔

مسئلہ یہ ہے کہ بلوچستان ایران وافغانستان کے متوازی ایک مکمل ریاست تھی۔ ۹/۸ سو سال سے یہ تین بڑی ریاستیں موجود تھیں۔ انگریز آیا اور اس کو تقسیم کر دیا۔ اب بلوچ جہاں بیٹھا ہوا ہے اس کے پڑوس میں ہر ایک کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔ سرائیکی، پٹھان، سندھی سب کے ساتھ اچھے تعلقات ہیں۔ عرب اور ایران کے ساتھ اچھے ہمسائیگی تعلقات ہیں۔ ۹۰۰/۸۰۰ سال سے کسی کے ساتھ کوئی مثال نہیں ملتی کہ تعلقات اچھے نہ ہوئے ہوں۔ اب یہاں کچھ اوٹ پٹانگ باتیں کہی جارہی ہیں کہ پتہ نہیں کسی کے خلاف ہے اور کس کے خلاف کچھ ہے۔ یہ حقائق صاف بتاتے ہیں کہ یہ Zone of peace رہا ہے مگر آنے والے دنوں میں کرائسز مکران کوسٹ پر رہے گا۔ کشمیر میں نہیں ہو گا اور نہ ہی رحیم یار خان کے بارڈر پر ہو گا بلکہ یہ یہاں رہے گا۔

ایک دفعہ ایک پریس کانفرنس میں ایک آئی جی ایف سی بیٹھے تھے وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارے صوبے میں ۲۵ ملک مداخلت کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بعض دوست ملک بھی اس میں شامل ہیں۔ موجودہ Scenario میں تو آپ کا افغانستان اور انڈیا کے ساتھ جھگڑا تھا۔ اب اسلامی فوج کے بعد تو ایک اور فرنٹ آپ نے ایران کے ساتھ کھول دیا ہے۔ اب خواہ آپ کتنی بھی وضاحت کریں کہ ہمارا مطلب ایران کے خلاف لڑائی نہیں ہے لیکن ایران سے پوچھو وہ کیا کہتا ہے۔ متعلقہ پارٹی وہ ہے اس کا کیا Opinion ہے۔ ہماری کیا بات ہے۔ ہمارا تو کچھ بھی نہیں ہے۔

بنیادی طور پر محل وقوع کی زبردست اہمیت ہے کیونکہ یہ سنٹرل ایشیا کا آئندہ گیٹ وے ہو گا۔ دنیا کی ٹریڈ یہاں سے جائے گی اور جب گوادر پورٹ بن جائے گا تو ۱۲۸ جہاز ایک ساتھ کھڑے ہوں گے۔ یہ انٹرنیشنل ٹریڈ روٹ ہے۔ آپ نے ہندوستان کا راستہ طالبان کو

استعمال کر کے روکا تو انہوں نے چاہ بہار جا کر کھول دیا یعنی یہ بہت کم لوگوں کو پتہ ہے کہ چاہ بہار ایک چھوٹا سا ٹاؤن شپ ہے۔ یہ گوادر سے بہت چھوٹا ہے اب تو بڑا ہو گیا ہے۔ لیکن جاپان ایک سٹیل مل لگا رہا ہے ۲۰ لاکھ ٹن کا۔ ساؤتھ کوریا لگا رہا ہے ۱۵ لاکھ ٹن کی سٹیل مل۔ انڈیا ۲۰ ملین ڈالر کی فرٹیلائزر فیکٹری لگا رہا ہے۔ آپ کے پاس کراچی سٹیل مل صرف ایک لاکھ ٹن کا ہے۔ ایرانی سائیڈ پر آپ کو کوئی پولیس اور سیکورٹی والا یا ڈنڈے والا نہیں ملے گا۔ یہی بلوچ وہاں پر بھی ہیں، کوئی باہر کی مخلوق نہیں ہے۔ یہاں تو ہر طرف فوج ہے، ہر کلومیٹر پر آپ سے تلاشی لی جائے گی۔ تو یہاں انوسٹمنٹ کہاں سے ہو گی انوسٹر کہاں سے آئے گا۔

۵۰ بلین ڈالر کی انوسٹمنٹ ہے ادھر اور یہاں ایک روپے کی بھی دکھا دیں۔ سوائے زمین کے لین دین کے فراڈ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ گوادر میں پینے کا پانی تک نہیں ہے۔ ابھی تک پانی کا انتظام ہی نہیں کیا گیا۔ وزیر اعظم الیکشن مہم میں گئے تو انہوں نے کہا کہ ڈی سیلینیشن پلانٹ لگائیں گے بھئی وہ تو پینے کا پانی ہو گا۔ یہ سارا پورٹ کس طرح چلے گا۔ اس کا انڈسٹریل ایریا اور کمرشل ایریا کہاں سے چلے گا۔ تو یہ گوادر کو ڈویلپ نہیں کرنا چاہتے۔ حکومت کی نیت ہی نہیں ہے۔ البتہ پلاٹ کا دھندہ چلتا رہے گا۔

بنیادی طور پر یہ مکران کوسٹ کی طرف گیم چینج ہو گیا ہے۔ اس میں ان کو Advantage یہ ہے کہ مسقط کی آدھی آبادی اور اس کی آرمی کا ۶۰ فیصد بلوچ ہے۔ دوسری جانب یہ آبنائے ہرمز بھی مکران کوسٹ کے اندر ہی آتا ہے۔ بلوچ بارڈر اس سے بھی ۱۰۰ میل اُدھر یعنی دوسری طرف ہے۔ یوں یہ سارا گریٹ گیم ایران اور پاکستان کے درمیان ہے۔ Syria کے بعد اس کھیل نے ہماری طرف رخ کرنا ہے۔ ایسے میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی کیا پالیسی ہو گی۔ کیسے Defend کریں گے۔ جبکہ سعودی عرب کی فورسز کے ساتھ اتحاد سے ایرانیوں کو Offend کر دیا ہے۔ ایرانی ہمارا بارڈر Insecure سمجھیں گے تو لازماً وہ اپنے طور پر حفاظتی اقدامات کریں گے۔

باقی قبائل کی تقسیم ہے۔ سی ایس پی افسران آتے ہیں اور انہیں باہم لڑاتے ہیں۔ یہ

سارے لوگ Anti-people تھے۔ وہ سارے کے سارے منتخب حکومت کے خلاف بھی سازشیں کرتے تھے۔

## امین اللہ فطرت

اسٹاف رپورٹر روزنامہ جنگ کوئٹہ

یہاں ہمارے بزرگ اور بڑے سینئر لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحئ صاحب اور صدیق بلوچ صاحب کے سامنے بات کرنا میرے لیے آسان نہیں لیکن ان کی اجازت سے بات کرنا چاہوں گا۔ یہاں سرینا ہوٹل میں بیٹھ کر ہر شریک نے بلوچستان کے حالات کے حوالے سے منظر کشی کی ہے، آئین کی باتیں بھی ہوئی ہیں۔ ہر بات اہم ہے لیکن جو باتیں میرے دل پہ اثرانداز ہوئیں وہ قاضی عبدالحمید صاحب کی باتیں ہیں۔ بلوچستان کے حوالے سے ہمارے نوجوانوں کے جذبات بھی اسی طرح سے ہیں۔

بحیثیت رپورٹر میں گوادر سے ژوب تک گیا ہوں جبکہ سی پیک کے حوالے سے بھی دورہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ اس سرزمین کے ایک فرزند کی حیثیت سے میں نے تقریباً سب کچھ قریب سے دیکھا ہے۔ میرا احساس ہے کہ آئین اور قانون کی تو بات ہی نہیں ہے، بلوچستان کے لوگوں کے لیے ترقی اس وقت ہوگی جب امن ہوگا۔ آج یہاں سرینا ہوٹل میں ہمارے بہت سے سابق افسران نے گفتگو کی ہے لیکن شاید اس وقت ان کو یہ باتیں یاد نہیں ہوتیں جب وہ عہدوں پر ہوتے ہیں۔ یہی سوال پارلیمنٹ ممبران سے بھی متعلق ہے کہ پارلیمنٹ میں وہ خاموش ہوتے ہیں اور باہر آکر باتیں کرتے ہیں۔ بلوچستان کے حالات کے بارے میں صدیق بلوچ صاحب نے درست کہا کہ یہ ایک سیکورٹی صوبہ ہے۔ درحقیقت سی پیک کے حوالے سے بھی فیصلے سیکورٹی والے کرتے ہیں۔

سی پیک کی ناکامی کے حوالے سے بھی بات ہوتی ہے، میں نے اپنے طور پر روزنامہ جنگ میں لکھا تھا کہ میرے خیال میں امریکہ سی پیک کو کبھی بھی کامیاب نہیں ہونے دے

گا۔ دوسری جانب ہندوستان بھی اس کے ساتھ مل کر ایسا ہی کرے گا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس امریکہ نے روس کو گوادر سے روکنے کے لیے ۳۰ سال لڑائی کی، لاکھوں افغانوں کا خون بہایا، ہمیں بھی اور ہمارے بلوچ اور پشتون بھائیوں کو بھی دربدر کیا۔ وہ کس طرح خوشی سے چین جیسے ملک کو آسانی سے گوادر تک جانے دے گا۔ اگر سپر پاور روس کو اس نے ناکام کیا تو میرے خیال میں ان کے سامنے چین کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ ہمارے سیاست دان بلوچستان کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔ بلکہ سیاست دان ہی نہیں یہاں کے بیوروکریٹ بھی بلوچستان کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔ ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو وہ بلوچستان کا نام استعمال کرتے ہیں، اس وقت وہ بلوچ اور پشتون بن جاتے ہیں لیکن کرسی یا عہدے پر آنے کے بعد بلوچستان کو اہمیت نہیں دیتے۔

اگلی بات سیکورٹی کے نام پر کیے جانے والے مظالم ہیں۔ بلوچ تنظیموں کے مطابق یہاں کے لوگوں نے ہزاروں لاشیں اٹھائی ہیں۔ ان مرنے والے لوگوں کی ماؤں اور بہنوں کو جواب کون دے گا؟ ان لوگوں کا سی پیک کے ہونے یا نہ ہونے سے کیا تعلق ہے۔ جن لوگوں کے دو دو بیٹوں کی لاشیں ملی ہیں وہ کیسے خوش ہوں گے کہ بلوچستان میں سی پیک آجائے گا جہاں تک آئین اور قانون کی بات ہے سیکورٹی کے نام پر اس کی اہمیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ تلخ بات پر معذرت خواہ ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس طرح سے لوگوں کے ساتھ زور زبردستی کی گئی ہے اس کے بعد ہمارے لوگوں کو نوکری نہیں بلکہ امن کی تلاش ہے۔ یہ اپنے سر کی امان چاہتے ہیں، انہیں سی پیک کی ایک اینٹ کی تلاش بھی نہیں ہے۔ بہت سے علاقوں میں ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ لوگوں کو اپنی خواتین مریضوں اور بزرگوں کو ہسپتال لانے لے جانے کے لیے بھی کئی کئی چیک پوسٹوں پر رکنا پڑتا ہے۔ ایمرجنسی بھی ہو تو ۲۰ منٹ کا فاصلہ چیک پوسٹوں سے ہوتے ہوئے ایک گھنٹے میں طے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے لوگ ان حالات سے تنگ ہیں۔ اب یہ کہا جاتا ہے کہ باہر کے ملک مداخلت کر رہے ہیں۔ یقیناً کر رہے ہوں گے۔ ان حالات کو دیکھ کر وہ ہمارے جذبات سے فائدہ تو اٹھائیں گے۔ ایسے میں

ہمارے لوگ سی پیک کو بھول کر ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملا کر کہیں گے کہ جب ہماری مریض والدہ کی عزت نہ ہو گی تو ہمیں سی پیک کی کیا ضرورت ہے۔

ابھی کچھ عرصہ قبل مجھے حبکو منصوبے کے افتتاح میں رپورٹنگ کے لیے شرکت کا موقع ملا۔ چینی سفیر وہاں تھا، حبکو کا ڈائریکٹر تھا جو بلوچستان سے نہیں تھا، احسن اقبال صاحب تھے ظاہر ہے وہ بھی بلوچستان سے نہیں، چیف سیکرٹری بلوچستان تھے لیکن ان کا تعلق بھی بلوچستان سے نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ۴۰ کے قریب چائینیز تھے لیکن بلوچستان سے چند مقامی لوگوں کے علاوہ کوئی نمایاں آدمی نہیں تھا۔ اگر صورت حال یہ ہو تو امریکہ اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ امریکہ ہی نہیں، ہندوستان اور ایران بھی فائدہ اٹھائے گا۔ آپ ہی بتائیں کہ جب اتنے زیادہ مظالم ہوں تو پھر کیا ہو گا؟

یعنی اگر آپ سرینا سے نکل کر بلوچستان کے حالات کا صحیح طور پر جائزہ لیں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ مقامی لوگوں کے لیے نہ سی پیک ہے اور نہ امن۔ ایسے میں جنگ تو ہو گی اور ہماری سرزمین پر ہو گی۔ چنانچہ ہم لوگ پھر سے تباہ ہوں گے۔ یہ بات شاید کہنے میں مشکل ہو گی لیکن حقیقت یہ ہے کہ سی پیک ہمارے نام پر آیا اور ہمارے ہی نوجوانوں کا خون بہایا گیا ہے۔

غربت کے باوجود ماں باپ قربانیاں دے کر اپنے بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ لیکن اگر ۱۶ سال پڑھانے کے بعد انہیں ایم اے پاس نوجوان بیٹے کی لاش کی بھی ڈی این اے کے ذریعہ شناخت کرانی پڑے تو کیسے توقع کی جاتی ہے کہ اس کا بھائی پڑھنے میں دلچسپی لے گا۔ اس پورے خاندان کے لیے سی پیک کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے۔

## عبدالرؤف مینگل

سابق ایم این اے بلوچستان نیشنل پارٹی (مینگل)

میں معذرت چاہتا ہوں کہ لیٹ ہونے کی بناء پر پہلے سیشن میں ہونے والی گفتگو نہیں سن سکا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مسائل نئے نہیں ہیں بلکہ شروع دن سے ہیں۔ ابھی چند دن پہلے

آئین کا دن منایا جارہا تھا۔ اس موقع پر بلوچستان ایکسپریس کے ایڈیٹوریل میں صدیق صاحب نے ذکر کیا کہ جس وقت آئین بنایا گیا تو ڈاکٹر عبدالحئ صاحب [جو یہاں بھی موجود ہیں] ان سمیت ۳ لوگوں نے احتجاجی طور پر اس پر دستخط نہیں کیے تھے۔ ظاہر ہے ان کی بات نہ سنی گئی۔ لیکن اس ملک کی ۷۰ سالہ تاریخ میں آئین کے ساتھ جو ظلم کیا گیا اس کا کم ہی کوئی ذکر ہوتا ہے۔ یہ ظلم ہر دور میں ہوا ہے، چاہے وہ صدر ایوب خان کا دور ہو یا یحییٰ خان، ضیاء الحق اور یا پھر آمر پرویز مشرف کا دور ہو۔ بدقسمتی اس ملک کی ہے، ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اس کے باوجود ان کے ساتھ ہیں کہ نہ ہماری سفارشات پر عمل درآمد ہوتا ہے، نہ ہمیں سنا جاتا ہے، اور نہ ہی ہمیں اس ملک کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ میں خود بھی پارلیمنٹ کا حصہ رہا ہوں اور مجھ سے سینئر دوست بھی یہاں بیٹھے ہیں جو پارلیمنٹ کا حصہ رہے ہیں۔ کیا اس پارلیمنٹ کے فیصلوں پر عمل درآمد ہوتا ہے؟ صوبائی اسمبلی کے سابق اسپیکر بھوتانی صاحب بھی بیٹھے ہیں۔ معذرت کے ساتھ دریافت کرتا ہوں کہ یہاں صوبائی اسمبلی میں جتنے فیصلے کیے گئے کیا ان پر عمل درآمد ہوتا ہے؟ اور یہ بھی ہم سب ہی جانتے ہیں کہ کتنی ترامیم جبراً لائی جاتی ہیں۔ اس ضمن میں اسمبلی کا ریکارڈ بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

سی پیک کے حوالے سے پنجاب، فیڈرل حکومت اور اسلام آباد کے دانشور جان بوجھ کر یہ تاثر پیش کررہے ہیں کہ بلوچستان کے لوگ ترقی اور تعلیم نہیں چاہتے۔ لیکن میرا سوال ہے کہ جب آپ بندوق کے زور پر سوئی میں چھاؤنی بناسکتے ہیں تو کیا اسی بندوق کے زور پر ڈیرہ بگٹی یا سوئی میں کوئی یونیورسٹی نہیں بناسکتے؟ جس طرح سیکورٹی اسٹیٹ کی بات ہوئی اور بعض دوستوں نے "سیکورٹی پراونس" بھی کہا تو یہ ایک حقیقت ہے کہ معذرت کے ساتھ، صوبہ کو اس کی اسمبلی نہیں چلارہی، نہ ہی یہاں کے چیف ایگزیکٹو اس کو چلارہے ہیں۔

اخبارات اٹھا کر دیکھیں فیتے کون کاٹ رہا ہے؟ چیف ایگزیکٹو تو منشی کی طرح کام پر کھڑا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ جن لوگوں کو اپنی مرضی سے جعلی بیلٹ پیپرز کے ذریعے لائیں گے ان سے نہ بلوچستان کی تقدیر بدلے گی، نہ بلوچستان کی ترقی کا فیصلہ ہوگا اور نہ یہاں کا

کوئی مسئلہ حل ہو گا۔ کیونکہ ان کے پاس کوئی وژن ہے اور نہ ہی درد۔ آپ بلوچستان کی تمام تر صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے وہ کام کریں جو آنے والے دنوں میں بلوچستان کی خوشحالی اور ترقی کا ضامن ہو۔

میں دو چیزیں آپ کے سامنے رکھوں گا کہ جب بے نظیر بھٹو کے قتل کے بعد اقتدار پی پی پی کے حوالے کیا گیا تو زرداری صاحب سے ہماری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ "بلوچستان کے معاملات سے میں اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ بڑے مسائل اور مشکل دور سے گزر رہے ہیں۔ میرے آنے کے بعد کچھ تشفی ہو گی اور کچھ چیزیں حل ہوں گی"۔ پھر جب وہ صدر بننے جا رہے تھے تو پھر اپنی پارٹی کی طرف سے ان سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت انہوں نے کہا "مائنس بلوچستان"۔ یعنی کہ جو گورنمنٹ آپ کو دیتے ہیں وہ مائنس بلوچستان ہے۔ پھر جب میاں نواز شریف کی حکومت آئی تو وزیر داخلہ نے پنجاب ہاؤس میں ہمیں لنچ پر بلایا۔ میں، ہماری پارٹی کے صدر اختر مینگل صاحب، ساجد ترین صاحب اور ڈاکٹر جہانزیب جمالدینی شریک تھے۔ بلوچستان کے معاملات پر بات چیت کی گئی۔ میں نے ان سے یہی بات دہرائی کہ اس وقت زرداری صاحب نے تو یہ بات کی تھی۔ ابھی آپ نئے نئے آئے ہیں تو کیا ہم آپ سے بھی یہی توقع کریں کہ "مائنس بلوچستان"۔ تو وہ کہنے لگے، "نہیں اللہ نہ کرے ایسا کچھ بھی نہیں ہے"۔ لیکن پھر آج چار سال ہونے کو ہیں اسی طرح ہو رہا ہے۔ صورت حال میں تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ اسی طرح مسخ شدہ لاشیں مل رہی ہیں اور اسی طرح چادر اور چار دیواری کی پامالی بھی ہو رہی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا پر پابندی ہے۔ بلوچستان کو انہوں نے بالکل بلیک اینڈ وائٹ کر کے اپنے کنٹرول میں رکھا ہوا ہے۔

ہمارے یہاں ویسٹ کی جمہوریت کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ لیکن وہاں پر پورٹس صوبوں یا اسٹیٹس کے اختیار میں ہیں جبکہ یہاں پر گوادر پورٹ پر اختیارات کے حوالے سے صوبائی اسمبلی سے ریزولوشن متفقہ طور پر پاس بھی ہوئی لیکن آج تک اس پر عمل درآمد نہیں ہوا۔ سی پیک کے معاملے پر اسلام آباد میں آل پارٹیز کانفرنس بلائی گئی۔ تمام پارٹیوں کو

اسلام آباد بلا کر پروجیکٹر پر ایک ایک کر کے تمام نکات پر بات ہوئی تمام سیاسی جماعتوں کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ پلاننگ کے وفاقی وزیر احسن اقبال بھی موجود تھے۔ وہاں پر تمام چیزیں بلوچستان کی طرف سے دلیل کی بنیاد پر اور حقائق اور اعداد و شمار کے ساتھ سمجھائی گئیں۔ سب نے ریزولیوشن پر دستخط بھی کر دیے۔ لیکن آج تک اس پر عمل درآمد کے حوالے سے کچھ بھی نہیں کیا گیا۔

آج کے سیمینار پر بھی میں آپ سے اپنی اور پارٹی کی جانب سے اظہار تشکر کرتا ہوں۔ مگر ایک سیمینار آپ گوادر جا کر بھی کریں تو جو باتیں ہم یہاں کر رہے ہیں وہ وہاں آپ کو دیکھنے کو ملیں گی۔ گوادر آج بھی ایک چھوٹی سی آبادی یا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ پورے ڈسٹرکٹ کی آبادی ڈیڑھ لاکھ ہے اور اس میں گوادر کی آبادی کوئی ۵۰ ہزار ہو گی۔ اب موجودہ مردم شماری کے حوالے سے [افغان مہاجرین کے بارے میں] گرینڈ جرگہ کی سفارشات اور ہائی کورٹ کے فیصلے، دونوں پر عمل درآمد نہیں ہوتا۔ کیا کہیں دنیا میں ایسا دیکھا جا سکتا ہے کہ غیر ملکیوں کو ووٹ کا حق دیا جائے یا اس کو شہری بنا دیا جائے؟ کہیں بھی نہیں۔ ویسٹ میں بھی شاید تب ہوا ہے جب کسی نے سٹیزن شپ لے لی ہو۔ اس حوالے سے UNHCR اور اقوام متحدہ کے بھی قوانین ہیں، یہ تو ان کے بھی Violators ہیں۔ انٹرنیشنل رولز کے تحت کس نے اجازت دی ہے کہ آپ افغان مہاجرین کو لیں۔ میں صرف افغان مہاجرین کی نہیں بلکہ تمام غیر ملکیوں کی بات کر رہا ہوں۔ جو بھی غیر ملکی ہے وہ یہاں کا شہری نہیں بن سکتا۔

بلوچستان ایک چھوٹی سی آبادی ہے جو پہلے سے جنگ زدہ ہے۔ یہاں اب پانچواں فوجی آپریشن ہو رہا ہے اور اس So-called جمہوریت کے اندر بھی یہ ہو رہا ہے۔ دوسری جانب بد قسمتی سے یہاں کوئی اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں۔ ۸ اگست ۲۰۱۶ کا واقعہ[1] ہوتا ہے

---

[1] اشارہ ہے ۸ اگست ۲۰۱۶ء کو گورنمنٹ ہسپتال کوئٹہ پر دہشت گردوں کی جانب سے خودکش بمباری اور فائرنگ کی وجہ سے ۷۰ سے زائد افراد جن میں زیادہ تر وکلاء تھے شہید ہوئے اور ۱۳۰ زخمی ہوئے۔

جس میں بلوچستان کے نوجوانوں اور سپوتوں کو دن دھاڑے ایک منصوبے کے تحت شہید کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی کسی کا بھائی یا بیٹا ہو گا، کسی کا دوست ہو گا۔ کوئی قریبی عزیز ہو گا۔ پھر جب اس سانحے پر کمیشن بنتا ہے اور فیکٹ فائنڈنگ رپورٹ سامنے آجاتی ہے جس میں صوبائی حکومت اور وفاقی حکومت کی نااہلی سامنے آتی ہے۔ بجائے اپنی نااہلی کو تسلیم کرنے کے، ان کو تو کوئی پشیمانی تک نہیں ہوئی بلکہ انہوں نے کمیشن کے فیصلے کو تنقید کا نشانہ بنایا۔

اب ہمارے ساتھ، ہمارے مستقبل کے ساتھ، ہماری عدلیہ کے فیصلوں کے ساتھ اس طرح کا عمل کیا جائے تو کیا یہ ٹھیک ہے؟ بلوچستان چاہے اسٹون ایج میں بھی ہو لیکن آج انٹرنیٹ کا دور ہے، سوشل میڈیا کا دور ہے، کہیں نہ کہیں سے باتیں لوگوں تک پہنچتی ہیں۔ پہاڑوں میں بھی بیٹھے ہوں یا جنگلوں میں ہوں کہیں نہ کہیں بی بی سی یا وائس آف امریکہ تو سنتے ہیں۔ اب جب اس طرح کا رویہ اور مائنڈسیٹ ہو گا اور وفاقی حکومت اور اسلام آباد کی اسٹیبلشمنٹ بلوچستان کے نہتے لوگوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرے گی تو پھر اس کا ردعمل تو فطری ہے خواہ وہ کسی شکل میں بھی ہو۔ آج بھی لوگ لاپتہ ہیں۔ چاہے اس سے پہلے کی ڈھائی سال کی گورنمنٹ ہو یا آج کی منشیوں کی گورنمنٹ ہو، کیا ان کے ورثاء کو، ان کے والدین کو، ان کی ماؤں کو، ان کے بوڑھے بزرگوں کو یہ تشفی دے سکتے ہیں کہ تمہارا بچہ کدھر ہے؟ انہیں کم از کم قبر تو دکھا دیں۔ جب خضدار میں توتک کے علاقے میں اجتماعی قبر دریافت ہوتی ہے اور ۳۰۰ کے قریب لاشیں ملتی ہیں تو کمیشن بنتا ہے اور اس کمیشن کو ہمارے موجودہ چیف جسٹس ہیڈ کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے اپنی نظروں سے دیکھا تھا ان سب نے ایک ایک کر کے اپنے بیانات ریکارڈ کرائے۔ آج تک اس کا فیصلہ ہمارے اس جمہوری دور میں نہ پہلے ڈھائی سال میں لایا گیا، نہ اب امید ہے اور نہ آئندہ امکان ہے کہ یہ کسی رپورٹ کو شائع کریں گے۔

میں معذرت خواہ ہوں۔ کھانے کا وقت بھی ہو رہا ہے لیکن گزارش یہ ہے کہ ہم جمہوری لوگ ہیں، ہم ترقی چاہتے ہیں، اپنے حقوق اور اس سے بڑھ کر اپنا تحفظ چاہتے ہیں۔ اس صوبے میں اپنے گھر کے اندر بھی ہمیں تحفظ نہیں ہے۔ آج بھی آپ کی دعوت پر ہم

دوست کہاں کہاں سے سفر کر کے آئے ہیں لیکن معلوم نہیں کہ یہاں سے اٹھ کر جائیں تو اپنے گھروں کو صحیح سلامت پہنچیں گے یا نہیں۔

کوئٹہ ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ چوہدری نثار آئے تھے تو انہوں نے کہا کہ یہ چار گلیوں کا شہر ہے۔ اب جب چار گلیوں کا شہر ہے تو آپ سے سنبھالا کیوں نہیں جاتا؟ ۳۵ ارب روپے ہم لاء اینڈ آرڈر پر صرف ایف سی کو دیتے ہیں۔ کیا وہ ہمارا تحفظ کریں گے؟ اس کے بعد آپ اخبارات دیکھیں کہ کیا چیزیں رپورٹ ہو رہی ہیں؟ میڈیا پر پابندی ہے، بیرونی ممالک کے سفیر جو اسلام آباد کے اندر بیٹھے ہیں ان سب پر پابندی ہے وہ یہاں بلوچستان نہیں آسکتے۔ باہر کا جرنلسٹ یہاں نہیں آسکتا۔ ہیومن رائٹس وائلیشن پر جو لوگ کام کر رہے ہیں وہ یہاں نہیں آسکتے۔ جب آپ میڈیا کو بند رکھیں گے اور بین الاقوامی تنظیمیں جو انسانی حقوق پر کام کر رہی ہیں ان کو بھی بند رکھیں گے، تھریٹ کریں گے ان کو فون بھی جائے گا ان کے اداروں کو بھی فون جائے گا کہ بلوچستان نو گو ایریا ہے۔ جب آپ بلوچستان کو نو گو ایریا بتائیں گے تو یہاں پر کیا رد عمل ہو گا۔ ٹھیک ہے آپ لوگوں کا یہ سیمینار کامیاب ہونے جا رہا ہے۔ لیکن اس چھتری کے نیچے بے شمار سیمینار ہوئے ہیں، بے مقصد بھی ہوئے اور بامقصد کم ہی ہوئے ہیں۔ لیکن آپ اس سیمینار کو بامقصد بنائیں۔ یہ سیاسی جماعتوں اور سوشل لوگوں غرض تمام لوگوں کے Grievances ہیں۔

میرے بھائی نے یہاں بہت اچھی بات کی کہ اس سی پیک سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں جس سے میرا سر سلامت نہ ہو، میری جان سلامت نہ ہو، میرا گھر سلامت نہ ہو۔ میری ماؤں بہنوں کی چادر اور چار دیواری محفوظ نہ ہو۔ میں سی پیک چاہتا ہوں تو بلوچستان کے لیے چاہتا ہوں۔ ترقی کے لیے تو میرا جھگڑا ہے۔ ڈاکٹر عبدالحئی نے ۱۹۷۳ء کے آئین پر کیوں دستخط نہیں کیے تھے یقیناً ان کے کچھ تحفظات تھے۔ ان تحفظات میں سے کچھ ۱۸ویں ترمیم میں خیراتی طور پر مل گئے لیکن اس پر بھی وفاقی حکومت پشیمان ہے کہ کسی طرح اس کو تھوڑا بہت واپس مل جائے۔

اسلم بھوتانی صاحب کو میں خراج تحسین پیش کرتا ہوں کہ اسپیکر اور پارلیمنٹ کا ممبر ہوتے ہوئے جب ان کے حلقے میں کنڈ ملیر کا جو علاقہ ہے وہاں پر فیڈرل گورنمنٹ نے کوڑیوں کے دام زمین الاٹ کرائی لیکن انہوں نے وہ واپس کرادی تھی۔ دیکھیں گورنمنٹ میں ہونے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ آنکھیں بند کرلو۔ انہوں نے سیاسی احتجاج کیا، پارلیمنٹ کے اندر بھی احتجاج کیا اور پھر ہائی کورٹ سے لے کر سپریم کورٹ تک احتجاج کیا۔ انہوں نے وہ آرڈر واپس کرائے اور پھر اس الاٹمنٹ کو منسوخ بھی کرایا۔ اب سننے میں آیا ہے کہ ہمارے So-called جمہوری لوگوں نے دوبارہ ان کو آرڈر دیا ہے۔ اب گوادر کو غنیمت سمجھ کر لوگوں کی زمینیں بانٹ رہے ہیں۔ یہ زمینیں قبائلیوں کی ہیں اور یہ ان کی سیٹلمنٹ طاقت کے زور پر کر رہے ہیں۔ اپنے کچھ ٹاؤٹس رکھے ہوئے ہیں جن کے ذریعہ یہ کام کروا رہے ہیں۔ اب کل کے دن قبائلیوں کی زمینوں پر جھگڑے سامنے آجائیں گے۔ یہاں سے بیٹھ کر وہ جو ماشاءاللہ وائٹ کالر والے ہیں آپس میں زمینیں تقسیم کر رہے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو لوگ وہاں کے ہیں، کم از کم جن کی زمین یا جن کا موضع ہے، جن کی کھتونی ہے، جن کے نمبرز آتے ہیں زمین ان کے نام پر تو کر دیں۔ لیکن یہ ان سے نہیں ہو پا رہا ہے۔

کرپشن اس نہج تک پہنچ چکی ہے کہ تمام اداروں میں ہے اور ایک سیاسی ورکر کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ پارٹیوں کے اندر بھی رواج بن گئی ہے۔ اور کرپشن پر کسی کو ندامت بھی نہیں ہو رہی ہے وہ اسے شیر مادر سمجھتے ہیں اور دوسرے دن یہاں پر سینہ تان کر چل رہے ہوتے ہیں۔ وہ پیسے جو ۱۸ویں ترمیم کے ساتھ ملے ہیں اگر ایمان داری کے ساتھ خرچ ہو جائیں تو بہت سارے مسائل میں کمی آسکتی ہے اور جب پیسے Lapse ہوتے ہیں اس سے بڑھ کر اب گُڈ گورننس کی نفی کس طرح ہو سکتی ہے۔ یہ آپ کی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پچھلے ادوار میں بھی یہاں سے پیسے Lapse ہوئے ہیں اور اس بار بھی ۳۰/ ۳۵ ارب روپے کے قریب Lapse ہوئے۔ جبکہ یہاں پر لوگوں کو پینے کے صاف پانی تک دستیاب نہیں ہے۔

آخر میں Conclude کرتا ہوں کہ نصیر آباد کا ڈسٹرکٹ جو کہ زرعی علاقہ ہے اور ایک ڈویژنل ہیڈ کوارٹر بھی ہے۔ اس کو ایسٹرن بلوچستان کہتے ہیں اور اس کا بارڈر خان گڑھ جیکب آباد سندھ کے ساتھ لگتا ہے۔ اس وقت یہ آپ کے نیشنل ہیلتھ پروگرام کی رپورٹ ہے کہ یہ پوری دنیا میں ہیپاٹائٹس اے بی اور سی کے حوالے سے سب سے زیادہ Affected علاقہ ہے۔ اور بجٹ کے پیسے یہاں Lapse ہو رہے ہیں۔ ان کو کچھ نہیں چاہیے صرف ان کو صاف پانی چاہیے۔ اوپر سے جو آلودہ پانی نہروں کا آرہا ہوتا ہے وہ اسی پانی کو زراعت کے لیے استعمال کرتے ہیں، وہی پانی گھر کے لیے استعمال کرتے ہیں اور وہی پیتے بھی ہیں جس کی وجہ سے یہ مرض لاحق ہے اور تیزی سے بڑھتی جارہی ہے۔

## ہدایت الرحمٰن بلوچ

سیکرٹری جنرل جماعتِ اسلامی بلوچستان

بلوچستان کسی مُلا اور غیر مُلا یا اسلام کا مسئلہ نہیں ہے۔ اس ملک میں دوسرے بہت سارے مظلوموں کی طرح اسلام بھی مظلوم ہے۔

کہتے ہیں اقوام پر زوال آنے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی اندرونی خرابیوں کا تذکرہ کرنے اور ان کا جائزہ لینے کے بجائے بیرونی مداخلتوں کا ذکر کر کے مطمئن ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں وہ زوال سے نہیں نکلتیں۔ ہم مذہبی حوالے سے جب بات کرتے ہیں تو سیکولر ساتھی یہی کہتے ہیں کہ آپ ہر چیز میں کہتے ہیں اسرائیل کی سازش ہے، امریکہ کی سازش ہے، بھارت کی سازش ہے، یہ نہیں دیکھتے کہ ملک کے اندر بھی بہت کچھ چل رہا ہے۔ اسی طرح بلوچستان اور اس کے مسائل کے معاملے میں بھی ہم ہمیشہ اسی طرح بیرونی عوامل کا ذکر کرتے ہیں۔ اور اسی طرح بیرونی عوامل پر بحث میں بہت سا وقت صرف کیا جاتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں بیرونی مداخلتیں بھی ہیں لیکن یہ اگر ۱۰۰ میں سے ۸۰ یا ۶۰ فیصد بھی ہو تو تسلیم کرنا چاہیے کہ کوئی ۲۰ یا ۴۰ فیصد میرا اور آپ کا اپنا قصور بھی

ہو گا۔ بہت سی خرابیوں میں میر اور آپ کا کندھا استعمال ہوا ہو گا۔ در حقیقت بلوچستان میں ۱۹۴۸ کے آپریشن سے لے کر اگلے ہر آپریشن میں کسی نہ کسی بلوچ کے کندھے بھی استعمال ہوتے رہے ہیں۔ مثلاً کیا جب اکبر بگٹی شہید ہوئے تو بلوچستان حکومت میں شامل بلوچوں میں سے کسی ایک نے بھی استعفیٰ دیا؟ بعد میں جب حکومت چلی گئی تو سب واویلا کرتے رہے کہ وہ شہید ہے۔ صوبائی بیوروکریسی میں بھی اس صوبے اور سرزمین سے محبت کرنے والے بہت سے بلوچ تھے۔ اس بیوروکریسی میں سے کسی ایک افسر نے بھی استعفیٰ دیا؟ کیا کوئی ایک بھی مثال ہے؟

قومی اسمبلی میں بلوچستان کے ۱۷ نمائندے ہیں سینیٹ میں ۲۲ ہیں۔ ان ۳۹ نمائندوں میں سے ایک نے بھی کسی سنجیدہ رد عمل کا اظہار نہ کیا۔ اسی طرح صوبائی اسمبلی میں ۶۵ ممبران اور صوبائی بیوروکریسی کے بہت سے لوگ ہیں جو کم از کم اس وقت کوئی رد عمل دینے سے معذور رہے۔ اب اپنی اپنی پوزیشن کھونے یا چھوڑنے کے بعد سچ بولا بھی جائے تو اس کا کیا فائدہ ہے۔ در حقیقت سچ بات بھی اپنے وقت پر ہی اثر انداز ہوتی ہے اور اسی وقت اچھی بھی لگتی ہے۔ [عبدالرؤف مینگل: میں نے اور ہماری پارٹی کے اراکین نے اسمبلیوں سے استعفے دیے تھے] لیکن اکبر بگٹی کا داماد شاہد بگٹی تو آخر وقت یعنی اپنی ریٹائرمنٹ تک سینٹ میں موجود رہا۔ اس نے بھی استعفیٰ نہیں دیا۔

اکبر بگٹی کے قتل کے بعد ایک جرگہ میں بلوچستان کے تمام سردار اور معتبرین ایک جگہ اکٹھے بھی ہوئے تھے۔ وہاں تمام لوگ اکٹھے ہوئے وہاں عالمی عدالت کے ذکر کے علاوہ اور بھی بہت سے دعوے کیے گئے کہ ہم یہ کریں گے اور وہ کریں گے۔ لیکن جب ان میں سے آدھے لوگ کابینہ کا حصہ ہو گئے تو عالمی عدالت کو بھی بھول گئے، بگٹی صاحب کو اور ان کے مقدمہ کو بھی بھول گئے۔ اب کوئی نام بھی نہیں لیتا کہ کوئی جرگہ ہوا تھا، حالانکہ اس وقت بلوچستان کی تمام اعلیٰ قیادت اور سرداران وہاں موجود تھے۔

گوادر کے ایم پی اے کا تعلق پہلے ق لیگ سے تھا اب اس کا تعلق بی این پی مینگل سے

ہے۔ وہاں کی لاکھوں ایکڑ کی زمین کا اب اسی ایم پی اے کے نام پر اضافہ ہو رہا ہے۔ میں گوادر سے تعلق رکھتا ہوں، ماہی گیر کا بیٹا ہوں لیکن میرے پاس ۱۰۰ گز زمین بھی نہیں ہے۔ جبکہ گوادر ایسا علاقہ ہے کہ وہاں ڈیرہ بگٹی، جعفر آباد وغیرہ کی طرح کوئی بڑا جاگیر دار یا کوئی سردار نہیں ہے کیونکہ وہ سرداری علاقہ نہیں ہے۔ اسی لیے وہاں ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی فرد کے پاس پہلے سے لاکھوں ایکڑ زمین ہو۔ لیکن ہمارا وہاں کا جو ساتھی ایم پی اے ہے اس کے پاس موجود ہے۔

دوسری جانب میں خود پہلے پی ایم ایل ق میں تھا اور اس بات کا ذاتی طور پر گواہ ہوں کہ جب وہاں کے نوجوانوں کو لاپتہ کر کے مارا گیا تو میرے اصرار کے باوجود ہمارے اس ایم پی اے نے مقتول کے والد کو تسلی دینے کے لیے اس کے پاس جانے سے بھی انکار کر دیا اور کہا کہ "واجہ کار ناراض باں" [بلوچی سے ترجمہ: جناب ناراض ہوں گے]۔ سوال یہ ہے کہ بلوچستان کے ۶۵ ارکانِ اسمبلی اگر وہاں کے ایک مظلوم والد کو جا کر تسلی نہیں دے سکتے۔ تو ریکوڈک اور سوئی گیس یا سینڈک پر کیا لڑائی کریں گے۔ ایسے لوگ میرے جیسے عام بلوچ کے حقوق کے لیے کیا جدوجہد کر سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے بلوچستان کے مسائل کے لیے میں کسی اور کو موردالزام نہیں ٹھہراتا، اپنے آپ کو ہی ذمہ دار سمجھتا ہوں۔ سرفہرست اگر کوئی اور بھی ذمہ دار قرار پائے تو دوسرے اور تیسرے نمبر پر تو میں ہی ہوں، میں نہ ہوں گا میرا بھائی یا کوئی اور رشتہ دار ہو گا، میرا وزیر اور میرا اسیکرٹری ہو گا۔ یوں بلوچستان کے مسائل کے ذمہ دار ہم خود بھی ہیں۔ ابھی ایک تازہ مثال وزیر اعلیٰ کی طرف سے سی پیک پروگرام کی ہے۔ اس حوالہ سے ایک صحافی دوست نے بتایا کہ وزیر اعلیٰ صاحب نے کہا کہ جو کچھ مل رہا ہے وہ لے لو باقی شور نہیں کرو۔ اگر یوں ہی ہونا ہے تو ہمارے اپنے وزیروں کا آخر کام کیا ہے۔

بلوچستان کا ایک اور بڑا مسئلہ کرپشن ہے۔ تعلیم، صحت، گلیاں، بازار، روزگار سب کچھ تباہ ہو رہا ہے۔ بڑی تعداد میں ٹارگٹ کلنگ ہوئی ہے۔ اس کے پس منظر میں کرپشن ایک اہم عنصر ہے۔ ہمارے ہاں پانی نہیں ہے لیکن پانی کی ٹینکیوں سے پیسے برآمد ہوتے ہیں۔

یہاں ۷۰ / ۸۰ فیصد کرپشن ہے اور اسی لیے تمام ادارے تباہ و برباد ہو گئے ہیں۔ کرپشن کے الزام میں گرفتار صاحب جب جیل سے رہا ہوتے ہیں تو وکٹری کا نشان بناتے ہیں کہ میں نے بلوچ قوم کے لیے جیل کاٹی ہے۔ شرم سے ہماری آنکھیں جھک جاتی ہیں کہ کس مقصد سے جیل میں گئے تھے اور وکٹری کے نشان لے کر نکل رہے ہیں۔ کیس چل رہے ہوتے ہیں کہ کرپشن کے پیسے کہاں ہیں۔ اور عدالت کے سامنے میڈیا سے ایسے گفتگو کر رہے ہوتے ہیں جیسے انہی لوگوں نے قائداعظم کے ساتھ مل کر پاکستان بنایا تھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ بلوچستان کی تباہی کے ذمہ دار کوئی اور نہیں، ہم خود ہیں۔ یہاں کے منتخب نمائندے ہوں، دیگر سیاسی قیادت ہو یا بیوروکریسی، سب ہی نے اس سرزمین کے لوگوں کی سودے بازی کی ہے۔ اگر بلوچستان کے ۶۵ ارکانِ اسمبلی اکٹھے ہو جائیں تو پاکستان کیا امریکہ کی فوج بھی ہمارے مسائل کو حل ہونے سے نہیں روک سکتی۔ اگر میں اور آپ متفق ہو جائیں تو کسی آدمی کی جرأت نہیں ہو گی کہ میرا سینڈک، میرا سونا، میری زمین اور میرے وسائل کو چھین کر لے جائے۔ بس ہمارے لیڈر یہاں کی بہادر قوم کے لیڈر بنیں، سودے بازیاں نہ کریں کہ کرسی میں ہوں تو سب اچھا ہے، اور کرسی سے نکلیں تو سب خراب ہے۔

## پروفیسر منظور بلوچ

لیکچرار بلوچستان یونیورسٹی

میرے لیے سینئر حضرات کی موجودگی میں بات کرنا مشکل ہے بالخصوص جب بات سی پیک اور بلوچستان کی ہو رہی ہو تو یہ خدشہ رہتا ہے کہ بہت ساری چیزیں آپس میں گڈمڈ ہو جائیں۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہمیں بولنے کی اجازت نہیں ہے اور جب بولنے کا کوئی موقع ملتا ہے تو اس میں ہم اپنے زخم ہی پھوڑتے ہیں شاید اس لیے کہ ہمیں زخموں کے علاوہ اور ملا بھی کیا ہے۔ ہمارے گھروں میں آج بھی ہمارے بھائی لاپتہ ہیں۔ بچے دیکھتے ہیں کہ کل تک ان کے چچا، ماموں، بڑے بھائی ان کے ساتھ تھے اور پھر اچانک غائب ہو گئے۔ ان کی یاد

اور غم میں لمبی جدائی ہوتی ہے۔ سالوں تک پتہ نہیں چلتا یا اس وقت پتہ چلتا ہے جب ان کی لاشیں آتی ہیں۔

میرا اپنا بھانجا سوا سال پہلے غائب کر دیا گیا ہے۔ بی ایس سی کا سٹوڈنٹ تھا۔ اس کی والدہ نے ایک دن مجھ سے کہا کہ میں اپنے بچے کے لیے اس طرح بے چین ہوں جس طرح رمضان میں بعض اوقات شدت کے ساتھ پیاس محسوس ہوتی ہے۔ لیکن میرا المیہ یہ ہے کہ میری پیاس کو لکھنے والا کوئی انتظار حسین یا منٹو نہیں ہے۔ شاید ہمیں انسان نہیں سمجھا جاتا۔ ان کی دلچسپی ہمارے وسائل سے ہے اور یہی ان کو پیارے ہیں۔ سردار عطاء اللہ مینگل اپنی بوڑھی آنکھوں کے ساتھ اپنے بیٹے اسد مینگل کی قبر کا پوچھتا ہے لیکن اسے کچھ نہیں بتایا جاتا۔

دوسری جانب ہمارے دانشور ہوں یا سیاست دان، ان سب کو اپنے سروں کی فکر ہے کہ اگر کوئی بات کریں گے تو ہمارے سر جائیں گے۔ جو کوئی بات کرتے بھی ہیں ان سے اکثر کہا جاتا ہے احتیاط سے بات کیا کرو نہیں تو مارے جاؤ گے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مارے جانے کے لیے تو یہاں کسی 'جرم' کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بہت سارے ایسے لوگ دیکھے ہیں جنہوں نے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی۔ سیاست میں حصہ لینا تو دور کی بات وہ تو سیاست کی الف ب تک نہیں جانتے تھے وہ بھی مارے گئے۔ میرے ایک چچازاد بھائی کو کراچی سے اٹھایا گیا۔ اس کی اتنی بھی سیاسی معلومات نہ تھیں کہ سردار عطاء اللہ مینگل اور سردار اختر مینگل کی پوزیشن میں فرق کا بتا سکتا۔ بمشکل کوئی پچاس دن بعد واپس مل سکا۔

مجھے یاد ہے جب سردار اختر مینگل وزیر اعلیٰ تھے اور حیربیار مری ان کی حکومت میں وزیر تھے تو ان پر ایک پرنسپل کے اغوا کا الزام لگا۔ اس زمانہ میں جب اسمبلی میں رپورٹنگ کے لیے جاتے تو وہاں ہمارے صحافی ساتھی اس بات پر بہت ناراض تھے کہ یہ بہت بڑا ظلم ہوا ہے۔ حیربیار مری نے بڑا ظلم کیا ہے ایک پرنسپل کو اغوا کیا ہے۔ پھر چیف جسٹس امیر الملک مینگل نے اس کا نوٹس بھی لیا۔ یعنی ظلم کے حوالے سے کوئی نہ کوئی آواز اٹھتی تھی لیکن آج جب بلوچوں کو عام غائب کیا جانے لگا تو کسی صحافی کو بھی گرجتے برستے نہیں دیکھا۔ نہ ہی کسی

چیف جسٹس کو سو موٹو نوٹس لیتے دیکھا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج خواہ بہت سی چیزیں بظاہر نظر نہیں آرہی ہوں لیکن اندر اندر ایک طوفان موجود ہے۔

سی پیک کے حوالے سے یہاں بات کی جارہی ہے لیکن اس کا اعتبار اور ضمانت کیا ہے کہ جو باتیں ہم یہاں رکھیں گے وہ کوئی سننے والا بھی ہے، تجاویز کا فائدہ کیا ہے؟ باتیں تو پہلے ہی ساری موجود ہیں۔ نواب اکبر بگٹی نے ڈوزیئر بھی لکھا تھا اسے آپ پڑھ لیں تمام چیزیں موجود ہیں۔ اس سے پہلے ہمارے تمام اکابرین نے جو باتیں رکھیں وہ تمام موجود ہیں لیکن جب نواب بگٹی جیسی شخصیت کو اس طرح شہید کیا جاتا ہے اور ان کی بات کو کوئی نہیں پوچھتا تو ہماری آپ کی کیا بات ہے۔

میں ہدایت الرحمٰن صاحب سے بالکل اتفاق کرتا ہوں کہ ہماری اپنی کمزوریاں بھی ہیں۔ میرا صحافی میرا نہیں ہے، میری سوسائٹی سے وہ تعلق نہیں رکھتا، میرا لکھاری میرا نہیں ہے، اس لیے کہ اس نے میرا دکھ نہیں لکھا۔ میرا سیاستدان میرا نہیں۔ میرا شاعر میرا نہیں ہے، وہ بھی جعلی ہے۔ وہ ان کے لیے لکھتا ہے، پہلے دربار تھا اب سرکار ہے۔ تو جہاں ادیب، صحافی اور دانشور بات کہنے کے لیے تیار نہ ہوں وہاں کس سے گلہ کریں۔ ہمارے بیوروکریٹ اس وقت تک بلوچ نہیں بنتے جب تک او ایس ڈی نہیں ہوتے یا ریٹائرمنٹ کو نہیں پہنچ جاتے۔ جب یہ سیٹ پر ہوتے ہیں تو ٹھیک طرح سے ہاتھ بھی نہیں ملاتے یہ بھی ہمیں اسی نظر سے دیکھتے ہیں جس نظر سے ہمیں باہر سے آنے والے دیکھتے ہیں۔ Paulo Coelho نے ٹھیک کہا ہے کہ جب کوئی قوم مغلوب و محکوم ہو جاتی ہے تو اس کے الیٹ اپنی قوم کی بجائے غالب قوم سے وفاداری نبھاتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ میں ان دربدر خاک نشینوں کے ووٹوں سے آگے نہیں آیا ہوں مجھے کہیں اور سے سلیکٹ کیا گیا ہے۔ اور جس نے سلیکٹ کیا ہے وہ اس سے وفاداری نبھاتے ہیں۔ اگر کوئی گورنر بنا ہے تو جانتا ہے کہ اسے گورنر کس نے بنایا ہے؟ وہ اس کی ہی خوشنودی کے لیے سرگرم رہتا ہے۔ چنانچہ اس پر حیرانی نہیں ہونی چاہیے کہ نواب اسلم رئیسانی خود کہتے تھے کہ بلوچستان اسمبلی کی قرارداد یں اسلام آباد میں ایک سیکشن آفیسر چیک کرتا ہے۔

در حقیقت ہمارے جو نمائندے چنے جاتے ہیں وہ ہمارے نہیں ہوتے بلکہ ہم پر مسلط کیے جاتے ہیں۔ یہاں کبھی حقیقی سیاسی پراسیس کو زندہ نہیں رکھا گیا۔ اسے ہمیشہ اوپر سے تھونپا گیا ہے اسی کے نتیجے میں حالات یہ ہیں کہ جس کے پاس پیسے ہیں وہ اس کے بل پر ایم پی اے بن جاتا ہے۔ اس کے بعد یہی لوگ کہتے ہیں اسمبلی پیسے کمانے کا بہترین ذریعہ ہے۔

تعلیم کی حالت یہ ہے کہ بلوچستان یونیورسٹی نیم فوجی چھاؤنی ہے۔ میں پروفیسر ہوں لیکن مجھے گھر جانے کے لیے کارڈ دکھانا پڑتا ہے۔ سپاہی اٹھتا ہے مجھے روکتا ہے کہ کہاں جارہے ہو، میں کہتا ہوں گھر جارہا ہوں پوچھتا ہے کارڈ ہے، جی کارڈ ہے پھر وہ مجھ سے میرا مکان نمبر بھی پوچھتا ہے۔ یہ ہماری عزت ہے۔ پھر لوگ کہتے ہیں کہ یہاں تعلیم نہیں ہے، لوگ پڑھتے نہیں ہیں۔ آج بھی ہمارے طلبہ تین میڈیکل کالجز جنہیں منظور کیا گیا ہے کو فعال بنانے کے لیے بھوک ہڑتال پر ہیں۔ آئی ٹی یونیورسٹی میں بلوچوں کو داخلہ نہیں ملتا اس کے لیے بھی بھوک ہڑتال کی لیکن کس نے سنا۔ آج بھی ڈگری کالج کوئٹہ مردم شماری کی وجہ سے بند ہے۔ لیکن کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ ہم سب لوگ یہاں سطحی باتیں کرتے ہیں۔ ہمیں لوگوں کے دکھ اور کرب کا اندازہ نہیں ہے۔ یونیورسٹیوں میں بلوچ آپ کو خاکروب کا کام کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔ یہ المیہ نہیں ہے تو اور کیا ہے کہ آپ نے اس قوم کو جو اس خطے کے مالک ہے خاکروب بنادیا ہے اور اگر اس پر کوئی بات کرے تو اس کا سر اڑادیا جاتا ہے۔ یہ المیہ ہے کہ بولتا کوئی نہیں۔ اگر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خاموش رہ کر بچ جائیں گے تو جان لینا چاہیے کہ بچے گا کوئی نہیں۔ میرے خیال سے آنے والے دن بہت زیادہ سخت ہوں گے اور اس کی وجہ یہ سی پیک ہے۔

سی پیک سیدھا سادہ مسئلہ نہیں ہے۔ اس کی انٹرنیشنل Dynamics ہیں جس پر بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے۔ ہن ٹنگٹن نے اپنی کتاب تہذیبوں کا تصادم کے آخری باب میں وضاحت سے لکھا ہے کہ ویسٹ کا غلبہ اور اقتدار ختم ہو کر اب ایشیا کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ اور ایشیا میں جو بڑی قوت بن سکتی ہیں ان میں چین، روس، انڈیا، انڈونیشیا اور جاپان شامل ہیں۔ اس طرح اس میں کوئی شک نہیں کہ چین ایک سپر پاور کے طور پر ابھر رہا ہے۔ یہ

ہماری طرف آ رہا ہے۔ طاقت ایک سامراج کے ہاتھ سے دوسرے سامراج کے ہاتھ میں آجائے گی۔ ظاہر ہے مغرب یا امریکہ اس پر خوش نہیں ہے۔ علاقہ میں چین کا جو مدمقابل ہے وہ ہندوستان ہے۔ اگر ہندوستان سیکیورٹی مسائل میں نہ الجھا ہو اور اکانومی میں آگے بڑھ رہا ہو تو ویسٹ اور امریکہ اسے ہی سپورٹ کریں گے۔ گوادر سے جڑا بحری راستہ ۷۰ فیصد توانائی کا ذریعہ ہے۔ جس کے پاس یہ راستہ ہو گا وہ اگلے دور کا سپر پاور ہو گا۔ اس طرح یہ بہت بڑوں کی جنگ ہے۔ مجھے نہیں پتہ کہ چین کے بارے میں پنجاب کے دانشوروں کی کیا رائے ہے۔ تاہم خدشہ ہے کہ کل وہ بھی رو رہے ہوں گے۔ کیونکہ چین صرف خود نہیں آتا وہ اپنی لیبر بھی ساتھ لے کر آتا ہے اور اس میں یقیناً جنگ ہو گی۔

بلوچستان بہر حال وار تھیٹر ہے اور یہاں پر آگ لگی ہوئی ہے۔ ہمیں کہا جاتا ہے کہ ہم یہاں ترقی چاہتے ہیں۔ دنیا میں ایسی کوئی مثال ہم نے تو نہیں دیکھی کہ کسی اور قوم نے آکر دوسری قوم کو ترقی دی ہو۔ یہی دعویٰ لے کر برطانیہ نے نو آبادیات قائم کیں۔ اس کا کہنا تھا کہ سفید آدمی کا فرض ہے کہ وہ جاہلوں اور گنواروں کو تہذیب سکھائے۔ اصل میں وہ وسائل پر قبضہ کے لیے آئے ہیں۔ بلوچ زندہ رہتا ہے یا مر جائے ان کے لیے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہاں پر کہا جاتا ہے کہ کتا مارا جائے اس کا وارث ہے لیکن بلوچ کا وارث نہیں ہے۔ در حقیقت مختلف اقدامات کے ذریعہ ہمیں یہی باور کرایا گیا ہے۔ ہمارے سیاستدان کبھی پارلیمنٹ اور کبھی تحفظات کی بات کرتے ہیں لیکن وہ ان تمام چیزوں میں خود بھی شامل ہیں۔ ان کی بزدلی، ڈرامہ بازیوں اور دھوکے بازیوں نے بلوچ قوم کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ آج ان کی دھوکے بازیوں کی وجہ سے نوجوان گاجر مولی کی طرح کٹ رہے ہیں لیکن ان نوجوانوں کی بات کوئی بھی نہیں کر رہا۔

کوئٹہ میں آپ کسی طرف بھی جائیں تو راستے کی چیک پوسٹوں پر اپنی عزت کا پتا چل جائے گا۔ ان چیک پوسٹوں پر عام آدمی ہی نہیں ہمارے بڑے بڑے بھی بے عزت ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ بتاتے نہیں ہیں۔ ہمارے بڑے بڑے سردار اور نواب جب پنجاب

جاتے ہیں تو ہمیں پتا ہے کہ وہاں وزیر اعلیٰ کے سیکورٹی گارڈز بھی ان سے ملنے سے انکار کر دیتے ہیں۔ یہی لوگ یہاں آ کر ہمیں آنکھیں دکھاتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ در حقیقت جب کوئی بھی قوم سیاسی طور پر مغلوب ہوتی ہے تو اپنا غصہ اپنے آپ پر اتارتی ہے۔ جس طرح ہندوستان میں جب ہندو اور مسلمان انگریز سے لڑ نہیں سکتے تھے تو آپس میں لڑتے تھے۔ جبکہ ہندوستان میں تو اس وقت بیوروکریسی اور ساری ملازمتیں خود ہندوستانیوں کے پاس تھیں۔

مسئلہ یہ ہے کہ کیا میں اپنے گھر میں اپنی مرضی کے ساتھ رہنے کا مالک ہوں یا نہیں۔ یہ میرا گھر ہے یا نہیں ہے۔ یہاں پر باہر سے آنے والا سپاہی مجھ سے پوچھتا ہے کہ آپ کہاں جا رہے ہیں مجھ سے زیادہ اس شناختی کارڈ کی اہمیت ہے جس کے پاس یہ نہیں ہوتا اسے عقوبت خانوں میں پھینک دیا جاتا ہے اور کوئی عدالت نہیں پوچھتی۔

مردم شماری پر تو عدالت بہت تیز ہے کہ یہ ہونی چاہیے لیکن ڈیرہ بگٹی، کوہلو، خضدار اور قلات اور دوسرے علاقوں سے بڑی تعداد میں لوگ ہجرت کر چکے ہیں۔ اس طرح بہت سارے علاقے قحط کی وجہ سے خالی ہو گئے ہیں، یا اسی طرح نصیر آباد سے لوگ سیلاب کی وجہ سے منتقل ہو گئے ہیں۔ ان علاقوں میں آپ کیا مردم شماری کریں گے۔ یہ بھی ایک طرح کا ڈنڈا ہے جو بلوچ قوم کو دکھایا جا رہا ہے۔ ایک طرح سے میں خوش ہوں کہ بلوچوں کو اقلیت میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ شاید ہمارے اشرافیہ کو پتا چلے ان کی اوقات کیا ہے کیونکہ وزارت اعلیٰ پر بھی ان کو آنا ہوتا ہے۔

سی پیک سے ہمیں کیا ملے گا؟ ہم تو بیگانی شادی میں عبد اللہ دیوانہ کی حیثیت سے بیٹھے ہیں۔ صورت خان مری لکھتے ہیں کہ ۱۹۵۰ کی دہائی میں بگٹی قبیلے کے کچھ لوگ اسلام آباد گئے اور وہاں بیوروکریسی سے بات کی کہ ہمیں سوئی گیس چاہیے تو انہوں نے ایک میٹنگ کی اور کہا کہ بگٹی جاہل ہیں انہیں گیس دے دی تو وہ تو اپنے گھر جلا بیٹھیں گے۔ اب وہ واقعی اپنے گھر جلا رہے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا تھا کہ اس بار کی جنگ میں پر چھائیاں بھی جل جائیں گی اور خطرہ ہے کہ واقعی پر چھائیاں جل جائیں گی، بچے گا کچھ بھی نہیں۔

اس بحران کی بہت سی شکلیں ہیں۔ ۲۰۰۳ء میں غالباً میں نے اے آر صدیقی کا ایک انٹرویو پڑھا تھا۔ صدیقی صاحب ۱۹۷۰ء کے عشرے میں یہاں آئی ایس پی آر کے ڈی جی تھے۔ انہوں نے کہا کہ اب کی بار اگر بلوچستان میں آپریشن کیا گیا تو ۱۰۰ سال تک پاکستان اس کے بحرانوں سے نہیں نکل سکے گا۔ لیکن ان کی بات کسی نے نہیں سنی۔ بحرانوں کی ہی شکل یہ بھی ہے کہ اس ملک میں تو منٹو، فیض اور اقبال جیسے لوگوں کو بے عزت کیا جاتا رہا ہے۔ یہ سارے پنجابی ہیں بلوچ نہیں ہیں۔ فیض صاحب کو ہتھکڑیاں پہنا کر بازاروں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ کیا جالب کو بھول گئے، جالب کے ساتھ کیا کیا نہ کیا گیا۔ درحقیقت اگر بات نو آبادیات کی ہے تو نو آبادیات میں جب انگریز تھا تو یہاں اقبال اور منٹو بھی تھے۔ لیکن اس طرح نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تو آپ ایک روز کسی فنکار یا شاعر کو اٹھاتے ہیں اور اگلے روز اس کی مسخ شدہ لاش ملتی ہے۔

بحران کی ایک شکل تعلیم کے میدان میں ہے جو صحیح غلط کی پہچان نہیں صرف تابعداری کا سبق دیتی ہے۔ بحران کا تعلق لکھنے والوں سے بھی ہے۔ یہ کون ہیں یہ بھی آپ کے سامنے ہے۔ جو صحیح لکھنے والے ہیں انہیں موقع ہی نہیں ملتا۔ درحقیقت بلوچستان کی نمائندگی وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں سرکار نے گڈ بکس میں رکھا ہوا ہے جن سے سرکار کو کوئی خطرہ نہیں ہے، یہ لوگ ڈرتے ہیں کہ حقائق کے بارے میں بولے تو جان چلی جائے گی۔ یہاں ہمیں بولنے، لکھنے اور تقریر کا موقع ہی نہیں ملا۔

آج بھی یہاں وہی مائنڈ سیٹ ہے جو قیام پاکستان کے وقت تھا۔ اس وقت کے کچھ دانشور سندھی حضرات پاکستانی حکومت کے ایک بڑے عہدیدار سے ملنے گئے کہ ہمارے کلچر کا کیا بنے گا؟ تو اس نے ہنس کر کہا کہ کون سا کلچر! گدھوں اور خچروں کا کلچر، تم ان کے لیے پریشان ہوتے ہو؟ میں سمجھتا ہوں وہی مائنڈ سیٹ آج بھی موجود ہے۔ بلوچ کا کلچر ان کے لیے گدھے اور خچر کا کلچر ہے۔ اس کو بچانے کی انہیں فکر نہیں ہے، انہیں بلوچوں کی حالت سے کوئی فرق نہیں پڑتا، انہیں صرف یہاں کے وسائل سے مطلب ہے۔ لیکن جس

طرح سے وہ سوچ رہے ہیں یہ وسائل اس طرح انہیں نہیں ملیں گے۔ کیونکہ جب ایک مرتبہ جنگ شروع ہوتی ہے یا گھر جلنا شروع ہوتے ہیں تو اس کی آگ بہت پھیلتی ہے۔ مشرقی پاکستان سے آپ نے سبق حاصل نہیں کیا۔ ہندوستان کی تقسیم سے آپ نے سبق حاصل نہیں کیا اب بھی آپ سبق حاصل نہیں کریں گے؟ اگر بلوچ مرتے رہیں گے تو پاکستان بھی سیاسی استحکام کو ترستا رہے گا۔

## فاروق سرور

ایڈووکیٹ، کالم نگار

میں چونکہ لٹریچر سے تعلق رکھتا ہوں اس لیے اگر میں اپنی علامتوں کی زبان میں بات کروں تو امید ہے آپ لوگ برا نہیں منائیں گے۔ اور ہمارے جتنے بھی ساتھی ادھر آئیں گے ان کے دانشورانہ معیار میں بہتری آئے گی، کمی نہیں ہوگی۔

میں جب میٹرک کے بعد کالج میں آیا تو مجھے رنگوں کا علم ہوا۔ ایک رنگ تھا جس کا سب ذکر کرتے تھے میں جب پڑھتا تو مجھے وہ رنگ دکھتا، جب سوتا تو وہی رنگ سامنے ہوتا جب جاگتا تھا تو بھی وہی رنگ نگاہوں میں ہوتا۔ ہمارے جلسے ہوتے تھے تو اس میں بھی اسی رنگ کی بات ہوتی تھی۔ اسی رنگ کی وجہ سے ہم نے نور محمد ترہ کئی کو پڑھا۔ اسی رنگ کی وجہ سے ہم نے گورکی اور سارتر کو پڑھا۔ اسی رنگ نے ہم سے رشین لٹریچر کو متعارف کروایا۔ وہ رنگ سرخ رنگ تھا میرے خوابوں کا رنگ۔

اب اگر کہیں میں خواب دیکھتا ہوں تو مجھے وہ رنگ تو نظر نہیں آتا، مجھے سفید دھبے نظر آتے ہیں۔ میں جب ان دھبوں کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں تو کبھی وہ بادلوں کی صورت میں اڑ رہے ہوتے ہیں سفید دھبے۔ لیکن جب میں آنکھیں کھولتا ہوں تو وہ سرخ رنگ جس کے میں خواب دیکھا کرتا تھا اس کی بجائے بلوچی اور براہوی لٹریچر میں، سندھی، پشتو لٹریچر میں، فارسی اور سرائیکی میں سیاہ رنگ نظر آتا ہے۔ اس سیاہ رنگ کو دیکھ کر میں چیخنے

لگتا ہوں کیونکہ اس رنگ میں اندھیرا ہوتا ہے۔ اس اندھیرے میں بلائیں ہوتی ہیں وہ مجھے ڈراتی ہیں میرے خوابوں کو Nightmares میں بدل دیتی ہیں۔

سو اب اس وقت میں سیاہ رنگ کی دنیا میں رہ رہا ہوں۔ لیکن اکثر اوقات مجھے سفید رنگ بھی اپنے دھبوں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے کبھی کبھار میں اپنے خواب میں ایک عجیب سی کوشش کرتا ہوں خواب میں شعوری کوشش کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ اب وہ سفید بادل سفید فاختاؤں کی شکل میں اڑ رہے ہیں اور جب میں جاگتا ہوں تو میری زبان پہ یہ دعا ہوتی ہے کہ خدایا ان دور اڑتی فاختاؤں کو ہمارے گھر کی منڈیر پر اتار دے۔

## امان اللہ شادیزئی

دانشور، صحافی سابق صدر کوئٹہ یونین آف جرنلسٹ

میں مختصر بات کروں گا کہ بلوچستان کو پنجاب سے کیا مسئلہ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو حقوق پنجاب کے لوگوں کے ہیں وہی بلوچستان کے لوگوں کو دیے جائیں تو بلوچستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ چھوٹے صوبوں کو سوال اٹھانا چاہیے کہ اگر مشرقی پاکستان کی اکثریت کو پنجاب نے تسلیم نہیں کیا تھا تو آج وہ اپنی اکثریت کیسے منوا سکتا ہے۔ ورنہ پنجاب کی ۱۲ کروڑ کی آبادی کے سامنے ان سے کہیں کم بلوچ یا پشتون کی بات کی پارلیمانی نظام میں کیا اہمیت ہے۔ پنجاب نے بنگال کی آبادی کو نہیں مانا تو آج وہ اپنی آبادی کو ہم پر کیوں مسلط کرتا ہے۔ یوں جب تک آپ حقیقی مسئلے کی طرف نہیں جائیں گے تو مسائل حل نہیں ہوں گے۔

واضح رہنا چاہیے کہ موجودہ پارلیمانی نظام میں بلوچستان قیامت تک اپنے حقوق حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر پارلیمانی نظام ہی رہنا ہے تو پنجاب کو تقسیم ہونا چاہیے کم از کم دو صوبے بننے چاہیں۔ دوسری جانب فاٹا کو صوبہ بننا چاہیے تاکہ سینیٹ کے اندر پاور ہو اور توازن برقرار ہو سکے۔ ورنہ سی پیک نہیں پچاس دوسرے منصوبے بھی آجائیں توازن پیدا نہ ہو گا۔ دوسری جانب سینیٹ کو طاقتور کریں۔ سینیٹ کے ارکان کو مکمل اختیارات ہوں۔ اس سے

ہماری آنے والی نسلیں احسان مند ہوں گی اور آنے والے دنوں میں مشکلات کا شکار نہیں ہوں گی۔ میں سمجھتا ہوں قوم پرست سیاست اس بنیاد پر کرنی چاہیے کہ بلوچستان کے اصل حقوق کی بات ہو سکے۔ ورنہ ہم اپنے حقوق کبھی بھی حاصل نہیں کر سکیں گے۔

۲۰۱۱ء میں، میں بلوچستان اسمبلی کے بجٹ سیشن میں موجود تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ ہزاروں کی تعداد میں اساتذہ کی اور دیگر اسامیاں خالی پڑی ہوئی ہیں۔ کل ملا کر صوبے اور مرکز میں کم از کم چالیس ہزار ملازمتیں ۱۲-۲۰۱۱ء میں بلوچستان کی خالی تھیں۔ وزیر اعلیٰ عبدالمالک میرا دوست بھی تھا اور شاگرد بھی، لیکن اس کے دور میں بھی پچیس ہزار ملازمتیں بلوچستان میں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ ایسے میں بلوچ نوجوان ہوں یا پشتون، پہاڑوں پر نہیں جائیں گے تو کہاں جائیں گے۔ ڈاکے نہیں ماریں گے تو کیا کریں گے۔ ایک ایم اے پاس نوجوان جب ڈگری لے کر پھرے گا اور اس کو نوکری نہیں ملے گی تو اس کے پاس کیا امکانات رہ جائیں گے۔ دوسری جانب وہ نوجوان اپنے گھر کو دیکھتا ہے جہاں اس کی جوان بہن موجود ہے لیکن اس کی شادی نہیں ہو سکتی، اس کی ماں موجود ہے لیکن وہ گھر کی کفالت نہیں کر سکتا۔ تقریباً ۱۱ لاکھ کے قریب نوجوان بلوچستان میں بے روزگار ہیں۔ پنجاب میں بھی بے روزگاری ہے لیکن وہاں ۱۲ کروڑ کی آبادی میں ساڑھے آٹھ لاکھ بے روزگار ہیں۔ یہ فرق کیوں؟ اس لیے کہ بلوچستان کے جو حقوق مرکز کے پاس تھے ان کو لینے والا کوئی نہیں تھا۔ حیرت ہے کہ صوبہ سرحد کے صرف ۵۰ ہزار نوجوان بے روزگار ہیں اور ہمارے ایک کروڑ کے اندر گیارہ لاکھ بے روزگار۔ وزارت خارجہ میں ۴۵۰۰ ملازمتیں ہیں۔ بلوچستان کوٹے سے ۳۵۰ ابھی تک خالی پڑی ہیں۔ میں نے صدر پاکستان سے ایک سوال کیا کہ ۴۵۰۰ ملازمتیں ہیں وزارت خارجہ میں اور آپ ایک بلوچ چپڑاسی بتائیں۔ جواباً انہوں نے کہا یہ کیا سوال ہے، تو میں نے کہا یہی تو سوال ہے۔ ایک بلوچ چپڑاسی اگر فرانس میں لگے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا خاندان خوشحال ہو جائے گا۔ ۶۵ سفارت خانوں میں ایک چپڑاسی بھی بلوچ نہیں ہے۔ نیشنل آرمی کی بات کریں، میں نے ایک بار بات کی کہ چھ لاکھ کی فوج کے اندر صرف ایک قادر بلوچ جرنیل بنا ہے۔ اگر آپ ۷ فیصد بھی لے لیں تو کم از کم پچاس ہزار کے قریب

ہمارے بلوچ ہوں گے۔ اس میں افسروں میں بھی ہمارے لوگ آئیں گے اور جرنیلوں میں کم از کم ۸/۱۰ تو ہمارے ہوں گے۔

نواب رئیسانی کے دور میں ہر ایم پی اے کو ایک ارب ۳۵ کروڑ روپیہ ملا ہے۔ اگر حقیقت میں یہ رقم اپنے اپنے علاقوں میں خرچ ہوتی تو بہت سی چیزیں بہتر ہو جاتیں۔ بالخصوص جبکہ ہماری آبادی کم تھی اور یہ وسائل بہت ہیں۔ در حقیقت ہمیں سب نے ہی لوٹا ہے، جس کو موقع ملا اس نے اپنے ہی مفادات کو ترجیح دی۔ اس میں بلوچ اور پشتون ایم پی ایز دونوں ہی شامل ہیں۔

کرپشن کی بات کی جائے تو ذاتی مشاہدہ ہے کہ جو بھی اسمبلی سے نکلا خوشحال نکلا۔ میرے سامنے ایک صاحب ، نام نہیں لینا چاہتا، ۲۰۰۸ء میں رکشے سے اترتا تھا۔ اب اسلام آباد میں کروڑپتی ہے۔ کوئی احتساب نہیں نہ کوئی پوچھنے والا ہے۔ کچھ لوگ قوم پرستی کے نام پہ لوٹ رہے ہیں، کچھ اسلام کے نام پر اور کچھ بائیں بازو اور سیکولرازم کے نام پر لوٹ رہے ہیں۔ ہر وہ فلسفہ جو کام کا تھا اس کے نام پر بلوچستان کو لوٹا جا رہا ہے۔

دوسری جانب افغانستان اور ایران ہمارے ہمسائے ہیں۔ ان کے ساتھ بہتر تعلقات کا بلوچستان کو براہ راست فائدہ ہے۔ لیکن ہم تعلقات آگے بڑھانے کے مواقع ضائع کرتے ہیں۔ آپ نے ایران کے ساتھ کیا کیا؟ ایران سے گیس کا معاہدہ ہے، اس کے باوجود نواز شریف نے کہیں زیادہ مہنگا ایل این جی کا معاہدہ کر لیا۔ پتہ نہیں ہم کس کس کو خوش کرنا چاہتے ہیں اور اپنا خانہ خراب کرتے ہیں۔

آخر میں ایک بار پھر دہرانا چاہتا ہوں کہ موجودہ پارلیمانی نظام میں آپ آخر تک حقوق حاصل نہیں کر سکتے۔ اس نظام کے تحت قومی اسمبلی میں بلوچستان کے چند MNAs ہیں جس میں اکبر بگٹی جیسے لوگ بھی شامل رہے ہیں کوئی بڑا فیصلہ نہیں کرا سکتے۔ اس نظام کو ختم کریں سینیٹ کو پاور فل بنائیں اور پنجاب کو کم از کم دو صوبوں میں تقسیم کریں۔ باقی بھی

جو صوبے تقسیم ہو سکتے ہیں ان کو تقسیم کریں۔ میرے خیال میں اس کے نتیجہ میں مسائل کا حل ممکن ہو سکے گا۔

## سلیم شاہد

بیورو چیف، روزنامہ ڈان

بلوچستان کے حوالے سے سول سوسائٹی، میڈیا اور دانشور جب اظہار خیال کرتے ہیں تو پہاڑوں پر جانے والوں کے بارے میں ایک ہی بات کہی جاتی ہے کہ یہ حکومت پاکستان اور پاکستان کے خلاف لڑنے کی بات کرتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی یہ سوچا کہ اپنے گھر بار، محلے گلیاں سب چھوڑ کر وہ ان پہاڑوں اور غاروں میں جہاں پانی بھی نہیں ہے کیوں چلے گئے۔ پہاڑوں پر جانے والے یہ سارے لوگ، چاہے نواب اکبر بگٹی ہوں یا خیر بخش مری ہوں، حیر بیار مری اور بالاچ مری ہوں، اسی پاکستان میں، اسی بلوچستان میں، اور اسی سسٹم میں رہتے تھے۔ ان میں سے کئی قومی و صوبائی اسمبلی کے ممبر بھی رہے اور وزیر بھی۔ یہ سب در حقیقت حکومتوں میں رہے ہیں۔ تو کیا وجہ ہوئی کہ وہ اس نظام کا حصہ رہنے کے بجائے غاروں میں چلے گئے؟

ماضی میں بھی کہتے ہیں کہ لوگوں کو پہاڑوں سے واپس لانے اور حیدرآباد سازش کیس ختم کرنے کے بعد بلوچستان میں بڑا سکون تھا لیکن اس دوران حکومت نے بلوچستان میں جس طرح کرپشن کو فروغ دیا وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ہر رکن صوبائی اسمبلی (MPAs) کو ترقیاتی پروگرام کے نام پر اسّی اسّی لاکھ روپے دیے گئے۔ فطری طور پر ان MPAs نے خیال کیا کہ یہ تو بہت اچھا سودا ہے ہم الیکشن لڑیں گے، ترقیاتی پروگرام کے نام پر اسّی پچاسی لاکھ لیں گے اور پھر حکومت بھی کریں گے۔ اس طرح ایک طبقے کو تو بہت کچھ دے دیا گیا لیکن باقی بلوچستان اور یہاں کے لوگوں کے لیے کیا کیا گیا؟ اب اگر یہ باقی لوگ اپنے لیے پانی یا کوئی اور سہولت مانگتے ہیں تو سوال کیا جاتا ہے کہ آپ نے آواز کیوں اٹھائی۔ ایوب خان سے لے کر جنرل مشرف تک جو بھی ڈکٹیٹر آیا اس نے اپنے آپ کو دوام دینے کے لیے انتخابات

کروائے۔ کیونکہ ان کے پاس اپنی کوئی پولیٹیکل بنیاد نہیں تھی۔ ایسا کوئی سیاسی پلیٹ فارم نہیں تھا جہاں سے وہ اپنے آپ کو Recognize کرواتے۔ غیر جماعتی الیکشن کروانے کے بعد انہوں نے ایک پارٹی کو جسے ہم سمجھتے ہیں کہ غیر قانونی پارٹی ہے اسے لاکر ہم پر مسلط کر دیا۔ راتوں رات لاکر کہا کہ یہ ہے اکثریتی پارٹی مسلم لیگ۔ اس نظام میں اپنی تائید کو برقرار رکھنے کے لیے ارکان اسمبلی کو نوازا گیا۔ درحقیقت ایوب خان کے زمانے سے لے کر مشرف تک بلکہ آج بھی جو کچھ ہو رہا ہے وہ ناانصافیوں پر مبنی ہے۔ مگر اس کے خلاف اٹھنے والی آوازوں کو کوئی سننے والا نہیں تھا۔

جب لوگوں کا بس نہیں چلا تو کوئی راستہ تو انہوں نے چننا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ہمیں پارلیمنٹ کے ذریعے اپنا حق لینا چاہئے، کچھ دوسرے لوگ دوسرے ذرائع سے آواز اٹھانے پر زور دیتے ہیں۔ اسی تسلسل میں کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہمیں بندوق کے ذریعے اپنا حق لینا چاہئے۔ ہمیں سوچنا ہے کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ مجھے سخت شکایت ہے اس ملک کے دانشوروں سے کہ انہوں نے آواز کیوں نہیں اٹھائی۔ بعض احباب یہاں بھی موجود ہیں جب وہ اعلیٰ عہدوں پر براجمان تھے تب انہیں کوئی خیال نہیں آیا۔ آج ریٹائرمنٹ کے بعد وہ ہر جگہ بولتے ہیں اور انہیں سنا جاتا ہے۔ درحقیقت سیاسی لوگوں کو سنا جاتا تو آج یہ صورت حال پیدا نہ ہوتی۔ رائے عامہ کے آج جو سروے آتے ہیں ان کے مطابق سب سے زیادہ جس پاپولر جماعت کا نام لیا جاتا ہے وہ میرے خیال کے مطابق تو سب سے کم پاپولر جماعت ہے۔ معلوم نہیں وہ کیسے سروے ہوتے ہیں لیکن بہت سے فیصلے پھر ان سرویز کے مطابق کیے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے سرویز میں سول سوسائٹی کا بھی ایک کردار ہوتا ہے جس کے اپنے اہداف اور ایجنڈے ہیں۔ سول سوسائٹی سے وابستہ این جی اوز مخصوص ایشوز اٹھاتی ہیں لیکن ہمارے معاملہ میں سول سوسائٹی بھی غائب ہے۔ اگر سول سوسائٹی اپنا حقیقی کردار ادا کرتی تو یہ حالات نہ ہوتے۔ اگر اس ملک کا دانشور میرے اور آپ کے دکھ پر اٹھتا اور لکھتا تو آج بلوچستان شکوہ نہ کر رہا ہوتا۔

پنجاب اور اسلام آباد کی زیادتی کی بات کی جاتی ہے۔ میں اسلام آباد کی بات کرتا

ہوں پنجاب کی نہیں، پنجاب تو ایک صوبہ ہے اور جس طرح بلوچ یا پٹھان ایک قوم ہیں پنجابی بھی ایک قومیت ہے۔ اسلام آباد کا مائنڈ سیٹ اصل مسئلہ ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ سوچتا ہے اسی پر عمل درآمد ہوتا ہے۔ وہ دانشور بلاتے ہیں جو یہاں مخصوص مقامات پر ٹھہرتے اور مخصوص لوگوں سے ملتے ہیں۔ چنانچہ وہی کچھ دیکھتے سنتے ہیں جو مخصوص لوگ دکھانا اور سنانا چاہتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں فیصلہ سازی کے ذمہ دار اگر کبھی خود بھی آجایا کریں اور یہاں کے لوگوں سے ملیں تو انہیں صورت حال کا درست طور پر اندازہ ہو گا۔

آپ نے سی پیک کی بات کی مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں سی پیک کی کیا بات کروں۔ کیا سی پیک میرا ہے؟ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ اس کا مغربی روٹ کب شروع ہو گا۔ ملک کا وزیراعظم چند بڑے بڑے لیڈروں کو ساتھ لے کر جاتا ہے اور اعلان کر دیتا ہے کہ ہم مغربی روٹ کا افتتاح کر رہے ہیں جبکہ وہ ایشین ڈویلپمنٹ بینک کا پہلے کا ایک پروجیکٹ تھا۔ لیکن ہمیں تو ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم کہ اس سے بلوچستان کو کیا فائدے ہوں گے یہ ہمیں کسی نے نہیں بتایا۔ حکومتی ذمہ دار آتے ہیں اور ہر جگہ ایک سٹیریوٹائپ بیان دیتے ہیں۔ جب ان سے دریافت کیا جائے کہ بلوچستان کے کون سے منصوبے ہیں تو جواب میں گڈانی پاور پارک منصوبے کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ اور اب تو اسے بھی ختم کر دیا گیا ہے۔ سو میرا تو سی پیک میں یہی حصہ ہے کہ میں چائے کی کوئی دکان کھول لوں یا سڑک کے کنارے پنکچر کی دکان بنالوں یا کوئی ہوٹل شروع کر لوں یا شاید ایک دو پٹرول پمپ شروع ہو جائیں گے۔ کیا یہ کوئی قابل ذکر فائدہ ہے؟ مجھے اس بارے میں معلوم ہونا چاہیے کہ میرے حصے میں کیا ہے اور میرے لوگوں کو کیا ملے گا۔ اگر یہ نہیں ہو گا تو میں تو اپنے مستقبل کے لیے کوئی لائحہ عمل تیار نہیں کر سکتا۔ میں تو تب ہی رائے دوں گا جب اس منصوبے کے بارے میں کچھ جانتا ہوں گا۔ مجھے یہ لگتا ہے کہ اس میں سب کچھ طے ہے، کس کے حصے میں کیا ہے اور جیسے بچوں کو گود لیا جاتا ہے اسی طرح ہماری مختلف چیزوں کو گود لیا جا رہا ہے۔

صورت حال عملاً ایسی ہے جیسے انگریز برصغیر میں اپنے مفادات اور ترجیحات کے

مطابق کچھ علاقوں میں دنیا کا جدید ترین سسٹم لے آیا تھا۔ پنجاب میں اس کا مفاد آبپاشی کے نظام میں تھا وہ وہاں لے آیا، سندھ میں بھی ایسا ہی ہوا۔ بلوچستان میں اس کی ترجیح وہ نہیں تھی۔ اگر فارورڈ پالیسی نہ ہوتی تو یہ ریلوے لائن بھی نہ آتی۔ اور یہ جو راستے ہیں ہم ان سے بھی محروم ہوتے۔ یہی پالیسی اب بھی اپنائی گئی ہے۔

آپ دیکھیں یہ غور کرنے کی باتیں ہیں کہ میرانی ڈیم ۱۹۵۰ کے عشرے میں پروپوز ہوا اور کب بنا؟ گوادر پورٹ پر کام کا تصور اور خاکہ کئی دہائیوں قبل سے موجود تھا۔ اس کے لیے فیزیبلٹی رپورٹ بھی بنی تھی۔ تاہم اس پر کام کا آغاز اب جا کر اس طرح ہوا ہے کہ مجھ سے کوئی نہیں پوچھتا کہ میری ضرورت کیا ہے۔ یہ منگی ڈیم پر کام کا افتتاح ہوا ہے اس کی فیزیبلٹی رپورٹ ۱۹۶۳-۱۹۶۲ء کی ہے اور اب جا کر گراونڈ بریکنگ کی تقریب ہوئی ہے۔ گھر میرا ہے لیکن میرے گھر میں کہاں کس کمرے کی ضرورت ہے، اس پر میری رائے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آخر ایسے میں سی پیک کی اونرشپ میں کیسے لوں؟ گوادر بنا لیکن نہ مجھے پانی ملا اور نہ ہی دوسرے بنیادی مسائل حل ہوئے۔ گوادر ایک پورٹ ہے جو سمندر کا حصہ ہے اسے ایک سڑک سے لنک کر دیا گیا ہے اور اب اسے سی پیک سے جوڑ دیں گے۔ اب جب یہ سب کچھ چین کے لیے ہے تو وہاں گوادر میں پائپ لائن ڈالنے کے لیے بھی چین سے لوگ لائیں گے؟، جو وہاں بیٹھا ہوا ہے اسے آپ شامل ہی نہ کریں۔ کام چین کی کمپنی کو ہی دیں لیکن یہاں کسی مقامی مزدور اور ٹھیکیدار کو کام بھی نہ ملے۔

[اسلم بھوتانی: صورت حال یہ ہے کہ چینی کمپنی کے ایک سوپیر کے لیے بھی ہمارے چار جوان پہرا دیتے ہیں۔ یعنی جوان کھڑا ہے اور چینی مزدور کام کر رہا ہے۔]

یہ سب ہمارے احساسات ہیں اگر آپ انہیں رپورٹ کر سکتے ہیں تو ضرور کریں یہ بہت دل سے ہم نے یہ باتیں کی ہیں۔ آخر میں اس شعر کے ساتھ کہ ؎

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

**صابرہ اسلام**
ایڈووکیٹ نیشنل پارٹی

میں اپنے سینئر دانشوروں کو سننے آئی تھی آخر میں موقع ملا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

اوڑھے ہوئے ہیں کب سے ردائے سراب ہم
ذرّوں میں دیکھتے ہیں ستاروں کے خواب ہم

بلوچستان کے عوام کو بھی کچھ اسی طرح سراب کے خواب دکھائے جاتے ہیں۔ بطور وکیل لوگوں کے دکھ درد قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ دوسری جانب یوں بھی زمینی حالات سے بخوبی واقف ہوں کہ میں خود ایک سیاسی کارکن بھی ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے ہم نے سبی، مچھ، ڈھاڈر، کچھی، جعفر آباد، نصیر آباد اور صحبت پور جیسے علاقوں کا سفر کیا اور کئی روز لوگوں کے ساتھ رہے۔ کوئٹہ سے چلتے ہوئے میرے ذہن میں تھا کہ میں ان علاقوں میں جا کر عورتوں کے حقوق پر بات کروں گی۔ تاہم وہاں جا کر مجھے احساس ہوا کہ وہاں تو ابھی تک بنیادی انسانی ضروریات بھی نہیں پہنچیں، پینے کا صاف پانی نہیں، چنانچہ وہ لوگ گدلا پانی پیتے ہیں جس کے باعث بہت سی بیماریاں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہماری ایک ساتھی ان بیماریوں کا شکار ہو کر فوت ہو گئی۔

جب خواتین سے ملی تو میرے ذہن میں یہ تھا کہ میں ڈومیسٹک وائلنس پر بات کروں گی۔ میں نے سوال پوچھا کہ کیا شوہر مارتے پیٹتے ہیں؟ جواب ملا: ”ہمیں کوئی نہیں مارتا ہمیں تو غربت نے مارا ہوا ہے“۔ جب آپ کے پاس پینے کا صاف پانی نہیں، بچیوں کے سکول، ہسپتالوں میں بنیادی آلات تک میسر نہیں۔ زچگی کا کوئی پیچیدہ کیس آجائے تو مریض کو کوئٹہ یا جیکب آباد ریفر کیا جاتا ہے اور اکثر وہ راستے میں ہی دم توڑ جاتی ہیں۔ تو ایسے میں سی پیک، سینڈک اور ریکوڈک کے اثرات ان تک کیسے پہنچیں گے۔

معدنیات اور قدرتی وسائل کے معاملے میں بلوچستان مالا مال ہے لیکن ساتھ ہی ۱۹۸۵ء سے کوئٹہ میں جو گیس پائپ لائن بچھی ہوئی ہے وہ ویسی کی ویسی ہی ہے۔ سردی کا آغاز

ہوتے ہی مین شہر کوئٹہ، زیارت، قلات سمیت دیگر علاقوں میں گیس پریشر نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔ منفی دس درجہ حرارت پر ہم ٹھٹھرتے ہیں۔ ہمیں اس گیس کا کیا فائدہ۔ گیس ہی کی طرح ریکوڈک کا ہونا نہ ہونا ہمارے لیے ایک سا ہے۔ گیس بلوچستان سے نکلتی ہے وہاں سے شکارپور جاتی ہے، پھر ڈسٹری بیوٹ ہو کر ہمیں ملتی ہے۔ عدالتوں میں جائیں تو وہاں کیس نہیں چلتے۔ گیس پریشر کا ہمارا کیس یہاں کورٹ میں کب سے التواء میں پڑا ہے۔

گوادر کے حوالے سے سنا تھا کہ بڑی بڑی عمارتیں بنیں گی، اور بڑی ترقی ہو گی۔ وہاں جا کر گوادر میں ایک ماہی گیر سے کہا کہ اب تو تم بہت امیر ہو جاؤ گے تو کہنے لگا کہ ہمارا کھانا پینا مچھلی ہے، ہم صبح فجر کے وقت جاتے ہیں جال ڈالتے ہیں، یہی مچھلی ہمارا تین وقت کا کھانا ہے۔ یہ ترقی ہو گی تو یہ ساحل مجھ سے دور ہو جائے گا۔ کیونکہ اس کے نتیجے میں کارڈ جاری ہوں گے اور کارڈ دکھا کر ہی ہم اپنے ساحل سے مل سکیں گے۔ یہ نام نہاد ترقی بلوچستان کی عوام کے لیے نہیں ہے۔ یہاں کے عوام کو صرف خواب دکھائے جاتے ہیں۔ سینڈک میں ہمارا حصہ دو فیصد ہے۔ سوئی گیس سے ملک کے کارخانے چلے مگر ہمیں گھریلو استعمال کو بھی نہیں ملتی۔ اسی طرح سی پیک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ بڑا ترقیاتی منصوبہ ہے بلوچستان کا ۶۰ فیصد حصہ اس میں ہے لیکن ملے گا ہمیں وہی ۵ فیصد۔ بدقسمتی سے ہماری سیاسی پارٹیاں صرف بلیم گیم کھیل رہی ہیں جس کو جب چانس ملا اس نے اپنے حساب سے کام کیا۔ چاغی کے علاقے کے آس پاس لوگوں میں جلدی امراض پائے جاتے ہیں۔ ہماری زمین ایٹمی دھماکے کے لیے تو استعمال ہوئی لیکن اس کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے لوگوں کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔ اس کے کیمیکل اثرات آج تک ہمارے بچوں کو متاثر کر رہے ہیں۔

تسلیم کرنا چاہیے کہ قوم پرست اگر اپنے حقوق کے لیے بولتے ہیں تو اس لیے کہ انہیں ان کے حقوق نہیں ملتے۔ اگر کوئی کام کرنے کے لیے آیا تو اسے بھی فری ہینڈ نہیں دیا گیا۔ ڈاکٹر عبدالمالک بلوچ بھی ڈھائی سال کے مختصر عرصے کے لیے آئے اور ان کے اپنے الفاظ ہیں کہ انہوں نے اپنے سیاسی کیریئر کو داو پر لگاتے ہوئے اپنی عوام کے لیے یہ زہر

[وزارت اعلیٰ] کا گھونٹ پیا۔ کیونکہ ۷۰ سال سے حکمران اسٹیبلشمنٹ کے سامنے کھڑا ہونا بہت مشکل ہے۔ اس وقت ہمارے دانشوروں اور سیاستدانوں کو بولنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ساتھ جو زیادتی ہو رہی ہے اور جس طرح اپنے حق سے ہمیں محروم کیا جارہا ہے اس کے لیے بولنا چاہیے۔ ہماری زمین پر آکر ہمارے اثاثے لوٹے جائیں اور پھر کہا جائے کہ ہم بات بھی نہ کریں۔ اپنے حقوق کے لیے بات کرنا کوئی جرم نہیں ہے، یہ کسی قانون میں نہیں لکھا، پاکستان کے دستور میں بھی یہ نہیں لکھا۔ درحقیقت ہمیں فریڈم آف سپیچ حاصل نہیں ہے ہم ایک دوسرے کے سامنے چھپ چھپ کر تو بات کرتے ہیں لیکن کھل کر بات نہیں کر سکتے۔

سی پیک یا اس طرح کا کوئی اور بھی منصوبہ یا معاہدہ ہو جب تک اس میں بلوچستان کی ترقی کو شامل نہیں کیا جائے گا ہمیں اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب کوئی معاہدہ کیا جاتا ہے تو اسے چھپایا کیوں جاتا ہے، سامنے کیوں نہیں لایا جاتا۔ آخر آپ نے چین کے ساتھ گوادر کے حوالہ سے جو معاہدہ کیا ہے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ آپ نے گوادر کو بیچا ہے یا ویسے ہی دے دیا ہے۔ معاہدہ سامنے تو لائیں۔ ہمیں پتہ ہونا چاہیے۔ اس پر بحث اور پھر قانون سازی ہونی چاہیے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ پروجیکٹس کے لیے ملازمتوں کا اعلان کیا جاتا ہے تو تمام اچھی پوسٹس پنجاب کے لیے ہوتی ہیں اور چوکیدار خاکروب کی بلوچستان کے لیے۔ ہماری طرف سے اسے چیلنج کیا گیا تو پھر اگلی ایڈورٹائزمنٹ میں اوپن میرٹ کر دیا گیا۔ اگر اوپن بھی کرتے ہو تو بلوچستان کے لوگوں اور ان کے بچوں کے لیے کرو۔

جب تک وفاق کا رویہ انصاف پر مبنی اور سلوک برابری کی بنیاد پر نہیں ہوتا بات نہیں بنے گی۔ بلوچ سے اگر آپ اس کی سرزمین اور اس کے حقوق چھینتے ہو تو وہ بولتا ہے، اس پر اگر یہ کہا جائے کہ وہ محبِ وطن نہیں تو یہ کیسا انصاف ہے۔ اس نے اپنی مٹی کو دیکھنا ہے جس میں وہ پیدا ہوا ہے۔ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔ اسے پسماندہ رکھنے کی وفاق کی پالیسی انصاف اور انسان دوستی پر مبنی نہیں ہے۔ آپ کی اندرون ملک کی پالیسی ہو یا خارجہ پالیسی، سب مفادات پر مبنی ہے، آپ کے رشتے انسان دوستی پر نہیں مفادات پر مبنی ہیں۔ درحقیقت جبر اور نفرتوں کی

بنیاد پر کہیں حکومت نہیں کی جاسکتی۔ میرا خیال یہ ہے کہ بلوچ قوم اور عوام کو اس کے وسائل اور ساحل پر اختیار ہونا چاہیے، اسے ترقی کے ہر منصوبے اور معاہدے میں شامل ہونا چاہیے۔

## ڈاکٹر عبدالحئ بلوچ

سابق صدر نیشنل پارٹی، سابق رکن قومی اسمبلی و سینیٹ

سب سے پہلے تو میں شکریہ ادا کرتا ہوں آئی پی ایس کا اور خالد رحمٰن صاحب کا۔ اس کے ساتھ اپنے تمام ساتھی شرکاء، دانشوروں کا بھی شکر گزار ہوں۔ کافی اچھا بحث و مباحثہ ہوا۔ ایسے سیمینار ہونے چاہئیں۔ مگر جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ کہ جس نظام کے تحت ہم چل رہے ہیں ہم اس کو سمجھیں۔ اس کے بغیر ہم کوئی نتیجہ خیز مقصد حاصل نہیں کر سکیں گے۔

پاکستان ایک کثیر القومی ریاست ہے مگر اس کے باوجود یہاں کا نظام ظلم و جبر اور حاکم اور محکوم کا نظام ہے اور جہاں محکومیت اور غلامی ہو وہاں محکوم قوم کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا۔ دنیا میں بدترین چیز یہ ہے کہ کوئی قوم غلام ہو۔ بلوچ ۷۰ سال سے اپنے حقوق سے محروم ہیں اور اب نہ صرف ان کے حقوق ان کو نہیں مل رہے بلکہ ان کی شناخت و ثقافت کو بھی خطرات لاحق ہیں۔ اس وقت یہاں جو مختلف منصوبے جاری ہیں یہ سب پنجاب اور کراچی کے سرمایہ داروں کے ہیں۔ ان قبضہ گیری کی پالیسیوں سے بلوچستان کو کچھ نہ ملے گا۔ اس کے برعکس بلوچوں سے ان کی تاریخ، ثقافت کلچر سب چھینا جارہا ہے۔ ہم سے گیس لے گئے، بندرگاہ لے جارہے ہیں اور ان کو بلوچ سرزمین و وسائل درکار ہیں۔ اور اب ریاست اس قدر بربریت پر تلی ہوئی ہے کہ اس سرزمین پر بلوچ بھی نہ ہو۔ ایسے میں جدوجہد کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔

جو کچھ ابھی ہورہا ہے یہ پانچویں بار ہورہا ہے۔ ۱۹۴۸، ۱۹۵۸، ۱۹۶۲، ۱۹۷۳ء اور ۰۶-۲۰۰۵ء میں طاقت کا استعمال ہوا اور ابھی بھی ہورہا ہے۔ آپ اسے مزاحمت یا بغاوت جو بھی کہیں اس کا سلسلہ اب ۷۰ سال سے جاری ہے۔ آخر کب تک ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

دوسری جانب حکمران، اسٹیبلشمنٹ، جاگیر دار، بیوروکریٹس اور موقع پرست ہیں۔ ان کے درمیان دولت کی ایک ریس ہے۔ اخلاقیات کہیں نظر نہیں آتی، ایک گیم ہے جس میں ان میں سے ہر ایک ہر حال میں اپنے مفادات کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ایک محکوم پولیٹی (Polity) بنایا گیا ہے ایسے میں یہاں سیاسی، معاشی، ثقافتی بحران تو ہو گا۔ آپ چاہتے ہیں کہ ایک محکوم قوم اپنی زمین، اپنی حق حاکمیت اور اپنی ثقافت سے دستبردار ہو جائے۔ ظاہر ہے اس کے لیے کوئی تیار نہیں۔ کیا آپ طاقت کے ذریعے اس کا زور توڑ سکیں گے؟ وہ قوم جو اپنی سرزمین کے لیے سینہ سپر ہو جاتی ہے ان کو دنیا کی کوئی طاقت دبا نہیں سکتی۔ ہاں وہ قومیں ختم ہو جاتی ہیں جو دوسرے نظام کو قبول کر لیتی ہیں اور اپنا سر جھکا کر بیٹھ جاتی ہیں۔ جو مزاحمت کرتی ہیں اپنا آپ بچا لیتی ہیں۔

دوسری جانب حکمرانوں کا بھی ایک مائنڈ سیٹ ہے کہ جو مزاحمت کرے گا اسے کچل دو، چاہے وہ قوم ہو، معاشرہ ہو یا کوئی اور طاقت۔ بلوچ اب اس بربریت اور ظلم کے عادی ہو چکے ہیں۔ بلوچوں میں سے کوئی نہیں بچا۔ ڈاکٹر، وکیل، پروفیسر اور انجینئر ہر طبقہ کے لوگ شہید ہوئے ہیں۔ دوسری طرف ہم کسی پالیسی میں شریک نہیں۔ ہمیں کچھ پتا ہی نہیں ہے کہ کیا ہو رہا ہے۔ ہمیں کچھ بھی نہیں سمجھا جاتا۔ آپ ہمیں نہ قوم سمجھتے ہیں نہ قبائل۔

پاکستان میں حقیقی جمہوریت ہونی چاہیے جس میں وفاق ہی سب کچھ نہ ہو۔ وفاق میں اکائیاں رضاکارانہ طور پر اپنے کچھ اختیارات وفاق کو دیتی ہیں لیکن یہاں کیا ہو رہا ہے؟ اب تو تمام جنگی طریقے استعمال کرنے کے بعد بلوچ قومی تحریک کو مذہبی شکل دینے کی کوشش کی گئی کہ یہ شیعہ سنی لڑائی ہے تاکہ عالمی سطح پر یہ تاثر دیا جاسکے کہ یہ بلوچ قوم پرستی کا مسئلہ نہیں، یہاں تو مذہبی بنیادوں پر سب کچھ ہو رہا ہے۔ گوادر میں اب کیا کچھ ہو رہا ہے؟ اپنی سرزمین پر جہاں ہم صدیوں سے رہ رہے ہیں آزادی سے چلنے پھرنے کا اختیار بھی نہیں رکھتے۔ آتے جاتے ہمیں پوچھا جاتا ہے کہ کون ہو؟ آپ کو صرف ہماری سرزمین چاہیے جو وسائل سے مالا مال ہے۔ پینے کو پانی نہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ ہماری ترقی اور خوشحالی ہے۔

ہمارے منہ کا نوالہ بھی ہم سے چھینا جا رہا ہے۔ اسی طرح سے لینڈ گرینبگ کا معاملہ ہے۔ اورماڑہ پورا کنٹونمنٹ ایریا ہے۔ اسی طرح سے گوادر سے لے کر لیاری تک کوسٹل ہائی وے کے ساتھ پورے ساحل کو لیں۔ مجھے آپ بتائیں کہ یہ ہماری ترقی ہو رہی ہے یا آبادکاروں کے لیے سارا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ ہمارے لوگ پہلے سے ڈسے ہوئے ہیں۔ پٹ فیڈر کینال جب آیا تو فیصل آباد سے بڑی تعداد میں لوگوں کو لایا گیا۔ ان کے نام پر لینڈ ریکارڈ بنایا گیا۔ بڑی مشکل سے اور بڑی مزاحمت کے بعد یہاں سے وہ لوگ گئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ آپ لوگوں کو ہماری زمین چاہیے۔ کیونکہ یہ وسائل سے مالا مال ہے اور اس کی جیوپولیٹیکل اہمیت ہے۔

اس دھرتی کے لوگ خوش قسمت ہیں کہ اللہ پاک نے انہیں سب کچھ دیا ہے اور یہ اس طرح بھی خوش قسمت ہیں کہ یہ اپنی دھرتی کے لیے لڑنا مرنا اور اس پر جان قربان کرنا چاہتے ہیں۔ اپنی جانوں کا نذرانہ دیتے ہوئے پروا نہیں کرتے۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ حکمرانوں کو سمجھنا چاہیے کہ جو طریقہ انہوں نے روا رکھا ہوا ہے اس سے انہیں کامیابی نہیں ملے گی۔ سی پیک کے حوالے سے یہ حقیقت جان لینی چاہیے کہ چینیوں کی پالیسیوں سے ساری دنیا بیزار ہے۔ ان کے اپنے ہمسائے ان سے بیزار ہیں۔ تائیوان، ویت نام، تھائی لینڈ کوئی بھی ان سے خوش نہیں ہے۔ Hegemony اور Dominance کی پالیسی کبھی کامیاب نہیں ہوتی۔ انہیں ہمیشہ مزاحمت ملتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو محکوم بلوچ اور پشتون ہیں یہ اپنی سرزمین کے لیے لڑ رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ایسا سمجھتے ہیں کہ سی پیک کے ذریعہ یہاں پنجابیوں کو آباد کیا جائے گا۔ ویسے بھی چینی جہاں بھی جاتے ہیں اپنے ہی لوگ ساتھ لے کر جاتے ہیں۔ یہ یہاں بھی اپنے لوگ ساتھ لائیں گے جیسے ابھی ذکر ہوا کہ گوادر پر کام کرنے والی کمپنیوں کے سوپر بھی چائنیز ہیں۔ تو کوئی قوم کس طرح اپنی بربادی کو دیکھے گی۔ ہم جدوجہد کرتے رہیں گے اور یہ بھی سمجھ لیں کہ ہم کوشش کرتے رہیں گے کہ دوسری محکوم قومیں بھی اس جدوجہد میں شامل ہوں۔

دوسری بات جو میں کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ بلوچستان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ یہ

ایک گیٹ وے ہے جس سے پوری دنیا کو راستہ جائے گا۔ اس لیے یہ ایک بہت بڑا مسئلہ ہے جو اس طرح سے حل نہیں ہو گا جیسے ہمارے حکمران سمجھ رہے ہیں۔ یہ کوئی آسان مسئلہ نہیں ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ سی پیک کا معاہدہ سیکرٹ ہے۔ کسی کو اس کی شرائط کا کچھ پتا نہیں ہے۔ یہ جو ۵۰ ارب ڈالر ہیں اس کا حساب کتاب کیا ہے؟ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ اگر یہ عوام کے مفاد کے لیے ہے تو اسے سیکرٹ رکھنے کا آخر کیا مطلب ہے؟

بد قسمتی یہ ہے کہ ہمارے سیاست دان جو ہمارے بڑے ہیں اور بڑی بڑی پارٹیاں ہیں، کوئی سٹینڈ لینے کے لیے تیار نہیں۔ خدا کے لیے کسی ایک چیز کے لیے تو کھڑے ہو جاؤ۔ قومی سوال کو چھوڑو، یہ جو جمہوریت ہے یہ تو آپ کے فائدے کے لیے ہے لیکن اس کے لیے بھی کھڑے نہیں ہوتے۔ سیاست کو کاروبار بنایا ہوا ہے۔ اس اسٹیٹس کو (Status quo) اور نظام کو بدلنا ہو گا۔ یہ ایک کمزور نظام ہے۔ اس میں ان قوتوں کا اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ گٹھ جوڑ ہے۔

آخر میں، میں یہ بات کروں گا کہ یہ جو مردم شماری کرائی جا رہی ہے اس پر بھی ہمارے تحفظات ہیں۔ آپریشن کی وجہ سے بلوچستان کی بہت سی آبادی اپنا گھر بار چھوڑ چکی ہے۔ اب خالی گھروں میں آپ کس کو شمار کرنا چاہتے ہیں اور کیسے کریں گے۔ دوسری جانب آپ افغان مہاجرین کو واپس بھیجیں یا کچھ ایسا طریقہ اختیار کریں کہ وہ صرف کیمپوں تک محدود رہیں۔ بد قسمتی سے اس پر بھی کچھ نہیں کیا جا رہا، کوشش کی جا رہی ہے کہ ہمیں دبا دیا جائے۔ ہم بھی انسان ہیں، مسلسل آپ کے ظلم اور آپ کی زیادتیاں سہہ رہے ہیں۔ اب آپ اپنے منصوبوں سے ہماری زمین پنجاب والوں کو بیچ رہے ہیں۔ گوادر ہمارا ہے، بلوچستان ہماری سرزمین اور ہماری ماں ہے، یہ ہماری اجتماعی ملکیت ہے۔ اس کو بیچنے کا اختیار ہم کسی کو نہیں دے سکتے۔

# اختتامی کلمات


## خالد رحمٰن

ایگزیکٹو پریزیڈنٹ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد


اس سیمینار کے حوالے سے ہماری یہ کوشش تھی کہ بلوچستان کے حالات، معاملات ومسائل سے متعلق غیر حکومتی نقطہ نظر کو سنا اور سمجھا جائے اور پالیسی سازی پر علمی و تحقیقی ادارہ کی حیثیت سے ان آوازوں کو پالیسی سازوں اور دلچسپی رکھنے والے دیگر افراد اور اداروں تک پہنچایا جاسکے۔ اس طرح ایک دوسرے کو سننے اور سمجھنے کا عمل آگے بڑھے اور نتیجہ خیز مکالمہ کی گنجائش پیدا ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ اس پروگرام میں سیاسی، صحافتی، دانش ور اور سول سوسائٹی سمیت ہر طبقہ فکر کے بیباکانہ اظہار خیال سے بلوچستان کے مسائل نمایاں ہو کر سامنے آئے ہیں۔

میں بہت شکر گزار ہوں آپ سب لوگوں کا کہ آپ تشریف لائے۔ گزشتہ کم و بیش ۳۸ سالوں میں ہم نے سینکڑوں سیمینار منعقد کیے ہیں۔ ان سیمینارز میں ہر طرح کے لوگ شریک ہوتے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس انداز میں صبر کے ساتھ، مہذب انداز میں اور ایک دوسرے کا احترام برقرار رکھتے ہوئے آپ سب نے آج کے سیمینار میں گفتگو کی ہے، ایسے مواقع بہت کم دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ اس بات کی بھی علامت ہے کہ اگر مل بیٹھنے اور گفتگو کرنے کا عمل ہو تو چیزوں کو بہتر انداز میں سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

مجھے خوشی ہے کہ یہاں کھل کر گفتگو ہوئی ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ شرکاء میں سے کسی نے بھی اپنے خیالات اور احساسات کے بیان میں تکلف سے کام نہیں لیا۔ دوسری جانب اصلاح احوال کے لیے تجاویز بھی بیان ہوئی ہیں۔ میں نے کم و بیش ہر فرد کی گفتگو کے اہم نکات کو نہ صرف اپنے پاس نوٹ کیا ہے بلکہ یہ کوشش بھی کی ہے کہ نکات کو انہی الفاظ میں لکھوں جن الفاظ میں آپ نے بیان کیا ہے۔ دوسری جانب جیسے صبح بھی ذکر کیا گیا تھا کہ ہم نے اس پوری

کارروائی کو ریکارڈ بھی کیا ہے۔ اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس ساری کارروائی کو ذاتی طور پر دوبارہ بھی سنوں گا تاکہ آپ نے جو بات جس لب ولہجہ میں کہی وہ زیادہ اچھی طرح سے واضح رہ سکے۔

سیمینار کی ابتدائی گفتگو میں، میں نے عرض کیا تھا کہ ہم سیمینار کے حوالہ سے جب کوئی بات لکھیں گے یا لکھنا چاہیں گے تو کسی کے نام کے ساتھ منسوب نہ کریں گے۔ تاہم دن بھر کارروائی سننے کے بعد مجھے اس میں کوئی مضائقہ نہیں لگتا کہ اس سیمینار کی رپورٹ میں آپ کی گفتگو آپ کے نام کے ساتھ آئے۔ اس کے لیے میں آپ کی اجازت لینا چاہتا ہوں اور اسی لیے میں نے اس دوران یہ اہتمام کیا ہے کہ آپ کی بات کو بالکل ایسے ہی جیسے آپ نے کہا ہے لکھ لیا جائے۔ اس کے نتیجے میں جن لوگوں سے بھی ہمیں بات کرنے کا موقع ملے گا ہم آپ کی بات کو آپ ہی کے الفاظ میں پیش کر سکیں گے۔ اس طرح الفاظ ہی نہیں جس لب ولہجے میں اور جن جذبات کے ساتھ بات کہی گئی ہے اسے سمجھنے میں آسانی ہو گی۔ اگرچہ یہ بات ظاہر ہے کہ اس میں کچھ ایڈیٹنگ بھی کرنی ہو گی جو کسی بھی زبانی گفتگو کو تحریر میں ڈھالتے ہوئے ناگزیر ہے۔

مجھے احساس ہے کہ دن پورا گزر گیا ہے آپ لوگوں نے جانا بھی ہو گا۔ تاہم میں چاہوں گا کہ چند خیالات جو آپ کی گفتگو سننے کے بعد ذہن میں آتے ہیں مختصراً آپ کے سامنے پیش کر دوں۔

جناب لہڑی صاحب اور بعض دوسرے لوگوں نے بھی کہا مجھے ان کی بات بہت اچھی لگی جسے میں دہرانا چاہتا ہوں! کہ کیا بلوچستان میں ہونے والے ظلم کا ذمہ دار عام پنجابی ہے۔ ظاہر ہے پنجاب کا عام شہری تو خود بھی مظلومیت کا شکار ہے۔ بلاشبہ ہمیں دیکھنا ہو گا کہ کسی مسئلہ کی ذمہ داری کسی خاص نسل کے لوگوں پر عائد کرنا کیا کوئی درست رویہ ہو سکتا ہے؟ اسی ضمن میں یہاں گیس کی لوڈشیڈنگ کی بات کی گئی۔ یہ درست ہے لیکن ذاتی تجربات کی بنیاد پر میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ گزشتہ چند سالوں سے بالخصوص سردی کے مہینوں میں تو گیس کی لوڈشیڈنگ اسلام آباد کے اعلیٰ ترین سیکٹروں میں بھی ہو رہی ہے۔

اس تناظر میں مجھے اس رائے سے پورا اتفاق ہے کہ پورا ملک دو طبقوں میں تقسیم ہے۔ ایک وہ اشرافیہ ہے جو خواہ کسی بھی جگہ ہو اسے ساری سہولتیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ دوسری جانب ایک عام شہری ہے۔ زبان، نسل اور علاقہ سے قطع نظر وہ جہاں بھی ہو مشکلات کا شکار ہے۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ عام آدمی کا الائنس بنایا جائے۔ عام آدمی کا یہ الائنس نہیں بنے گا تو ہمارے ملک میں تقسیم در تقسیم تو ہو سکتی ہے لیکن اس عام آدمی کے مسائل حل نہ ہوں گے۔

اسی صورت حال کی عکاسی ان دنوں فاٹا میں ہو رہی ہے۔ ہم نے پچھلے چار مہینوں میں فاٹا کے لوگوں کے ساتھ مل کر کئی نشستیں کی ہیں۔ ان نشستوں کی رپورٹ بھی بنائی گئی اور متعلقہ لوگوں کے ساتھ شئیر بھی کی گئی۔ یہاں میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ جو باتیں بلوچستان کے بارے میں آپ نے کی ہیں کہ مثلاً بلوچستان کو سیکیورٹی کی عینک سے دیکھا جاتا ہے، یہاں ہر تھوڑے فاصلے پر چوکی ہے، اچھے سے اچھے عزت دار آدمی کو روکا جاتا ہے اور موقع پر موجود اہلکار اس کی بے عزتی کرتا ہے، کم و بیش یہی باتیں اس سے زیادہ شدت کے لب و لہجے میں فاٹا کے لوگوں سے ہم نے سنی ہیں اور ان میں فاٹا سے تعلق رکھنے والے سابق سفارت کار، فوجی افسران اور سیاست دان سب ہی شامل ہیں۔ اس طرزِ عمل کی بہت سی وجوہات میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ جنگ اور تشدد کے ماحول میں سیکورٹی اہلکاروں کا عام آدمی کے ساتھ ہینڈلنگ کا طریقہ ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ سیاہ اور سفید یا دشمن اور دوست کی بنیاد پر لوگوں کو تقسیم کرتے ہیں اور اسی کے مطابق ان کے ساتھ رویہ اختیار کرتے ہیں۔ یہ اہلکار مقامی ہوں تو مخاطب اس طرح شدت سے ان کے توہین آمیز رویہ کو محسوس نہیں کرتا جس طرح دوسرے علاقے سے ہونے کی صورت میں محسوس کرتا ہے۔

اسی طرح محکوم لوگ اور محکوم قوم کی بات کی جاتی ہے، میرے خیال میں یہ بھی پورے ملک میں موجود ہے۔ زمینوں کے حوالہ سے قبضہ مافیا کہیں اور نہیں اسلام آباد میں سرگرم ہے۔ وہاں بھی سوال یہ اٹھتا ہے کہ بیچنے والے کیوں بیچ رہے ہیں اگر خریدنے والے کہیں اور سے آرہے ہیں۔ یوں یہ ایشوز پورے ملک کے ہیں جن کو اس انداز میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

اس مجموعی تناظر میں سیمینار کی بحث سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ مسائل یقیناً موجود ہیں اور چھوٹے بڑے ہر نوعیت کے ہیں۔ تاہم بہت سے مسائل کے اسباب اور مختلف فیصلوں کے پیچھے نیت کا تعین شاید اس قدر آسان نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں ارادی وغیر ارادی، شعوری ولاشعوری ہر دو طرح کے پہلو موجود ہو سکتے ہیں جبکہ انفرادی و گروہی مفادات بھی ایک حقیقت ہیں۔ مگر اس بات سے صرف نظر کر کے اور ان پیچیدگیوں کو سمجھے بغیر ایک دوسرے کی نیتوں پر شک کرنے سے بداعتمادی جنم لیتی ہے جو کہ خود ایک بڑا مسئلہ اور مسائل کے حل میں رکاوٹ ہے۔ مزید یہ کہ مسائل کو سمجھنے کے لیے حالات وواقعات کو مکمل تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی مختلف تہوں اور جہتوں کو سمجھا جا سکے۔

دوسری جانب مسائل مقامی سے لے کر قومی اور بین الاقوامی ہر ایک نوعیت اور سطح کے ہیں۔ بعض مسائل بلوچستان کے خصوصی حالات کی وجہ سے خالصتاً بلوچستان سے متعلق ہیں جبکہ بہت سے ایسے مسائل بھی ہیں جو نہ صرف بلوچستان بلکہ ملک بھر میں یکساں یا پھر شاید بعض صورتوں میں بلوچستان سے بھی شدید نوعیت میں دیگر جگہوں پر موجود ہوں گے۔ اسی طرح بعض مسائل خطے کی صورت حال، عالمی حالات اور ان سے متعلقہ عناصر کی صف بندیوں اور اقدامات کی وجہ سے جنم لے رہے ہیں۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی ہے کہ فرداً فرداً مسائل پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ مجموعی پس منظر میں مسائل کی پیچیدگیوں کو سمجھا جائے اور اسی کے مطابق رابطہ کاری اور شراکت داری سے مسائل کا حل نکالا جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کسی بھی ملک کے اندرونی معاملات جب ملکی نظام اور سرحدوں کے اندر حل نہ ہو رہے ہوں تو بیرونی قوتوں کو ان سے فائدہ اٹھانے اور اپنے کھیل کھیلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ عالمی طاقتوں اور یہاں متحرک بیرونی قوتوں کو نہ تو بلوچوں سے محبت ہے اور نہ ہی پاکستان سے۔ سب اپنے اپنے مفادات کے تابع ہیں اور انہی مفادات کے حصول کے لیے دوسروں کی سرزمین، حالات اور مسائل کا استعمال کرتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بھی تسلیم کرنا چاہیے کہ پاکستان جس خطے میں قائم ہے وہاں اپنے ہمسایوں کے ساتھ اس

کے تعلقات بوجوہ مثالی نہیں ہیں۔ بھارت کے ساتھ قیام پاکستان کے بعد سے ہی کشمیر سمیت دیگر مسائل کی وجہ سے تعلقات نہ صرف خراب رہے ہیں بلکہ کئی دفعہ تصادم کی صورت بھی اختیار کر چکے ہیں۔ افغانستان کے ساتھ بھی ڈیورنڈ لائن (پاک افغان سرحد) ایک وجہ تنازعہ رہی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بڑی وجہ گزشتہ کم و بیش چار دہائیوں سے وہاں جاری جنگ اور خانہ جنگی ہے جس کی بناء پر تعلقات مشکلات کا شکار رہے ہیں۔ افغانستان کی صورت حال اور دیگر علاقائی اور مسلکی پیچیدگیوں نے ایران کے ساتھ تعلقات کو بھی اتار چڑھاؤ کا شکار کیے رکھا ہے۔ اس سلسلے میں حالیہ دنوں میں کلبھوشن یادیو (بھارتی جاسوس) کی ایران میں موجودگی اور بعد ازاں گرفتاری نے کئی سوالات کو جنم دیا ہے۔ دوسری طرف پاکستان کی چین سے قربت اور گوادر میں چین کی موجودگی کو اپنے معاشی واسٹریٹجک مفادات کے لیے خطرہ سمجھنے والی قوتیں بھی یہاں کے مقامی تنازعہ سے فائدہ اٹھانے کی بھرپور کوشش کر رہی ہیں۔ ایسے میں ضرورت اس چیز کی ہے کہ اندرونی معاملات و مسائل کا حل ہم خود ہی نکال لیں بجائے اس کے کہ بیرونی قوتیں انہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کریں۔

سی پیک کے حوالے سے ایک نقطہ نظر جو سامنے آیا ہے اس میں وزن ہے۔ یعنی یہ کہ کہنے کو تو سی پیک ہمارے (بلوچستان) نام پر بنایا جا رہا ہے لیکن اس میں ہمارے لیے جو کچھ ہے اس کی وجہ سے بہت ساری قوتیں ہماری طرف متوجہ ہو رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا پھر سی پیک سے انکار کر دیا جائے یا سی پیک کو صحیح طرح Negotiate کیا جائے کہ قومی مفاد، بلوچستان کے مفاد اور گوادر کے مفاد میں کوئی تصادم نہ ہو۔ اس لحاظ سے میں کم از کم یہ سوچتا ہوں کہ بہتر طریقے سے Negotiate کرنا اصل آپشن ہے۔ یہ سوال بھی پوچھا جانا چاہیے کہ اگر Negotiate درست طور پر نہیں ہو رہا تو کیا اس میں ہر صورت میں بدنیتی ہی شامل ہے؟ یا یہ صورت حال ہمارے ملک میں خراب اور نااہل حکومتی کارکردگی (گورننس) کے مسائل ہی کی ایک اور جھلک ہے۔

مجھے آپ کی اس شکایت کا پورا احساس ہے میں اسے تسلیم کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ

آگے بڑھنے کے لیے ماضی سے سبق لینا ہو گا۔ تاہم جب میں نے Negotiation کی بات کی تو میری مراد بیرونی ممالک سے ہے۔ جب ہم کہتے ہیں امریکہ کی بھی خواہش ہے کہ گوادر اس کا ہو جائے، روس اور چین کی بھی یہ خواہش ہے تو یہ ہمارے لیے اپنے حق میں Negotiation کا ایک اچھا موقع اور راستہ فراہم کرتا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اگر اس کے بجائے اس راستہ کو بند کرنے اور روکنے کی جدوجہد کی جائے تو کیا یہ تمام لوگ رک جائیں گے؟ اس تناظر میں بہتر ہے کہ ہم Negotiation اپنے مفاد میں کرنے کی کوشش کریں۔ میں یہ سوال چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ ہم اس پہلو سے بھی چیزوں کو دیکھیں۔ [ڈاکٹر عبدالحئ بلوچ نے اس موقع پر تبصرہ کیا "جن کے پاس اختیارات ہیں وہ تو ہمیں گھاس بھی نہیں ڈالتے"۔]

شاید میں اپنی بات ٹھیک طریقے سے کہہ نہیں پایا۔ اشارہ اس جانب نہیں تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں یہاں بلوچستان میں بیٹھ کر یہ احساس ہو رہا ہے کہ پنجاب اس سے بہت فائدہ اٹھا رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہماری حکومت کی بالعموم پوری تیاری نہیں ہوتی جبکہ چین کا ہوم ورک غیر معمولی ہوتا ہے۔ مذاکراتی عمل میں جو فریق ہوم ورک کر کے آ رہا ہو اس کے لیے اپنی شرائط منوانا آسان ہو جاتا ہے بالخصوص دوسری جانب نہ تو دفاتر میں عملہ پوری طرح اہل ہو، نہ ہی معلومات اور قابل اعتماد اعداد و شمار دستیاب ہوں، اور سب سے بڑھ کر سیاسی دائرہ میں عدم استحکام ہو تو آپ مذاکرات کے دوران کمزور پوزیشن پر آ جاتے ہیں۔ Negotiation کی بات کرتے ہوئے میرا اشارہ اس طرف تھا۔

بدقسمتی سے ہمارا سیاسی کلچر بھی نااہلی کی ایک وجہ ہے جس میں قومی سطح پر فیصلے انتخابی ضروریات کے تناظر میں طے پاتے ہیں۔ ہماری حکومت کی اول و آخر خواہش یہ ہوتی ہے کہ آنے والے (مثلاً اس وقت ۲۰۱۸ء کے) انتخاب سے پہلے پہلے جو کچھ ہو سکتا ہے اور جس کا کریڈٹ ہمیں مل سکتا ہے وہ کروالو خواہ ملکی اور قومی نقطہ نظر سے وہ اولین ترجیح بھی نہ ہو۔ اسی تسلسل میں پھر یہ زیادتی ہوتی ہے کہ اگر بلوچستان میں انتخاب نہیں لڑنا تو انہیں یہاں کسی خاص کام سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ Negotiation میں ہماری حکومتوں کے اس رویہ سے دوسرے فریق (چینیوں) کو اپنی شرائط طے کرانے میں کامیابی ہو جاتی ہے۔

یہاں کسی دوست نے یہ بات کہی کہ ہمارے لیے سی پیک صرف یہی رہ جائے گا کہ ہم لوگ چائے خانہ یا پنکچر کی دکان کھول لیں۔ میرا خیال ہے آپ نے بالکل ٹھیک تبصرہ کیا ہے۔ ظاہر ہے ایسا نہیں ہونا چاہیے تاہم آج سے چند سال کے بعد دنیا میں جو کچھ ہونے جارہا ہے اسے پیش نظر رکھ کر کام شروع کیا جائے تو بعید نہیں کہ آج کے چائے خانے کو کل کی بڑی ملٹی نیشنل کمپنی میں ڈھالا جاسکتا ہو۔ دنیا میں کتنی ہی ملٹی نیشنل کمپنیوں کا آغاز اسی طرح ہوا ہے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو مواقع کو جس شکل میں مل رہا ہو اسی شکل میں استعمال کر کے اسے کئی گنا بڑھانے کا انتظام کر لیتے ہیں۔ درحقیقت مواقع کئی طرح کے ہوتے ہیں اور ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے انفرادی، اجتماعی، سول سوسائٹی کی سطح پر اور سول گروپس کے ذریعے کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔

## سیمینار کے اختتام پر ہمیں چند نکات پر اتفاق کر لینا چاہیے

- پہلی بات یہ کہ صورت حال کو جوں کا توں برقرار رکھا نہیں جاسکتا یعنی Status quo مسئلہ کا حل نہیں ہے۔ دوسری جانب مایوسی بھی کوئی آپشن نہیں ہے۔
- دوسری یہ کہ ہمیں ایک پیچیدہ صورت حال کا سامنا ہے جس کے اسباب اور مظاہر میں انتظامی، اقتصادی، سیکورٹی، سیاسی، علاقائی، قبائلی اور بین الاقوامی عوامل شامل ہیں۔ کسی جامع حل کی طرف پیش رفت کے لیے ہمہ پہلو کام کرنا ہو گا۔
- تیسری یہ کہ صورت حال کا بگاڑ کئی عشروں پر محیط ہے اسے حل کرنے کے لیے کوئی شارٹ کٹ نہیں ہو سکتا۔ ۷۰ سال کی جو خرابیاں ہیں اور جس طرح سے مسائل کو پیچیدہ کر دیا گیا ہے، ان پیچیدہ مسائل کے لیے ہم نے مناسب ہوم ورک کیے بغیر حل نکالنا بھی چاہا تو حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ مزید پیچیدہ ہو جائے گا۔
- اس پس منظر میں چوتھی اہم بات یہ ہے کہ مسائل کے مستقل اور پائیدار حل کے لیے مؤثر راستہ بات چیت اور مذاکرات ہی کا ہے۔ اس راستہ کو اختیار کرنے کے باوجود

حادثات کے امکانات کو رد نہیں کیا جاسکتا لیکن مکالمہ کے لیے موثر ادارتی میکنزم جو آئینی وسیاسی بنیادوں پر تشکیل دیا گیا ہو وہ ان حادثات کے باوجود مذاکراتی عمل کی کامیابی کو یقینی بناتا ہے۔

- اسی سے جڑی پانچویں اہم بات یہ ہے کہ طاقت کا استعمال چاہے وہ کسی بھی طرف سے ہو ہر گز مسائل کا حل نہیں بلکہ نئے مسائل کو جنم دینے کا باعث ہے۔ طاقت کے ذریعے مسائل حل کرنے کی روش کے نتیجے میں عمل اور رد عمل کا نہ رکنے والا سلسلہ اور اس کی بناء پر پیدا ہونے والی تلخیاں معاملات کو مزید گھمبیر تو بنا دیتی ہیں مگر حل کی جانب نہیں لے جاتیں۔ جدوجہد کرنے والے کے لیے قربانی بذات خود ایک آپشن ہے۔ لیکن یہ تو ایک نہ ختم ہونے والا پراسس ہو گا جس میں ہر دو طرف کے لوگ اپنے اپنے تئیں قربانیاں دیتے رہیں گے۔ اسی تناظر میں ہمیں جب کہیں موقع ملتا ہے تو ہم دوسرے فریق سے بھی بات کرتے ہیں۔ آج کی نشست کے بعد اور بھی زیادہ شدت سے بات کریں گے کہ سلامتی کے ذمہ داران کو یہ جاننا چاہئے کہ سلامتی دراصل انسانوں کو دینی ہے۔ علاقے کی سلامتی کی کیا اہمیت اگر آپ علاقے کی سلامتی میں انسانوں کی سلامتی کو برباد کر دیں۔

- آخری اور اہم ترین بات، جس کی جانب پہلے بھی اشارہ ہو چکا ہے، یہ ہے کہ بلوچستان ہی کی طرح ملک کے بہت سے دیگر حصوں کے باشندوں کے بھی متعدد مسائل ہیں۔ درحقیقت پنجاب اور سندھ ہو یا خیبر پختونخوا، تمام ہی صوبوں میں آبادی کا ایک بڑا حصہ محرومیوں کا شکار ہے جبکہ ان صوبوں میں بالادست طبقات ہی کی طرح بلوچستان میں بھی بالادست طبقات ہیں۔ یوں یہ معاملات کسی مخصوص علاقے یا قوم کے بجائے ملک بھر کے پسماندہ طبقات کے مسائل ہیں۔ ایک طرف کچھ لوگوں کے پاس زندگی کی بہترین سہولیات ہیں اور دوسری طرف عوام کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں ہو رہی ہیں۔

اس صورت حال کے بہت سے اسباب گنوائے جاسکتے ہیں لیکن یہ عدم مساوات اصلاً موجودہ استحصالی نظام کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ ان مسائل کے حوالے سے اپنی محرومیوں کی آواز کو ملک کے دیگر محروموں کی آواز سے ملا کر مشترکہ جدوجہد کی جائے تو شاید یہ آواز مزید مؤثر اور توانا ہو کر ابھرے۔ اس طرح کے کسی بھی وسیع تر اشتراک، مذاکرات اور اعتماد سازی کے لیے ضروری ہے کہ بلوچستان سمیت پورے ملک میں جو سیاسی عمل چل رہا ہے اس میں توڑ پھوڑ کی بجائے اسی میں سے حالات کی بہتری کے لیے مدد اور تعاون کی راہیں تلاش کی جائیں۔ ایسے میں تمام اسٹیک ہولڈرز کو چاہیے کہ وہ طاقت کے استعمال کے بجائے بات چیت کے ذریعے مسائل کا حل تلاش کریں۔

اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ طاقت کے استعمال کا سلسلہ اگر جاری رہتا ہے تو اس سے سب سے زیادہ متاثر بلوچ ہی ہوں گے۔ ایسے میں اگر تلخیوں کو پس پشت ڈال کر طاقت کی بجائے نیک نیتی کے ساتھ بات چیت کے ذریعے مسائل کے حل کی کوئی صورت پیدا کی جائے تو کوئی مبالغہ نہیں کہ بہت سے مسائل سے نجات حاصل کرتے ہوئے رفتہ رفتہ بڑے مسائل اور تضادات کے حل کے لیے تعاون کی راہ ہموار ہو۔

موجودہ حالات میں بات چیت کے ایک پائیدار عمل کے آغاز کے لیے پہلے اعتماد سازی کے اقدامات لینے ہوں گے، ایک دوسرے کو وضاحت اور شکایت کا موقع دینا ہو گا تاکہ دونوں طرف سے برف کے پگھلنے اور فاصلوں کے کم ہونے کی صورت پیدا ہو جو بات چیت اور باقاعدہ مذاکرات کے لیے سہولت کا باعث بنے۔ اس کے لیے ہمیں چھوٹے بڑے ہر درجے کے اقدامات لینے ہوں گے تاکہ ان کے سلسلہ وار اثرات اعتماد سازی کے لیے کارگر ثابت ہوں۔

آج کے سیمینار میں دو اور اہم باتیں میں نے علیحدہ سے نوٹ کر لی ہیں کہ ان پر غور و فکر کے بعد ایک مہم کی صورت میں آگے بڑھانا چاہیے۔ ایک یہ کہ ہم صوبوں میں اور صوبوں کی نمائندگی میں توازن کیوں کر پیدا کریں؟ یہ خدشہ موجود ہے جس کی جانب یہاں اشارہ کیا گیا کہ

پنجاب کو دو حصوں میں تقسیم کر دیں تو سینٹ میں ان کی تعداد بھی دو گنا بڑھ جائے گی۔ ظاہر ہے اس پر سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ موجودہ انتظام میں توازن نہیں ہے۔ طویل المیعاد عرصہ میں اس کو سوچنا ہو گا کہ یہ عدم توازن کیسے ہوا اور اب کس طرح دور ہو سکتا ہے۔

دوسری بات سول سوسائٹی کے کردار سے متعلق ہے۔ حقیقت میں سول سوسائٹی میں سب ہی طرح کے لوگ ہیں۔ بعض تو بالکل ہی منفی ایجنڈے کو لے کر چل رہے ہیں۔ ان کے پاس بے شمار ایسے عنوانات ہیں جو ہماری سماجی اقدار کو ہدف بنا رہے ہیں اور معاشرہ کی ٹوٹ پھوٹ کا سبب بن رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ سارے لوگ برے ہیں لیکن پاکستانی معاشرہ کی حقیقی اقدار سے وابستہ سول سوسائٹی کو ہمیں تشکیل دینا ہے اور اس کے ذریعہ معاشرے کے مختلف طبقات کو قریب تر لانا ہے۔ حکومتوں پر بھی اسے اثر انداز ہونا ہو گا لیکن کسی بیرونی ایجنڈے کی بنیاد پر نہیں بلکہ قومی مفادات کے تناظر میں۔

ایک بار پھر بہت بہت شکریہ!

# اشاریہ


## آ

آبادکار,۴
آبادی کی ساخت, ۵۲/ آبادی کے تناسب میں تبدیلی, ۱۵۵/ مجموعی آبادی,۷۷
آبپاشی کا نظام,۱۸۹
آبنائے ہرمز,۱۵۸,۱۶۲
آبی ذخائر,۸۷
آزاد خارجہ پالیسی,۲۷
آسٹریلیا,۱۱۵,۱۲۶,۱۳۰
آغاز حقوق بلوچستان پیکج,۲۳,۲۵,۲۶,۲۸,۱۱۰
آکسفورڈ,۱۳۴
آئل اینڈ گیس ڈیویلپمنٹ کارپوریشن (او جی ڈی سی), ۷۹,۸۳
آئی ٹی یونیورسٹی,۱۷۸
آئین پسند,۱۳۵
آئینی ترمیم ۱۸ویں,۱۰۹,۱۱۵,۱۳۷,۱۴۰,۱۴۱,۱۵۷,۱۷۱

## ا

اپیکس کمیٹی,۹۸
اتھاریٹیرین ازم,۱۴۹
اتھل,۸۹,۱۶۰
اجتماعیت,۱۴۹
اجتماعی قبریں,۱۴۳
اجنبیوں کے حقوق,۵۱
احسان اللہ وقاص,۱۲۸
احسن اقبال,۱۶۵,۱۶۸
اختر مینگل,۵۹,۱۵۲,۱۶۷,۱۷۶
ارشاد احمد حقانی,۱۵۰
اسامہ بن لادن,۱۸
اسپیشل لیوی,۹۱
استعماری گرفت,VI/ استعماری نظام کے شکنجے,V
اسٹون ایج,۱۶۹
اسٹیو کنگ(Steve King), ۲۴
اسٹیبلشمنٹ,۵۸,۶۰,۶۱,۶۴,۱۵۷,۱۶۰,۱۶۹,۱۹۲, ۱۹۴,۱۹۶
اسد مینگل,۱۷۶
اسحاق بلوچ، ڈاکٹر,۱۰۴,۱۳۶
اسرار اللہ زہری,۶۰
اسرائیل,۱۷,۱۷۲
اسلام کی تعریف,۱۳۵
اسلام آباد,۲۱,۲۴,۱۰۳,۱۰۷,۱۱۱,۱۱۵,۱۲۰,۱۲۱,۱۳۶, ۱۴۱,۱۶۶,۱۶۷,۱۶۹,۱۷۰,۱۷۷,۱۸۰,۱۸۵,۱۸۷, ۱۹۷,۱۹۸,۱۹۹
اسلام آباد کا مائنڈ سیٹ,۱۸۸
اسلم بھوتانی,۱۰۴,۱۱۷,۱۲۵,۱۶۶,۱۷۱,۱۸۹
اسمال انڈسٹریز کارپوریشن,۸۷
اصغر پانیزئی,۱۰۴
اصغر نفسیاتی ہسپتال,۵
اعلیٰ اختیاراتی جوڈیشل کمیشن,۸۶
افریقہ,۱۷
افغان مہاجرین,۱۵۴,۱۶۸,۱۹۶
افغانستان,۴,۱۷,۱۸,۲۴,۲۵,۴۷,۷۹,۸۰,۸۷,۱۰۵, ۱۳۹,۱۵۴,۱۵۸,۱۶۱,۱۸۵,۲۰۱
افغانستان پر روسی قبضہ,۱۵۴

اقبال، علامہ محمد,۱۸۱
اقوام متحدہ,۱۶۸
اکنامک پراجیکٹ,۱۱۹
الہامی ہدایت,VI,V
السیّد عبدالقادر جمال الدین الگیلانی,۹۴
القاعدہ,۱۸
اللہ کی حاکمیت,۳۱
الیکٹرانک میڈیا,۱۶۷
امان اللہ شادیزئی,۱۰۴,۱۸۳
امریکہ,۶,۱۵,۱۶,۱۷,۲۴,۳۳,۴۰,۴۷,۶۵,۶۶,۱۲۱,
۱۲۲,۱۲۶,۱۳۱,۱۳۹,۱۴۴,۱۴۵,۱۴۷,۱۴۸,۱۵۸,
۱۶۳,۱۶۵,۱۶۹,۱۷۵,۱۷۲,۱۷۹,۲۰۲
امریکہ کا پولیٹیکل انٹرسٹ, ۱۲۶/امریکہ کے خفیہ
اداروں کا کردار,۶/امریکہ کی سیٹلائٹ,۱۴۸
امریکی بحری بیڑہ,۱۳۹/امریکی ایوان نمائندگان,۲۴/
امریکی کانگریس,۱۵,۶۴
امریکی بھارتی اسٹرے ٹیجک پارٹنرشپ,۱۶
امن وامان کی صورتحال,۴۱,۶۲
امین اللہ فطرت,۱۰۴,۱۶۳
انتظار حسین,۱۷۶
انتقال آبادی,۱۱۴
انٹر سروسز انٹیلی جنس (آئی ایس آئی),۱۵۵
انٹر سروسز پبلک ریلیشنز (آئی ایس پی آر),۱۸۱
انٹرنیٹ کا دور,۱۶۹
انٹرنیشنل ٹریڈ روٹ,۱۶۱
انٹیلی جنس ایجنسیوں کا کردار,۷۹
اندرون بلوچستان بے گھر ہونے والے افراد,۵۷
انڈس سویلائزیشن,۱۴۸
انڈسٹریل ریوولیوشن,۱۴۸
انڈونیشیا,۱۷,۱۴۹,۱۷۸
انڈیا (بھارت),۶,۱۶,۱۷,۳۳,۴۰,۴۷,۱۳۹,۱۴۵,
۱۴۸,۱۵۸,۱۶۱,۱۶۲,۱۷۸,۱۷۲,۲۰۱/ہندوستان,
۴۷,۶۶,۱۴۴,۱۴۵,۱۴۶,۱۴۷,۱۶۱,۱۶۴,۱۶۵,
۱۷۹,۱۸۰,۱۸۲
انڈیا کے ہیرے,۱۴۷
انسانی جارحیت,۱۳۵
انسانی حقوق کی خلاف ورزی,۶۲
انسانیت کا ارتقا,V
انسپکٹر جنرل فرنٹیئر کانسٹیبلری بلوچستان,۷۹
انسداد اسمگلنگ,۸۰,۸۸
انگلینڈ,۱۴۸,۱۵۴
اُوچ,۱۱۸,۱۲۵
اورماڑہ,۱۶۰/اورماڑہ کنٹونمنٹ ایریا,۱۹۵
اورنگ زیب,۱۴۶
اویس غنی,۱۶۰
اے آر صدیقی,۱۸۱
اے زیڈ کے شیر دل,۱۵۶
ایبٹ آباد کا حملہ,۱۸
ایٹمی صلاحیت,۱۶
ایران,۴,۶,۱۷,۲۴,۲۵,۴۰,۷۹,۸۰,۸۷,۱۰۵,۱۵۴,
۱۵۸,۱۶۰,۱۶۱,۱۶۲,۱۶۵,۱۸۵,۲۰۱
ایران میں آمریت,۲۴
ایسٹ انڈیا کمپنی,۱۴۵
ایسٹ بنگال,۱۲۲
ایسٹرن بلوچستان,۱۷۲
ایشین ڈویلپمنٹ بینک,۱۸۸
ایشین ہیومن رائٹس کمیشن,۱۴۳
ایف سی میں بلوچستان کی نمائندگی,۷۹
ایکسپلوریشن لائسنس,۱۲۸
این ایف سی ایوارڈ,۲۱,۳۵,۳۹,۴۲,۷۰,۷۸,۸۲,۸۴,
۸۸,۱۱۰,۱۴۱
اینٹی اسمگلنگ کردار,۷۹

اینڈریو اسمال (Andrew Small)، ۱۳۸
ایئر کرافٹ کیریئر، ۱۵۸
آرمی پبلک اسکول، ۹۶، ۹۸، ۹۹

## ب

باجوڑ، ۶۸
باراک اوباما (Barack Obama)، امریکی صدر، ۱۸
بالاچ مری، ۱۸۶
بالفور ڈیکلریشن، ۱۷
بجلی کے خالص منافع کی تقسیم، ۳۵
بجلی کے واجبات کی معافی، ۸۸
بحریہ، ۴۱، ۹۸ / بحریہ کے بیس پر حملے، ۹۸
بحیرہ عرب، ۱۰۵
براہمداغ بگٹی، ۶۳
براہوی لٹریچر، ۱۸۲
برٹش پٹرولیم، ۱۲۳
برطانوی بینک، ۱۲۶
برطانوی سامراج، ۱۰ / برطانوی سلطنت، ۲۴
برطانیہ، ۱۲۶، ۱۴۵، ۱۵۸، ۱۷۹
برطانیہ کی انوسٹمنٹ، ۱۲۶
بزنس ریکارڈر، ۱۰
بگٹی علاقے، ۵، ۱۲۵
بگٹی قبائل، ۵، ۱۲۵
بلدیاتی حکومت، ۹۰
بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن، ۷
بلوچ ایریا، ۱۵۱ / بلوچ بارڈر، ۱۶۲ / بلوچستان کا ساحل، ۱۰۵ / بلوچستان کا کل رقبہ، ۷۷
بلوچ آبادی کے تناسب میں تبدیلی، ۵۷
بلوچ قبائل، ۱۰۶ / بلوچ قیادت، ۱۰۳، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۶
بلوچ معاشرہ، ۱۰۷ / بلوچ نفسیات، ۱۰۸
بلوچستان اسمبلی، ۲۶، ۸۴، ۸۹، ۱۰۴، ۱۱۷، ۱۷۷، ۱۸۴
بلوچستان اسمبلی کی قراردادیں، ۱۷۷
بلوچستان ایکسپریس، ۱۶۶
بلوچستان بار کونسل، VIII، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۱۱، ۱۱۲
بلوچستان پارلیمانی کمیٹی، ۹۳
بلوچستان قومی موومنٹ، ۶۲
بلوچستان کا خصوصی کوٹہ، ۲۷
بلوچستان کا گورنر، ۱۵۴
بلوچستان کا مسئلہ، ۱۵، ۱۶، ۱۹، ۲۴، ۳۰، ۳۲، ۴۹، ۶۴، ۶۵، ۷۱، ۱۸۳
بلوچستان کاڈومیسائل، ۱۵۶ / بلوچستان کارڈ، ۱۶
بلوچستان کے معدنی وسائل، ۲۴، ۶۹ / بلوچستان کے معدنیات، ۱۳۱ / بلوچستان کی توانائی، ۱۱۶
بلوچستان کی ترقی، ۸۵، ۱۴۱، ۱۶۰، ۱۶۶، ۱۹۲
بلوچستان کی سیاسی و سماجی قیادت، VII, VIII
بلوچستان کی صوبائی قیادت، ۱۳
بلوچستان کے پالیسی ساز، ۱۳۲
بلوچستان کے لاپتہ افراد کی آواز، ۱۴۳
بلوچستان زمین کی سول و عسکری اداروں کو الاٹمنٹ، ۵۷
بلوچستان کے نوجوان Youth of Balochistan، ۱۳۴
بلوچستان کی منتخب حکومت، ۱۹
بلوچستان لوکل گورنمنٹ، ۲۵
بلوچستان میں امن و امان کی صورتحال، ۷۵
بلوچستان میں انٹیلی جنس ایجنسیوں کا کردار، ۷۸
بلوچستان میں فوجی فورسز، ۸۱
بلوچستان میں بیرونی طاقتوں کا کردار، VIII
بلوچستان میں بے چینی، VIII
بلوچستان نیشنل پارٹی، ۵۷، ۹۳، ۱۶۵
بلوچستان ہائی کورٹ، ۱۲۸، ۱۳۰، ۱۴۳
بلوچستان یونیورسٹی، ۱۰۴، ۱۷۵، ۱۷۸
بلوچی، ۶۶، ۱۴۸، ۱۵۲، ۱۷۴، ۱۸۲ / بلوچی کلچر، ۱۸۱ /

بلوچی کشیدہ کاری,۱۵۲
بم دھماکے,۵
بمبئی,۱۴۵
بنگال,۱۲۲,۱۳۳,۱۴۵,۱۴۶,۱۸۳
بنیادی انسانی ضروریات,۱۹۰
بنیادی ڈھانچے کی ترقی,۱۳۴
بولان,۱۵۰,۱۵۱
بی این پی مینگل,۱۷۳
بی بی سی,۱۶۹
بے گھر لوگوں کی بحالی,۶۸
بے نظیر بھٹو(وزیر اعظم),۱۴۹,۱۶۷
بین الاقوامی تنظیمیں,۱۷۰
بین الاقوامی ٹریبونل کا فیصلہ,۱۳۰
بیرونی ممالک کے سفیر,۱۷۰
بین الصوبائی مساوات,۹۲/ بین الصوبائی ہم آہنگی,۷۵,۷۶
بین الاقوامی قوانین,۵۱,۵۳
بیوروکریسی کا کردار,۳۶
بھٹو،ذوالفقار علی,۶۶,۱۵۴,۱۵۷

## پ

پادری,۱۴۵
پارلیمانی جمہوریت،,۳۱
پارلیمانی کمیٹی برائے بلوچستان,۲۰,۳۰
پارلیمانی نظام,۱۱۵,۱۴۹,۱۸۳,۱۸۵
پاک افغان بارڈر,۱۸
پاک امریکہ تعاون,VI
پاک چین اقتصادی راہداری,۱۰۶/ پاکستان چین تعلقات,۱۳۸
پاکستان ایران گیس پائپ لائن,۱۷
پاکستان ایک وفاقی ریاست,۱۲۰
پاکستان آرمی,۱۰
پاکستان پٹرولیم لمیٹڈ(PPL),۵,۲۷,۷۹,۸۳,۹۱,۱۲۴,۱۳۷,۱۵۲
پاکستان کا اکثریتی حصہ,۱۳۳
پاکستان کا دستور,۵۳,۷۳,۱۹۲/ پاکستان کی آئینی حدود,۱۳۵/ متفقہ آئین,۱۰۹
پاکستان کی خود مختاری,۷۲
پاکستان کی علامت,۱۳۵
پاکستان کی نظریاتی اساس,VI
پاکستان کے دفاعی مفادات,۷۳
پاکستان مسلم لیگ(ق),۱۷۳,۱۷۴
پاکستان کی سالمیت,۷۲
پاکستانی پالیسی ساز,۱۳۲
پاکستانی قوم پرستی,۱۳۵
پاور پراجیکٹس,۱۱۸
پاؤلو کوئلہو (Paulo Coelho),۱۷۷
پبلک اکاؤنٹس کمیٹی,۲۱
پٹ فیڈر کینال,۱۹۵
پٹھان, ۱۶۱, ۱۸۸/پختون, ۸۰, ۱۵۳, ۱۵۴, ۱۵۵/ پشتون, ۴, ۲۲, ۱۳۳, ۱۴۱, ۱۴۲, ۱۵۱, ۱۶۴, ۱۸۳, ۱۸۴,۱۸۵,۱۹۵
پختون خوا ملی عوامی پارٹی,۸۰
پسنی,۱۰۵
پشاور,۵,۹۶,۹۸,۹۹,۱۰۷
پشتو لٹریچر,۱۸۲
پشین,۲۸,۱۵۱,۱۵۴,۱۵۵
پناہ گزینوں کے حقوق,۵۱
پنجاب کا ذریعہ آمدنی,۱۲۰
پنجاب کی بالادستی,۱۱۵
پنجابی,۱۳۳,۱۴۱,۱۸۱,۱۸۸,۱۹۸
پورٹ اتھارٹی,۲۷,۷۸,۸۱,۸۵
پولیس ٹریننگ سنٹر,۹۵

پولیس کا کنٹرول,۴۱
پولیو سنٹر,۹۶
پیپلز پارٹی,۱۹,۶۰,۶۱,۹۳,۱۶۷
پیر کوہ,۱۲۵
پیراملٹری فورس,۸۱
پیلا سامراج,۱۴۴

## ت

تانبا,۱۰۵,۱۲۶,۱۴۷
تائیوان,۱۳۹,۱۹۵
تباہ شدہ انفراسٹرکچر کی بحالی,۱۰۱
تحریک طالبان,۹۶
تحصیل شوران,۱۵۰
تحصیل کھٹن,۱۵۰
تربت,۶۰,۶۱
تربیلہ ڈیم,۱۴۱
ترقیاتی پروگرام,۹۲,۱۸۶ / ترقیاتی گرانٹس,۴۲
ترکی,۱۷
تسلط,۱۹۵
تشدد پسندی,۲۷
تعلیمی وظائف,۹۱
تکنیکی تربیتی انسٹی ٹیوٹ,۸۵ / ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ,۸۲
تمباکو,۱۲۱
تہذیبوں کا تصادم,۱۷۸
توتک,۱۴۲,۱۴۳,۱۶۹
تھائی لینڈ,۱۴۹,۱۹۵

## ٹ

ٹارگٹ کلنگ,۲۶,۵۷,۱۴۲,۱۷۴
ٹیتھیان کارپوریشن,۱۱۵,۱۲۸

## ث

ثانیہ مرزا,۱۵۷

## ج

جاپان,۱۳۹,۱۴۷,۱۶۲,۱۷۸
جارحیت,۱۳۵
جالب (حبیب),۱۸۱
جان بچانے والی ادویات,۹۰
جرگہ,۷۳ / جرگہ سسٹم,۱۲۳,۱۵۰
جرمن,۱۳۳
جسٹس نور محمد شاہ,۱۴۳
جعفر آباد,۱۷۴,۱۹۰
جماعت اسلامی,۱۰۴,۱۲۸,۱۷۲
جمعہ خان گاجانی,۱۰۴
جہانزیب جمالدینی، ڈاکٹر,۱۶۷
جمہوری نظام میں تعطل,۱۵۵
جمہوری وطن پارٹی,۸۱,۹۴
جمیل آغا,۱۰۴
جنرل ایوب خان,۶۶,۱۲۴,۱۶۶,۱۸۶
جنرل رحیم الدین خان,۱۵۴
جنرل ضیاء الحق,۱۵۴,۱۶۶
جنرل پرویز مشرف,۱۵,۱۹,۳۴,۳۵,۴۹,۵۸,۶۰,۶۱,
۶۲,۶۴,۶۶,۶۸,۸۲,۱۵۹,۱۶۰,۱۶۶,۱۸۶,۱۸۷
جنرل قادر بلوچ,۱۶۰,۱۸۴
جنرل یحییٰ خان,۱۶۶
جنریشن آف ویلتھ,۱۲۰
جنوبی چینی سمندر,۱۳۸
جہانگیر بادشاہ,۱۴۵
جی ایچ کیو,۹۸
جیکب آباد,۱۵۰,۱۹۰,۱۷۲

جینیفر موسیٰ,۱۵۷
جھل مگسی,۱۵۱

## چ

چار پارٹی بلوچ اتحاد,۸۱
چاغی,۱۱۲,۱۴۱,۱۹۱
چاہ بہار,۱۶۲
چلی کے ماہرین,۱۲۶
چمن,۸۹
چوہدری شجاعت حسین (سابق وزیر اعظم),۴,۶,۷,۲۹,
۴۶,۵۸,۷۵,۷۶,۸۳,۹۳
چوہدری نثار,۱۵۹,۱۷۰
چیف جسٹس امیر الملک مینگل,۱۷۶
چیف جسٹس آف بلوچستان ہائی کورٹ,۸۶
چیف جسٹس چوہدری افتخار,۱۲۹
چین,۶,۱۷,۳۴,۱۰۶,۱۱۵,۱۱۶,۱۱۹,۱۲۱,۱۲۶,۱۳۸,
۱۳۹,۱۴۴,۱۴۷,۱۴۸,۱۶۴,۱۷۶,۱۷۸,۱۸۹,۱۹۲,
۲۰۱,۲۰۲
چین ایک نیا سامراج,۱۱۶
چینی سفیر,۱۶۵
چھاؤنیوں کا قیام,۷۸,۸۲
چھتر,۱۵۱

## ح

حاجی شہر و تحصیل,۱۵۰
حاجی عطاء اللہ لانگو,۱۰۴
حبکو,۱۱۶,۱۱۸,۱۶۵ / حبکو کول پاور,۱۱۶,۱۱۸
حبیب اللہ کوسٹل پاور,۱۱۸
حضرتِ آدم علیہ السلام,V
حضور پاک ﷺ,V,۳۱
حفیظ پیرزادہ,۱۵۷
حقوق بلوچستان,۲۶,۱۱۰,۱۱۸
حکمران اسٹیبلشمنٹ,۱۹۲
حکومت کی رٹ,۵۲
حکیم بلوچ,۱۳۱
حیدرآباد سازش کیس,۱۸۶
حیر بیار مری,۱۷۶,۱۸۶

## خ

خاران,۱۴۱
خارجہ پالیسی کی خامیاں,۵۰
خالد رحمٰن,V,VI,IX,۱۰۵,۱۱۱,۱۱۲,۱۹۳,۱۹۷
میر احمد یار خان، خان آف قلات,۲۴,۱۰۸,۱۵۴
خان گڑھ، بارڈر,۱۷۲
خچر کا کلچر,۱۸۱
خشک سالی,۱۲,۴۳,۸۷
خصوصی اقتصادی زون,۷۸
خصوصی ترقیاتی پیکج,۸۶
خصوصی ٹاسک فورس,۸۲,۹۳
خضدار,۹۶,۱۴۲,۱۴۳,۱۴۴,۱۶۹,۱۸۰
خطِ غربت,۲۰,۷۷,۱۵۲
خواجہ محمد طارق سابق کمشنر سبی,۱۵۳
خواندگی کا تناسب,۷۷ / خواندگی کی شرح,۲۰
خودکش بمباری,۱۶۸ / خودکش بمبار,۹۶
خوف کی حالت,۱۳۵
خونی سرحدیں,۱۷
خیبر پختونخوا، صوبہ سرحد,۱۹,۳۰,۳۵,۷۳,۱۱۵,۱۲۱,
۱۸۴,۲۰۴
خیر بخش مری,۱۱۴,۱۲۵,۱۴۹,۱۵۷

## د

دستور ۱۹۷۳ء, ۸, ۱۸, ۷۳, ۱۳۵ / دستور کی بنیادیں, ۳۱ /
دستور میں مشترکہ فہرست, ۵۴
دستوری اصلاحات, ۷۰ / دستوری ترامیم, ۵۴
دستوری ضمانت, ۴۹
دفاع وطن, ۹
دفاعی افواج کو الاٹ کی گئی زمین, ۷۸
دہشت گردی, VI, ۱, ۱۷, ۱۸, ۲۱, ۲۶, ۴۲, ۷۴, ۹۵, ۹۶,
۹۷, ۹۸, ۹۹, ۱۰۰ / دہشت گردی کے خلاف جنگ,
VI, ۱۸, ۲۶, ۴۲, ۱۰۱
دوسری جنگ عظیم, ۱۴۶
دولت عثمانیہ, ۱۷
دینی مدارس, ۵۰

## ڈ

ڈائریکٹر جنرل کوسٹ گارڈز, ۸۰
ڈرون حملے, ۱۸
ڈومیسٹک وائلنس, ۱۹۰
ڈویژنل ہیڈ کوارٹر ہسپتال, ۹۰
ڈویلپمنٹ پیراڈائم, ۱۱۵
ڈویلپمنٹ سرچارج, ۱۵۵
ڈھاڈر, ۱۴۴, ۱۵۰, ۱۹۰
ڈی آئی خان, ۸۷
ڈیرہ بگٹی, ۵, ۷, ۲۶, ۶۰, ۷۸, ۷۹, ۹۱, ۱۵۲, ۱۵۳, ۱۶۶,
۱۷۴, ۱۸۰ / ڈیرہ بگٹی کے بے گھر ہونے والے
افراد, ۲۶
ڈیرہ غازی خان, ۸۷
ڈیرہ مراد جمالی, ۱۴۴, ۱۵۱
ڈی سیلینیشن پلانٹ, ۱۶۲
ڈیفنس آف پاکستان, ۱۵۴
ڈیلی بلوچستان ایکسپریس, ۱۰۴, ۱۵۷
ڈیم کی تعمیر, ۸۷
ڈیموکریٹک حکمران, ۱۴۹
ڈینا روہرابیکر (Dana Rohrabacher), ۱۵, ۲۴
ڈیورنڈ لائن, ۲۰۱

## ر

راحب خان بلیدی, ۱۱۲, ۱۰۴
رالف پیٹرز, ۱۷
رائلٹی کی ادائیگی, ۲۷, ۶۹ / رائلٹی کے بقایا جات, ۸۴ /
رائلٹی کی تقسیم, ۳۹ / رائلٹی کی شرح, ۶۹
رحیم یار خان, ۱۶۱
رشین لٹریچر, ۱۸۲
روزگار کی فراہمی, ۶۹
روزنامہ ایکسپریس ٹریبیون, ۱۴۳
روزنامہ آزادی, ۱۰۴, ۱۵۷
روزنامہ جنگ کوئٹہ, ۱۵۰, ۱۶۳
روس, ۱۵۸, ۱۶۴, ۱۷۸, ۲۰۲
روف مینگل, ۹۳
روم, ۳
ریڈ انڈینز, ۱۴۵
ریکوڈک, ۱۱۷, ۱۱۹, ۱۲۶, ۱۷۴, ۱۹۰, ۱۹۱
ریلوے کا جال, ۱۴۷
ریمنڈ ڈیوس (Raymond Allen Davis), ۱۶, ۱۸

## ز

زبیدہ جلال, ۹۳, ۹۴
زرداری، آصف علی, ۱۵, ۶۴, ۱۶۷
زیارت, ۱۹۱

## ژ

ژوب,۲۸,۸۷,۹۶,۱۴۴,۱۶۳

## س

ساجد ترین,۱۰۴,۱۶۷
سارتر,۱۸۲
سامراجی توسیع,۲۴
ساؤتھ کوریا,۱۶۲
سب سے بڑا انرجی پروجیکٹ,۱۱۸
سب کمیٹی برائے ایسٹ اور ساؤتھ ایشیا,۱۵
سبی,۹۵,۱۴۴,۱۵۲,۱۵۳,۱۹۰ / سبی ہائی وے,۱۵۳
سپاہیوں کی بغاوت,۱۴۷
سپریم کورٹ,۲۵,۲۶,۶۸,۱۲۰,۱۲۹,۱۳۰,۱۷۱
سٹیل مل,۱۶۲
سرینا ہوٹل,۱۴۲,۱۵۳,۱۶۳
سراج الدولہ,۱۴۶
سرائیکی,۱۶۱,۱۸۲
سرچ آپریشن,۶۰
سرد جنگ,۱۴۸
سردار اختر مینگل,۵۷
سردار زادہ بختیار خان ڈومکی,۶۳
سردار عطاء اللہ مینگل,۴۴,۱۷۶
سردار علی محمد قلندرانی,۱۴۳
سردار محمد یعقوب خان ناصر,۹۴
سردار یار محمد رند,۹۴
سرگودھا,۱۵۴
سعودی عرب,۱۶۲
سفید سامراج,۱۴۴
سلالہ چیک پوسٹ,۱۸
سلفر,۱۰۵
سلیم شاہد,۱۰۴,۱۸۶
سلیم لاشاری,۱۰۴
سمگلنگ اسلحہ اور منشیات,۲۶
سنٹرل ایشیا,۱۶۱
سندھ,۱۹,۳۶,۸۹,۱۱۷,۱۲۱,۱۳۸,۱۵۵,۱۵۸,۱۸۹,
۲۰۴
سندھ کی سرحد,۸۹
سندھی,۱۳۳,۱۴۱,۱۶۱,۱۸۱,۱۸۲
سنکیانگ,۱۳۹,۱۴۷
سوات,۶۰,۶۸
سوڈان,۱۷
سورت,۱۴۵
سوشل سیکٹر ڈویلپمنٹ,۸۶
سوشل میڈیا,۱۶۹
سول ایجنسیاں,۷۳
سول ایوی ایشن اتھارٹی,۹۰
سول آرمڈ فورسز,۸۴
سول سوسائٹی,۱۸۶,۱۸۷,۱۹۷,۲۰۳,۲۰۶
سول نظام,۹
سول و فوجی بیوروکریسی,۱۰۶
سونا,۲۵,۱۰۵,۱۱۲,۱۲۶,۱۴۷,۱۷۵
سونمیانی,۱۰۵
سوویت یونین,۱۴۸,۱۵۸
سوئٹزرلینڈ,۱۴۶
سوئی,۵,۹,۲۶,۲۷,۸۱,۸۲,۸۳,۹۰,۱۰۷,۱۱۴,۱۱۷,
۱۱۹,۱۲۱,۱۲۵,۱۵۲,۱۵۵,۱۵۶,۱۶۶,۱۷۴,۱۸۰,
۱۹۱
سوئی سدرن گیس,۲۷,۸۳,۱۱۷
سوئی گیس,۵,۸۲,۱۱۷,۱۱۹,۱۲۱,۱۵۲,۱۵۵,۱۵۶,۱۷۴,
۱۸۰,۱۹۱ / سوئی گیس رائلٹی,۸۲,۱۵۵ / سوئی گیس
فیلڈ,۵

سوئی ناردرن,۱۱۷
سوئی ہسپتال,۵
سی آئی اے,۱۸,۱۶
سی پیکCPEC,VIII,۱۰۶,۱۱۰,۱۱۲,۱۱۶,۱۱۸,۱۱۹,
۱۳۴,۱۳۶,۱۳۸,۱۳۹,۱۴۳,۱۵۸,۱۵۹,۱۶۳,۱۶۴,
۱۶۵,۱۶۶,۱۶۷,۱۷۰,۱۷۴,۱۷۵,۱۷۷,۱۷۸,
۱۸۰,۱۸۳,۱۸۸,۱۸۹,۱۹۰,۱۹۱,۱۹۲,۱۹۵,۱۹۶,
۲۰۱,۲۰۳/ سی پیک CPEC کا اقتصادی پہلو,
۱۱۹/ سی پیک کا سیکرٹ معاہدہ,۱۹۶
سی سی آئی,۸۴,۹۱,۱۳۷,۱۴۰
سیاسی اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی,۴۲
سیاسی حقوق,۵۱/ سیاسی قیدی,۶۸
سیاسی محرومی,۳۵
سیستان,۲۴
سیشن کورٹ خضدار,۱۴۳
سیکرٹری پرائیوٹائزیشن بورڈ پنجاب,۱۵۲
سیکرٹری پٹرولیم اور قدرتی وسائل,۷۷,۱۴۰
سیکرٹری پورٹس اینڈ شپنگ,۷۸
سیکرٹری دفاع,۷۸
سیکورٹی ادارے,۵/ سیکورٹی فورسز,۷
سیکورٹی اسٹیٹ,۱۶۶/ سیکورٹی پراونس,۱۶۶
سیکورٹی پیراڈائم,۱۱۵,۱۳۶
سیلاب متاثرین کی امدادی رقوم,۲۷
سینٹرل ایکسائز ڈیوٹی,۸۷
سینڈک,۶,۷۸,۱۱۲,۱۱۵,۱۲۱,۱۲۶,۱۳۸,۱۴۱,۱۴۹,
۱۵۵,۱۵۹,۱۷۴,۱۷۵,۱۹۰,۱۹۱
سینڈک پراجیکٹ,۱۴۹/ سینڈک کاپر فیلڈ,۷۸/
سینڈیک منصوبہ,۲۷
سینیٹر آغا پری گل,۹۳
سینیٹر اسفندیار,۴۹,۵۵,۹۳
سینیٹر امان اللہ کنرانی,۳۲,۹۴,۱۰۴,۱۲۲,۱۲۴
سینیٹر اعظم سواتی,۱۲۹
سینیٹر ایاز خان مندوخیل,۹۴
سینیٹر بابر خان غوری,۹۳,۹۴
سینیٹر ثناء اللہ بلوچ,۳۲,۵۷,۵۸,۵۹,۷۶,۷۷,۷۹,۸۰
۹۳,۹۴
سینیٹر حاصل بزنجو,۶۴
سینیٹر خلیل الرحمٰن,۹۴
سینیٹر رحمت اللہ، مولانا,۹۴
سینیٹر رحمان ملک,۵۸
سینیٹر رحمت اللہ کاکڑ,۳۲,۹۴
سینیٹر سعدیہ عباسی,۶۰
سینیٹر سعید احمد ہاشمی,۹۳,۹۴
سینیٹر سمیع الحق، مولانا,۹۳
سینیٹر سید خورشید شاہ,۲۱
سینیٹر سیّد دلاور عباس,۹۳,۹۴,۸۴
سینیٹر شاہد حسن بگٹی,۴۹,۶۰,۶۳,۱۷۳
سینیٹر میاں رضا ربانی,۲۵,۵۷,۹۳
سینیٹر رضا محمد رضا,۹۴
سینیٹر عبدالغفور حیدری، مولانا,۶۳
سینیٹر عبدالمالک، ڈاکٹر,۶۰,۱۸۴,۱۹۱
سینیٹر گل نصیب، مولانا,۴۹
سینیٹر محمد اسحاق ڈار,۹۳,۹۴
سینیٹر محمد اسلم بُلیدی,۹۴
سینیٹر محمد اسماعیل بُلیدی، ڈاکٹر,۷۹,۹۴
سینیٹر محمد سرور خان کاکڑ,۹۴
سینیٹر محمد صالح، مولانا,۴۹
سینیٹر محمد علی بروہی,۹۴
سینیٹر محمد علی درانی,۹۴
سینیٹر محمد نصیر مینگل,۹۴
سینیٹر مشاہد حسین,۴,۷,۲۹,۳۲,۴۶,۵۵,۵۷,۵۸,۹۳,
۷۶,۸۰,۹۴

سینیٹر مُہیم خان بلوچ,۳۲,۹۳,۹۴
سینیٹر میر محمد نصیر مینگل,۹۴
سینیٹر میر ولی محمد بادینی,۹۴
سینیٹر وسیم سجاد,۴,۷,۲۹,۴۶,۵۵,۵۶,۷۶,۹۳,۹۴
سینیٹر یحییٰ بختیار,۱۴۹

## ش

شازیہ خالد، ڈاکٹر,۵,۳۴,۱۲۵
شالاباغ,۸۹
شام(Syria),۱۶۲
شام کمار,۱۰۴,۱۴۴
شاہ عالم دوئم,۱۴۶
شاہ نورانی کی زیارت,۹۶
شہزادہ عبدالکریم,۱۰۸
شہنشاہ ایران,۱۵۴
شورش زدہ علاقے,۷۳
شوکت عزیز، وزیراعظم,۵۶,۵۸
شیر محمد بلوچ,۶۱,۶۲
شیعہ سنی لڑائی,۱۹۴

## ص

صابرہ اسلام,۱۰۴,۱۹۰
صحابہ کرامؓ,۳۱
صحبت پور,۱۹۰
صدر پاکستان,۱۳۴,۱۸۴
صدیق بلوچ,۱۰۴,۱۵۷,۱۶۳,۱۶۶
صلیبی جنگ,۱۷
صوبائی بیوروکریسی,۱۱۶
صوبائی خود مختاری,۱۰,۲۵,۴۴,۵۱,۱۰۶,۱۰۹
صوبائی عمل داری,۱۲۱
صوبائی مجموعی فنڈ,۱۵۲
صوبہ بلوچستان کی اقتصادی ترقی,۸۷
صوبوں کے حقوق کا تحفظ,۷۵,۷۶
صوبے میں پانی کی قلت,۸۷
صورت خان مری,۱۸۰
صیہونی قوتیں,۶۶

## ض

ضربِ عضب,۹۵,۹۶,۹۷,۹۹
ضلع بولان,۱۵۰
ضلع کچھی,۱۵۰
ضلع لسبیلا,۸۹
ضلع نصیر آباد,۱۵۱
ضلعی عدالت کوئٹہ,۹۶
ضلعی ناظم,۸۱,۹۰

## ط

طاغوتی طاقتوں,V
طارق اسد,۱۲۹
طالبان,۱۳۱,۱۶۱

## ظ

ظفراللہ خان,۱۲۹

## ع

عالم عرب,۱۷
عالمی ترجمان القرآن,۱۳,۲۳,۱۰۱
عالمی جنگ,۱۴۸
عالمی عدالت,۱۷۳

عام آدمی کا الائنس,۱۹۹
عام معافی,۲۲
عبدالباقی بلوچ,۴۴
عبدالحق بلوچ، مولانا,۱۲۸
عبدالحکیم بلوچ,۱۰۴,۱۲۰
عبدالحئ بلوچ،ڈاکٹر,۱۰۴,۱۴۸,۱۵۷,۱۶۳,۱۶۶,۱۷۰,
۱۹۳,۲۰۲
عبدالرؤف مینگل,۱۰۴,۱۶۵,۱۷۳
عدالتی کمیشن,۶۸,۱۴۳
عراق,۱۷/ عراقی سفارتخانہ,۱۵۴
عرب,۱۶۱,۱۶۲
عسکری تشدد,۱۰/ عسکریت پسندی,۲۷
عطاءاللہ مینگل,۱۴۸,۱۵۴,۱۷۶
علاقائی امن کا فروغ,۳۷
علیحدگی پسند جماعتیں,۲۲
عورتوں کے حقوق,۱۹۰

## غ

غربت,۵,۱۹,۲۶,۳۷,۵۱,۷۰,۷۷,۱۵۳,۱۶۵,۱۹۰
غربت کی انتہائی سطح,۱۹
غلام حیدر سمیجو,۹۴
غلام محمد بلوچ,۶۱,۶۲
غلام محمد گورنر جنرل,۱۵۷
غلبہ حاصل کرنے کی پالیسی,۱۹۵
غیر ملکی جنگجو,۳۷
غیر منقسم ہندوستان,۱۴۴

## ف

فاٹا,۶۵,۱۱۵,۱۲۱,۱۸۳,۱۹۹
فارس,۲۴
فارسی,۱۸۲
فارن ایوارڈ کا ایگزی کیوشن,۱۳۰
فارن ریلیشنز کمیٹی,۱۵
فاروق سرور,۱۰۴,۱۸۲
فرانس,۱۴۷,۱۵۸,۱۸۴/ فرانسیسی,۱۳۳
فرٹیلائزر فیکٹری,۱۶۲
فردِ واحد کی حکومت,۹
فرقہ واریت,۷۲
فرنٹیئر کانسٹبیلری (ایف سی),۱۱,۲۱,۶۰,۲۶,۷۹,۸۰,۸۲
فرنیٹر کور,۱۱
فریڈم آف سپیچ,۱۹۲
فشریز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ,۸۵
فلپائن,۱۴۹
فوجی آپریشنز,VII
فوج کی مداخلت,۹/ فوجی افسران کا سول معاملات میں
عمل دخل,۱۵۵
فوج کا کردار,۹,۴۸
فوجی اور سول مقتدرہ,۱۳
فوجی آپریشن,۲۱,۲۲,۶۰,۹۶,۱۰۶,۱۶۸
فوجی چھاؤنی,۹,۵۱,۱۷۸/ فوجی چھاؤنیوں کا مسئلہ,۴۳,۴۴
فوجی حکمران,۳/ فوجی حکومت,۱۹
فوجی حل,۸,۱۹,۵۵,۶۷
فوجی کارروائی,۳۷,۶۶,۱۰۰,۱۵۴
فیصل آباد,۱۱۸,۱۹۵
فیصلوں میں شراکت کا حق,۵۱
فیض احمد فیض,۱۸۱

## ق

قابض قوت کا کردار,۴۲
قاضی عبدالحمید شیرزاد,۱۰۴,۱۴۲,۱۶۳
قاضی عدالتیں,۱۵۰

قانون کی حکمرانی,۷۳,۶۹
قائداعظم، محمد علی جناح,۳,۱۵۷,۱۳۵,۱۷۵
قبائلی علاقے,۷۳
قبائلی معتبرین,۱۱۴
قبائلی نظام,۴,۱۱۴
قدرتی وسائل,۷,۲۷,۸۱,۸۳,۱۱۴,۱۱۵,۱۳۷,۱۴۱,۱۹۰
قدرتی وسائل پر صوبے کا حق,۸۱
قرآنِ کریم,V,۵۹ / قرآن وسنت,V
قطر,۱۳۱
قلات,۲۴,۱۰۸,۱۵۳,۱۸۰,۱۹۱ / قلات کی بلوچ
ریاست,۲۴
قلعہ سیف اللہ,۲۸,۸۷,۱۴۴,۱۵۴
قلعہ عبداللہ,۲۸,۸۹,۱۵۵
قوم پرست,۶,۳۰,۱۱۰,۱۴۳,۱۸۴,۱۹۱
قومی اثاثوں کی سلامتی,۴۳
قومی اسمبلی کی مشترکہ قرارداد,۶۷
قومی اقتصادی کونسل,۳۹
قومی انٹیلی جنس کونسل,۳۳
قومی سلامتی,۷۲,۱۲۹ / قومی سلامتی کے ادارے,۱۲۹ /
قومی سلامتی کی اسٹریٹجی,۷۲
قومی مالیاتی ایوارڈ,۴۲,۷۰ / قومی مالیاتی کمیشن,۲۶
قیام پاکستان,۱۰۸,۱۰۹,۱۸۱,۲۰۱

## ک

کاریزات,۱۵۱
کالاسامراج,۱۴۴
کامران مرتضیٰ،,۶۰
کانگریس,۱۵,۱۶,۱۸,۲۴
کچکول علی (ایڈووکیٹ),۶۱,۶۲
کچھی,۱۹۰ / کچھی کینال,۱۶۱
کراچی,۵,۷,۱۲,۸۵,۹۸,۱۰۷,۱۵۳,۱۵۶,۱۵۸,۱۶۲,
۱۷۶,۱۹۳
کراچی ایئرپورٹ پر حملے,۹۸
کرد قومیت,۱۷
کرنل مظہر مسعود,۹
کرومائیٹ,۱۰۵
کسانوں کے زرعی قرضے,۸۸
کسٹم ایکٹ,۲۶,۸۰
کشمیر,۶۰,۱۵۸,۱۶۱,۲۰۱
کلاشنکوف,۹۹,۱۴۸
کلبھوشن یادیو,۲۰۱
کلثوم پروین,۹۴
کلی قمبرانی,۶۰
کمیٹی برائے بلوچستان,۷۵
کنڈملیر,۱۷۱
کنفیوشس,۱۴۹
کنفیوشس کلچر,۱۴۹
کوریا,۱۴۹,۱۶۲
کوسٹ گارڈ,۱۱,۲۲,۲۶,۲۷,۴۲,۸۰,۸۲
کوہلو,۲۶,۲۷,۷۸,۸۱,۹۱,۱۸۰
کوئٹہ,۲۰,۲۱,۲۸,۳۹,۴۳,۷۶,۷۹,۸۷,۸۹,۹۰,۹۲,۹۵,
۹۶,۹۷,۹۸,۱۰۱,۱۰۳,۱۰۴,۱۰۷,۱۱۱,۱۴۲,۱۴۴,
۱۵۰,۱۵۲,۱۵۳,۱۵۴,۱۵۵,۱۵۶,۱۶۰,۱۶۳,۱۶۸,
۱۷۰,۱۷۸,۱۷۹,۱۸۳,۱۹۰ / کوئٹہ شہر,۴۳,۹۰,۹۵
کوئٹہ ہوائی اڈہ,۸۹
کوئٹہ یونین آف جرنلسٹ,۱۸۳
کوئلہ,۱۰۵,۱۳۷ / کوئلے کی کانیں,۱۲۱
کیچ,۶۱
کینیڈا کی کمپنیاں,۱۲۶

## گ

گڈانی پاور پارک,۱۸۸

گریٹ گیم,۱۱۶,۱۶۲
گلگت بلتستان,۱۵۸
گن شپ ہیلی کاپٹر,۶۰
گوہمرٹ(Gohmert),۲۴
گوادر بندر گاہ,۶,۲۷,۴۳,۸۶,۱۰۵/گوادر پورٹ,۵,
۱۲,۲۷,۳۳,۴۰,۷۸,۸۱,۸۵,۱۵۶,۱۵۹,۱۶۰,
۱۶۱,۱۶۷,۱۸۹
گوادر پورٹ اتھارٹی,۱۲,۷۸/گوادر ڈویلپمنٹ اتھارٹی,۸۱
گوادر ہسپتال,۱۵۹
گوادر کی ترقی,۴۷,۸۲
گوادر کی زمین کی الاٹمنٹ,۲۶
گوادر کی سیکورٹی,۷۹
گوادر میگا پراجیکٹس,۸۰
گورنر جنرل کا نمائندہAGG,۱۲۳
گورنمنٹ ہسپتال کوئٹہ,۱۶۸
گیس اور معدنیات کی رائلٹی,۱۱
گیس پائپ لائن,۳۷,۱۹۰
گیس تنصیبات پر حملے,۲۱
گیس ڈویلپمنٹ سرچارج,۲۷,۸۴
گیس کمپریشن پلانٹس,۷۹
گیس کی دریافت,۲۰,۱۲۳/گیس کی رائلٹی,۲۰,۸۱
گیلانی، یوسف رضا,۱۵,۶۴

## ل

لاپتہ افراد,۱۹,۲۵,۵۷,۲۲,۱۴۳
لارڈ کلائیو,۱۴۶
لاکڑہ پروجیکٹ,۱۴۹
لالہ منیر بلوچ,۶۱,۶۲
لاہور,۱۶,۱۰۷,۱۱۶,۱۱۸/لاہور گرڈ,۱۱۶
لندن,۱۵۴
لورالائی,۸۷,۱۵۴,۱۵۵
لیاری,۱۹۵
لیاقت علی خان،وزیر اعظم,۱۵۷
لیبر لاز,۱۲۴
لیوی فورس,۹۱
لیویز,۴۱,۵۱,۸۰,۸۹,۹۱,۱۲۳,۱۲۵
لیویز کا نظام,۱۲۳/لیویز کے زیر کنٹرول علاقے,۴۱

## م

ماحولیاتی جائزہ,۱۳۷
مالیاتی اختیار کی منتقلی,۴۲
ماہی گیر,۲۷,۱۷۴,۱۹۱
متوازن ترقی,۱۲
مجاہدین خلق,۶
مجلس عمل,۵۰
مچھ,۱۹۰
مچھیرے,۴۰
محمد خان شیرانی، مولانا,۹۳,۹۴
محمود خان اچکزئی,۹۳
مخدوم محمد امین فہیم,۹۳
مردم شماری,۷۷,۱۰۵,۱۱۴,۱۴۲,۱۶۸,۱۷۸,۱۸۰,۱۹۶
مری ایجنسی,۶۰
مری کے علاقے,۱۲۵
مذہبی ریاست,۱۳۵
مساجد,۵۰
مساوات کے فارمولے,۱۲۲
مسخ شدہ لاشیں,۱۹,۶۲,۱۶۷
مسقط,۱۶۲
مسلح افواج,۷۹,۸۴,۹۲
مسلم لیگ,۱۳۴,۱۸۷
مشترک فہرست,۱۰
مشترک معاملات کی کونسل,۱۰

مشترکہ مفادات کونسل,۲۵,۳۹,۹۱
مشرق وسطی,۸۷
مشرقی پاکستان,۳,۱۸,۳۳,۱۲۲,۱۳۳,۱۸۲,۱۸۳
مشرقی جرمنی,۱۳۱
مشرقی سرحدوں سے تجارت,۷۳
معاشی ترقی کے ثمرات,۱۱
معاشی ناہمواریاں,۳۵
معدنیات کے وسیع ذخائر,۱۰۵
معراج خالد,۳۳
مغربی امریکی ریاست وائیومنگ Wyoming,۱۲۲
مغربی جرمنی,۱۳۱
مفاد پرست جاگیر دارانہ اشرافیہ,۳۶
مکران,۵,۶۰,۸۵,۸۶,۱۰۸,۱۵۸,۱۶۱,۱۶۲
مکران کوسٹ,۱۵۸,۱۶۱,۱۶۲ / مکران ہائی وے,۵
ملازمتوں کے کوٹے کا تعین,۸۲
ملائشیا,۱۴۹
منفو,۱۷۶,۱۸۱
منشیات کی اسمگلنگ,۷۹,۸۸
منظور بلوچ، پروفیسر,۱۰۴,۱۷۵
منگی ڈیم,۱۸۹
منیر احمد بادینی,۱۰۴,۱۵۸
منیر جان,۱۴۶
مہاجروں کے حقوق,۵۱
مواصلات,۴,۳۸,۱۰۷
موسیٰ خیل,۱۴۴
میران شاہ,۵۰
میرانی ڈیم,۵,۱۵۹,۱۸۹
میری لینڈ,۱۲۲
میکسیکو,۱۴۵
مینجمنٹ سائنسز ادارے,۸۶

## ن

نازی,۱۴۶
ناصر آباد,۶۰
نصر اللہ خان,۱۵۲
نصیر احمد بنگلزئی,۱۰۴
نصیر آباد,۱۷۲,۱۹۰
نعیم حسین چٹھہ,۳۲
نواب اسلم رئیسانی,۱۲۹,۱۷۷
نواب اکبر بگٹی,۵,۱۹,۲۲,۲۶,۵۷,۶۰,۶۷,۱۰۹,۱۱۴,
۱۱۸,۱۴۲,۱۴۹,۱۵۴,۱۵۵,۱۷۳,۱۷۷,۱۸۵,۱۸۶
نواب اکبر بگٹی کی شہادت,۵۷,۶۰,۱۰۹
نواب اکبر بگٹی کے قتل کی وجوہات,۲۶ / نواب اکبر بگٹی
کے قاتل,۲۲
نواب رئیسانی,۱۲۹,۱۸۵
نواب نوروز خان زہری,۱۰۸
نواز شریف، میاں محمد,۱۲۶,۱۴۱,۱۴۹,۱۶۰,۱۶۷,۱۸۵
نور جہاں پانیزئی، ڈاکٹر,۹۳,۹۴
نور محمد ترہ کئی,۱۸۲
نوشکی,۱۴۴
نوگوایریا,۱۷۰
نیٹو,۱۵,۱۸
نیشنل آرمی,۱۸۴
نیشنل پارٹی,۸۱,۹۴,۱۰۴,۱۳۶,۱۶۵,۱۹۰,۱۹۳
نیشنل سیکورٹی کمیٹی,۲۸
نیشنل سیکورٹی کونسل,۸۲
نیشنل عوامی پارٹی,۱۰۸
نیشنل فنانس کمیشن,۳۹
نیشنل ہائی وے,۱۵۰,۱۵۱ / نیشنل ہائی وے اتھارٹی,۸۶
نیشنل ہیلتھ پروگرام,۱۷۲

## و

واشنگٹن,۱۲۱
وائس آف امریکہ,۱۶۹
وحی,V
ورجینیا,۱۲۲
ورلڈ بینک,۱۴۱
وزارت پٹرولیم,۸۳
وزیرستان,۴۹,۵۱,۶۰,۹۶
وسائل پر اختیار,۹,۱۰,۱۱,۱۱۵
وسائل کی تقسیم,۳۹,۴۲,۷۰,۷۳,۸۱
وسطی ایشیا,۴۰
وفاقی کردار کی حفاظت,۵۸
وفاقی محصولات,۸۵,۱۱۵,۱۵۵
وفاقی ملازمتیں,۸۴,۱۵۶
وفاقیت,۳۱,۱۳۵
ولی خان یونیورسٹی,۹۸
ویت نام,۱۹۵

## ہ

ہارورڈ,۱۳۴
ہاؤس آف ریپریزنٹیٹو,۱۲۲
ہائر ایجوکیشن کمیشن,۲۷,۹۱
ہتھیاروں کی زبان,۳
ہدایت الرحمٰن بلوچ,۱۰۴,۱۷۲,۱۷۷
ہن ٹنگٹن,۱۷۸
ہندو,۷,۱۸۰
ہندو بلوچ,۷
ہندوستان کا آئین,۱۴۶
ہنری کسنجر,۱۶
ہنگامی ترقیاتی پروگرام,۱۵۱
ہوچی من ویت نامی کامریڈ,۱۴۸
ہیپاٹائٹس,۱۷۲
ہیروئن کلچر,۱۴۸

## ی

یارجان بادینی,۱۰۴,۱۵۰
یعقوب بزنجو,۱۴۹
یلوپاور,۱۴۸
یو این ایچ سی آر(UNHCR),۱۶۸
یو پی,۱۵۸
یورپ,۱۴۵,۱۵۲
یوگوسلاویہ,۱۴۷
یونیسف(UNICEF),۱۳۳
یونیسکو(UNESCO),۱۳۳